سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی

خراسان بک سینٹر

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نام کتاب ---------- انبیاءِ قرآن (آدمؑ، نوحؑ، ابراہیمؑ)

تالیف ---------- سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی

ناشر ---------- دار الثقافۃ الاسلامیہ پاکستان

سال طباعت ---------- ذی الحجہ الحرام ۱۴۲۴ھ،ق

عرضِ ناشر

حمد وستائش اس ذات باری تعالیٰ کے لئے مختص ہے، جو ہر غیب ونہان سے واقف ہیں:

﴿وماتخرج من ثمرٰت من اکمامھا وماتحمل من انثی ولاتضع الابعلمه﴾ ''اس کے علم کے بغیر نہ کوئی پھل اپنے شگوفوں سے نکلتا ہے اور نہ کوئی مادہ حاملہ ہوتی ہے اور نہ جنتی ہے'' (فصلت/ ۴۷)

جو اپنے بندوں کی سر وخفا سے واقف وآگاہ ہے:

﴿ویعلم ماتخفون وماتعلنون﴾

''اور وہ تمہارے پوشیدہ اور ظاہری اعمال کو جانتا ہے؟'' (نمل/ ۲۵)

حمد اس ذات کیلئے جس کے قبضہ میں بندوں کی رگِ حیات ہے:

﴿مامن دآبۃ الا ھو اٰخذ بناصیتھا﴾ ''کوئی جاندار ایسا نہیں جس کی پیشانی اللہ کی گرفت میں نہ ہو'' (ھود/ ۵۶) رحمٰن ۳۱

حمد اس ذات کیلئے جس نے انسان کو دو گراں بہا حجتوں سے نوازا، جن میں سے ایک حجتِ باطنی ہے جسے روایات میں عقل کہا گیا ہے، حمد اس ذات کیلئے جس نے انسانوں کی عقل کی تربیت و رہنمائی کیلئے دوسری حجت یعنی انبیاء کو مبعوث کیا، حمد اس ذات کیلئے جس نے اپنی ندائے حق کو تمام بندوں تک پہنچایا، حمد اس ذات کیلئے جس نے ہر لحہ، ہر جگہ کوئی نہ کوئی ڈرانے اور بشارت دینے والا بھیجا ہے۔

تمام تعریفیں اس ذات جلال وجمال کیلئے مخصوص ہیں جس نے مخلوق ترابی

(خاکی) کو مسجود ملائکہ قرار دیا' تمام اطاعت و بندگی اس ذات لایزال کیلئے مختص ہے جس کی اطاعت و فرمانبرداری سے جو بھی سرکشی کرتا ہے وہ مردود و ملعون قرار پانے کے مستحق ہے، تمام تعریفیں اس ذات کیلئے لائق و سزاوار ہیں جس نے زمین و آسمان میں اپنی نعمتوں کے ڈھیر لگا کر انسان سے خطاب کیا میری نعمتیں تمہارے حساب و کتاب سے باہر ہیں:

﴿وان تعدوا نعمت اللہ لاتحصوھا﴾ ''اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہ کر سکو گے'' (ابراہیم/۳۴) دوسری آیات میں فرمایا یہ سب تمہارے لئے مسخر ہیں۔

حمد و ثنا اس ذات کیلئے سزاوار ہے جس نے اپنے ان بندوں کیلئے جو اپنے جہل و نادانی کی وجہ سے اس کی اطاعت و بندگی سے بھٹکتے ہیں ان کیلئے ایک ایسے دروازے کا اعلان کیا جس سے وہ دوبارہ اسکی اطاعت و بندگی میں داخل ہو سکتے ہیں اس دروازہ کا نام ''توبہ'' ہے۔ وہ ذات تنہا توبہ قبول ہی نہیں کرتی بلکہ توبہ کرنے والوں کو دوست بھی رکھتی ہے:

﴿ان اللہ یحب التوابین ویحب المتطھرین﴾ ''بیشک خدا توبہ کرنے والوں اور پاک و صاف رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے'' (بقرہ/۲۲۲)

حمد اس ذات کیلئے ہے جس نے تمام عبادتوں کو ہدایت و رہبری سے جوڑا ہے، اس ہدایت و رہبری کو ہمہ وقت جاری رکھی، جس کی مثال حضرت نوحؑ ہیں آپؑ فرماتے ہیں میں نے اپنی قوم کی دن رات' کھلے اور پوشیدہ طور پر ہدایت و رہنمائی کی:

﴿قل رب انی دعوت قومی لیلاً و نھاراً﴾ ''نوح نے کہا: پروردگارا! میں نے اپنی قوم کو رات دن دعوت دیتا رہا'' (نوح/۵)

﴿ثم انی اعلنت لھم و اسررت لھم اسراراً﴾

''پھر میں نے انہیں اعلانیہ طور پر اور نہایت خفیہ طور پر بھی دعوت دی'' (نوح/۹)

ہدایت ورہبری کرنے والوں کو قرآن کریم میں مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے سب سے زیادہ جس نام یا صفت سے نوازا گیا ہے وہ صفت ''نبی'' ہے، ''نبی'' یعنی جسے خدا نے خبر دی ہو۔ خدا کی طرف سے سب سے پہلے خبر پانے والے حضرت آدم صفی اللہ ہیں، قرآن کریم میں انھیں نبی کے نام سے یاد نہیں کیا گیا، حضرت آدم صفی اللہ ''شجر ممنوعہ'' کے قریب ہوئے، جسکی وجہ سے آپ کے اس عمل کو مقام انبیاء اور ان کی ذات کے منافی قرار دیا جاتا ہے لہٰذا ہم نے مناسب سمجھا اسے اس کتاب کی بحثِ نبوت ورسالت اور قصۂ آدم میں بیان کیا جائے:

آدم صفی اللہ کے بارے میں قرآنِ کریم میں کبھی نسیانِ عہد، عہد کو بھولانے کا ذکر آیا ہے:

﴿ولقدعهدناالیٰ آدم من قبل فنسی ولم نجدله عزمًا﴾

''اور تحقیق ہم نے اس سے پہلے آدم سے عہد لیا تھا لیکن وہ بھول گئے اور ہم نے ان میں کوئی عزم نہیں پایاب'' (طٰہٰ/۱۱۵)

کبھی اعتراف ظلم اور طلب مغفرت کا ذکر آیا ہے:

﴿ربناظلمناانفسناوان لم تغفرلناوترحمنالنکونن من الخسرین﴾ ''پروردگارا! ہم نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اگر تو نے ہمیں معاف نہ کیا اور ہم پر رحم نہ کیا تو ہم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے'' (اعراف/۲۳)

قرآنِ کریم نے آدم صفی اللہ کی طرف خطا ولغزش کی نسبت دی ہے ایسی نسبت کسی اور نبی کے بارے میں نہیں دی گئی دیگر انبیاء کے بارے میں خطا ولغزشوں کی تفسیر و توجیہ دیگر آیات اور دلائلِ عقل سے ممکن ہے لیکن حضرت آدم صفی اللہ کے بارے میں ایسا ممکن نہیں یہاں بقول عرفاء ''پائے استدلال ہاں چوبین بود'' کا معاملہ ہے لہٰذا علماءِ کرام نے آیاتِ قرآنی سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنے سابقہ عقائد کو بنیاد بنا کر عصیانِ آدم کو ترکِ اولیٰ قرار دیا ہے، ہم نے مناسب سمجھا اس کتاب میں بحث عصمتِ انبیاء کو بھی بیان کریں۔

فلسفہ وحکمت بعثت انبیاء ومرسلین، کفر وشرک کے ساتھ جہاد کرنا ہے اس مقابلہ کا آغاز حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا، ابراہیم خلیلؑ اس کے شہسوار ہیں اس کتاب میں حسب تسلسل حضرت نوحؑ اور حضرت ابراہیم خلیلؑ کا قصہ بیان ہوا ہے لہٰذا ہم نے مناسب سمجھا شرک ومشرکین کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی جائے، انبیاء کرام گرچہ خدا کی طرف سے خبر کے ساتھ بشارت اور ڈرانے والے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ عام انسانوں کیلئے بندۂ خدا بننے کیلئے نمونہ کامل بھی ہیں ہم جب تک ان کی زندگی کے نشیب وفراز کے واقعات کو سامنے نہیں رکھیں گے اس وقت تک سعادت سے ہمکنار اور بندۂ خدا نہیں ہوسکتے ان کی اقتداء اور پیروی کیلئے قصص انبیاء کا مطالعہ ضروری ہے قصص انبیاء سے آگاہی کے لئے ہمارے پاس معتبر ماخذ ومصدر صرف قرآن کریم ہے قرآن کریم میں تسلسل انبیاء میں آدم صفی اللہ کا ذکر سب سے پہلے ہوا ہے مؤلفین ومصنفین قصص انبیاء نے حضرت آدمؑ کے بعد حضرت ادریسؑ کا ذکر کیا ہے چنانچہ ان کی نبوت کے بارے میں قرآن کریم میں دو آیات موجود ہیں گرچہ ان کی نبوت قرآن سے ثابت ہے لیکن تسلسل میں آدمؑ کے بعد ان کی نبوت کا ہونا مشکوک ہے کیونکہ خداوند عالم نے بعثت انبیاء کا آغاز حضرت نوحؑ سے کرنے کا ذکر کیا ہے لہٰذا سب سے پہلے ''اولی العزم'' نبی حضرت نوح علیہ السلام ہیں قصص انبیاء کا آغاز حضرت نوحؑ سے ہوتا ہے ہم نے کتاب اور وقت کی ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے اس کتاب کی اختتام حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام قہرمانِ توحید وبت شکن پر کیا ہے۔

انسان قوت ارادہ، قدرت تسخیر اور اعلیٰ درسگاہوں کے اسناد کے حامل ہونے کے باوجود اپنی زندگی میں ایک مثالی نمونہ اور ''اسوۂ حسنہ'' کی سرپرستی میں کچھ دیر زندگی گزارنے کا نیازمند اور محتاج ہے، اعلیٰ درسگاہوں سے سند یافتہ قانون دان بھی کچھ دیر کسی تجربہ کار وکیل کی شاگردی میں رہنے کے محتاج مند ہیں علوم طب میں اچھے نمبروں سے کامیاب ہونے والے بھی مرض ودوا کی تشخیص کیلئے ایک تجربہ کار طبیب کے ساتھ رہنے کے محتاج ہیں چہ جائے کہ انسان جو ماورائے حواس

مولا ومعبود کی عبادت و بندگی کرنے اور رضایت خوشنودی حاصل کرنے کیلئے کسی بندۂ صالح کی پیروی کرنے کا محتاج نہ ہو، ظالم وطاغی سے مقابلے، جاہل ونادان انسانوں کے طرف سے درپیش مشکلات کا مقابلہ کرنے ان سب سے احسن طریقے سے نمٹنے کیلئے اعلیٰ کردار کے حامل انسان کی پیروی کرنے کی ضرورت ہے، کاروان بشری میں مثالی نمونے اور سیرت طیبہ کے حامل انسان انبیاء کرام ہیں لہٰذا اپنی زندگی کو رضائے خدا پر گامزن اور ان مثالی نمونوں کی پیروی کرنے کیلئے ہم قصص انبیاء کے محتاج ہیں جہاں خداوند عالم نے سورۂ ممتحنہ کی آیت ۴ اور ۶ میں فرمایا: ابراہیم اور آپ پر ایمان لانے والوں کی زندگی ''اسوہ حسنہ'' ہے ان کی پیروی کرنے کا حکم بھی دیا ہے:

﴿لقد كانت لكم اسوة حسنة فى ابرٰهيم والذين معه﴾ ''تم لوگوں کیلئے ابراہیم اوران کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے'' ﴿لقد كان لكم فيهم اسوة حسنة﴾ ''تحقیق انہی لوگوں میں تمہارے لئے ایک اچھا نمونہ ہے''

خداوند متعال کی عظیم نعمتوں میں سے ایک نعمت دو آنکھیں ہیں چنانچہ حق سبحانہ تعالیٰ نے ان دو نعمتوں کا بار بار ذکر کیا ہے وہ ذات بہتر جانتی ہے کہ کس حکمت کے تحت اس نے انسان کو دو آنکھیں عنایت کی ہے حالانکہ ایک آنکھ سے بھی دیکھا جاسکتا تھا، ایک آنکھ خراب ہونے سے انسان کو دشواری و مشکل پیش آتی، پھر انسان کو معلوم ہوتا ہے کہ آنکھ کتنی بڑی نعمت ہے۔ آنکھوں سے محروم انسان کیلئے یہ بارونق دنیا قبر کی مانند ہے خداوند متعال نے جسطرح انسان کو مادیات دیکھنے کیلئے ظاہری آنکھیں دی ہیں اسی طرح اس نے حقائق و معارف کو درک کرنے کیلئے بھی اسے دو آنکھوں سے نوازا ہے لیکن مادی آنکھوں کے برعکس اگر وہ ان دو آنکھوں میں سے صرف ایک آنکھ سے بھی محروم ہوجائے تو وہ بدبخت اور جہنمی بن جاتا ہے اس کیلئے خیر نہیں ہوتی ۔لیکن بدقسمتی سے عام طور پر اکثر و بیشتر انسان ان دو آنکھوں کے ہوتے ہوئے بھی صرف ایک آنکھ سے ہی دیکھتے ہیں دوسری آنکھ کو ہمیشہ بند رکھتے ہیں ایک آنکھ سے دیکھنے والے کو روایات میں ''دجال'' کہا گیا ہے

دجال وہ ہے جو صرف مفاد کی آنکھ سے دیکھتا ہے اور انسان کی مفاد کی آنکھ ہی کو صرف استعمال کرتا ہے جیسا جب مفاد پرست انسان کا مفاد بنتا تو وہ دیندار بن جاتا ہے اسی طرح کبھی دیندار انسان مفاد کی خاطر دین کو چھوڑ کر ملحد اور بے دین ہو جاتا ہے اسکی مثال ایسی ہے جیسے کسی کے پاس دور اور نزدیک دیکھنے والا چشمہ ہوں اور وہ نزدیک دیکھنے کیلئے دور کا چشمہ استعمال کرے۔ دین و دیانت میں بھی صرف ایک آنکھ سے دیکھا نہیں جا سکتا۔

باب اعتقاد میں ایک بحث، بحث عصمت ہے جب اہل تشیع کہتے ہیں کہ ہمارے آئمہؑ معصوم ہیں تو اہل سنت بہت چڑتے ہیں اور کہتے ہیں یہ غلط بات ہے پیغمبرؐ کے بعد کوئی معصوم نہیں یعنی ہر شخص غلطی کر سکتا ہے لیکن جب انہی کے سامنے کوئی شخص خلفاء واصحاب پر تنقید کی انگلی اٹھاتا ہے تو انھیں غصہ آتا ہے اور جواباً کہتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے خلفاء وصحابہ غلطی کریں وہ خود نہ تنہا غلطی نہیں کرتے بلکہ ان کی پیروی کرنے والے بھی جنت جاتے ہیں اسی طرح ایک اور کلمہ جو ہمارے ہاں رائج ہے جب کوئی سنی خلافت وخلفاء کا نام لیتا ہے تو اہل تشیع بہت غصہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں خلفاء اور خلافت سنیوں کا کام ہے ہم خلافت کے قائل نہیں ہمارے ہاں امامت ہوتی ہے لیکن جب کوئی شخص یہی لفظ خلافت پیغمبرؐ کیلئے حدیث سے بیان کرتا ہے کہ آنحضرتؐ نے فرمایا علیؑ میرا خلیفہ ہے تو اس وقت یہ نعرے بلند کرتے ہیں اگر خلافت کا لفظ صرف علیؑ کے ساتھ اچھا اور سزاوار ہے لیکن اگر دوسرے کہیں تو کہتے ہیں خلافت ہمارے مذہب میں نہیں، اسی طرح جب کوئی عالم یہ حدیث نقل کرتا ہے کہ پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا علماء میرے خلفاء ہیں تو اس وقت بھی انھیں اچھا لگتا ہے کیونکہ جانشینی پیغمبرؐ کے تمام امتیازات' مقام اور عزت انھیں مل گئیں لیکن جب نبی کی ذمہ داریوں کی بات آتی ہے تو کہتے ہیں یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم نبی بن جائیں، ہم نبی تو نہیں کہ سارے دین کے کام ہم کریں ہمارے ہاں کچھ ایسی ہی صورت حال ہے اگر امام' نبی یا مرجع کی نمائندگی کرنا فوائد اور امتیازات تک ہو تو اچھا ہے اور انھیں اس میں مزہ آتا ہے لیکن جب ذمہ

داریوں کی بات آتی ہے تو کہا جاتا ہے اس وقت ایسے اقدام کرنا قطعاً مصلحت نہیں ہر چیز کا ایک وقت ہوتا ہے کم ازکم اس کام کو میری زندگی میں نہیں ہونا چاہئے۔

نقادگرامی قدر

ہماری اس قسم کی کاوش کو نقد وتنقید کا نشانہ بنانے والے دو گروہ موجود ہیں۔ان میں ایک گروہ جو صرف مجھ سے تنقید نہیں کرتے بلکہ وہ معاشرے میں ہر اس فرد کے مخالف ہیں جو انحراف کی نشاندہی کرنے اور اس پر قلم اور زبان کھولنے والا ہوں۔اس سلسلے میں ہماری تسلی کے لئے قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جن میں خداوند متعال نے اپنے پیغمبرؐ سے فرمایا ''اگر ان لوگوں نے آپ کو جھٹلایا ہے تو آپؐ سے پہلے والوں کو بھی جھٹلایا ہے'' اس ملک میں بڑے بڑے جید اور زاہد علماء گزرے ہیں اور اب بھی موجود ہیں جب وہ نادان دوستوں اور دشمن کی سہام مسموم کا نشانہ بننے سے محفوظ نہیں رہے تو ہمارے جیسے قد وقامت اور علم واہلیت سے محروم بے یار و مددگار کی کیا حیثیت ہے کہ ان کے نقد وتنقید سے بچ سکیں لہٰذا میں ان کے نقد وتنقید کو یکسر مسترد نہیں کرتا کیونکہ ان کی تنقید میرے انتقادات کا جواب ہے۔

دوسرا گروہ ان افراد کا ہے جو اس معاشرے میں ان خرافات وانحرافات کے ازالے کے حق میں ہے اور ان کا کہنا ہے کہ ان خرافات کو ختم ہونا چاہئے اس سلسلے میں وہ ہماری کتابیں خرید کر پڑھتے بھی ہے لیکن وہ اس وقت ہماری کتابوں وتحریر کے بارے میں اسی طرح نقد کر رہے ہیں جو کسی ایسے شخصیت پر کی جاسکتی ہے جو علم وفکر کے بلند مقام پر فائز ہونے کے ساتھ ساتھ کثیر وسائل اور ذرائع کی بھی حامل ہو۔اگر ہماری شخصیت ایسی ہوتی تو انکی تنقید ٹھیک تھی' ہم ایسی ہی صورت میں ایسی تحریر پیش کرسکتے تھے جو عیب ونقص سے مُبراء ہونے کے ساتھ ساتھ قارئین کی استطاعت کے مطابق ہوتی، انکی اس تنقید سے یہ ظاہر ہوتا ہے گویا یہ بھی دوسرے گروہ کے ساتھ ہیں۔

ہم نے جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس لئے نہیں تھا کہ ہم اس میں اہلیت کے حامل ہیں بلکہ

ہمارا یہ اقدام اس لئے تھا کہ انحراف اور باطل کی کچھ آواز دب جائے۔

آخر میں اپنے مالک و معبود برحق کے حضور میں سربسجدۂ شکر ہوں کہ اس نے مجھے نعمت صحت' سلامتی اعضاء وجوارح اور حواسِ ظاہری و باطنی سے نوازنے کے ساتھ اپنے پسندیدہ دین اور رہبرانِ حقیقی سے دفاع کرنے کی توفیق عنایت کی' میں اسکی اس نعمت عظمٰی کا شکر کیے بغیر بھی نہیں رہ سکتا کہ اس نے مجھے اس سلسلہ میں ایسے مخلص و باصفا دوست واحباب کی معاونت میں رکھا، جنکی معاونت میں وہی منطق شامل تھی، جسے ذات باری تعالی نے اپنے رسولوں کی زبان سے کہلوایا ہے کہ: ہم تجھ سے کسی قسم کے اجر کے خواہاں نہیں'' کیونکہ یہ خدمات مادی اجرت سے بالا ہیں۔ ایسے موقعہ پر مجھے اپنے مالک و معبود کے سامنے تقصیر وکوتاہی پر شرمندگی ہوتی ہے۔ لہذا میں خدائے بزرگ وبرتر سے مغفرت کا خواہاں ہوں۔

ساتھ ہی خداوند متعال سے دعا ہے اس کتاب کی تالیف میں جتنے بھی تیرے نزدیک پسندیدہ حقائق درج ہیں اسکی اجر میں میرے ساتھ میرے معاونینِ کرام کو بھی برابر کا شریک قرار دے کیونکہ وہ ان حقائق کو صفحۂ قرطاس پر لانے میں برابر کے شریک ہیں۔ اگر اس میں کوتاہی یا نعوذ باللہ کوئی غلط بیانی ہے تو ان برادران کو اس تقصیر سے معاف رکھنا۔ جن برادران نے اس کتاب کی تدوین میں معاونت کی وہ یہ احباب ہیں جناب برادر خادم حسین صاحب سلمہٗ جناب برادر مبشر حسین صاحب سلمہٗ جناب برادر فیاض حسین صاحب' جناب برادر محمد جاوید صاحب' جناب برادر سید ناصر علی شاہ نقوی صاحب' جناب برادر محمد باقر صاحب' خدا ان سب کو حفظ وامان میں رکھے اور اس عالم میں اجر جلیل وجمیل سے نوازیں اور انبیاء واولیاء کی قرب وجوار نصیب کریں وآخر دعونا الحمد للہ رب العالمین۔

سید علی شرف الدین موسوی علی آبادی

ذی القعدۃ الحرام ۱۴۲۴ ہجری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد لله الذی جعلنا من المتمسکین بالقرآن العظیم و بنبیہ وصفیہ ونجیبہ وحبیبہ وسیدنا و امامنا و امام الانبیاء والائمۃ المعصومین و اصحابہ المنتجبین علیهم صلواۃ الله وصلواۃ المصلین نتبرا من اعدائهم و اعداء الله اجمعین من الآن الیٰ قیام یوم الدین

تمہید:

قصص انبیاء ومرسلینؑ ان قصوں' کہانیوں جیسا نہیں جو دنیا کے قصہ سازوں اور کہانی نویسوں کے وہم وخیالات سے بنائی گئی فرضی شخصیات کے کارناموں پر مشتمل ہیں جو اپنے زمانے میں ایک انوکھی شخصیات تھے جیسے رستم واسفندیار وغیرہ۔ قرآن کریم نے قصص انبیاء کو نقل کرتے ہوئے جو تصویر کشی کی ہے اس میں انبیاء وہ ذوات ہیں جن کی تاسی اور پیروی کرتے ہوئے ہر انسان اعلیٰ مرتبہ انسانیت اور عبودیت و بندگی خدا پر فائز ہوسکتا ہے۔ چنانچہ انبیاء کرامؑ نے ایسے انسانوں کو تربیت دے کر اپنے احکام سے نزدیک کر کے دکھایا۔ جیسا کہ پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ میں آیا ہے کہ آپؐ نے علیؑ کی وہاں تک تربیت کی کہ ان کو نفس رسول کہلانے کی صلاحیت پیدا ہوئی۔ انبیاء نے ہمیشہ لوگوں کو یہی بتایا ہے کہ ہم مبشر ہیں۔ ہم آپ اور خدا کے درمیان میں رابطہ کے طور پر ہیں۔ ہم آپ کیلئے پیغام لے کر آتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس ذات نے ہمیں آپ تک رابطہ کیلئے انتخاب کا اعزاز بخشا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اشرف الانبیاء ہوتے ہوئے خداوند متعال نے قرآن کریم میں ابراہیم خلیلؑ کو وہ مقام ومنزلت بخشی کہ بندگی خدا میں ان کی تاسی اور پیروی کرنے کا حکم ہے۔ یہاں سے یہ نکتہ واضح ہوجاتا ہے کہ دین اسلام میں تمام انبیاء ہدف واحد کے حامل ہیں۔ ان میں

زمان کوئی اختلاف پیدا نہیں کرتا۔

قصہ ابراھیم خلیلؑ میں ایک چیز جو قرآن نے نقل کی ہے وہ یہ ہے کہ دعوت الی اللہ میں کسی قسم کی تنظیم سازی، ادارہ سازی اور انجمن سازی کی گنجائش نہیں ہے۔ ہر انسان داعی حق ہے لہذا قرآن کریم میں ابراھیم کو یہ لقب بخشا ہے کہ وہ خود اپنی جگہ ایک امت تھے۔ ہمیشہ داعیان حق صرف خود کو خدا کے حضور میں جوابدہ سمجھ کر آگے بڑھتے ہیں تا کہ وہ اس دنیا میں انہیں توفیق سے نوازیں اور آخرت میں اس کے حضور سرخرو ہو جائیں۔ اس کے خلاف اب تک جو بھی اجتماعی دعوت یا اجتماعی شکل وصورت کی دعوت وجود میں آئی ہے، چاہے وہ انجمن و تنظیم کی صورت میں ہو یا اجتماع کی صورت میں۔ وہاں حاکم ایک خود پرست اور خودغرض انسان رہا ہے۔ جس نے ایک گروہ کو یرغمال بنا رکھا ہے۔ ایسے انسانوں کا طغیان ایک انفرادی انسان کے طغیان سے بہت خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ ایک انفرادی انسان کے طغیان کا دائرہ اسکی اپنی سوچ فکر، مال و دولت اور اولاد ہے جو اپنی جگہ محدود ہیں۔ یعنی اسکا طغیان ایک محدود پیمانے پر ہوگا۔ جبکہ تنظیم ایک گروہ کی حمایت حاصل کر کے قوم پر مسلط ہوتی ہے یعنی وہ ایک قوم کے اوپر حکومت کرنا چاہتی ہے، تنظیمی افراد میں سے کسی کو آپ یہ کہتے ہوئے نہیں سنیں گے کہ وہ خود کو خدا کے حضور جوابدہ سمجھتا ہے بلکہ وہ خود کو ملت وقوم کے سامنے جواب دہ قرار دیتے ہیں، یہ افراد تنظیم کے آئین اور دستور کے سامنے خود کو جوابدہ سمجھتے ہیں۔ ان کے تنظیم کا دستور اور آئین انہی کا خود ساختہ ہے جس پر انہی میں سے ایک خود پرست انسانوں کا ٹولہ حاکم ہوتا ہے۔ جو انہیں خوش بھی کر سکتا ہے اور آمریت کا مظاہرہ بھی کر سکتا ہے۔ لیکن جو افراد خود کو خدا کے سامنے جوابدہ قرار دیتے ہیں، ان کے نفس سے کسی بھی وقت آمریت جنم نہیں لے سکتی۔

نبوت ورسالت

اصول عقائد میں حسب تسلسل آیات قرآنی' توحید کے بعد نبوت ہے، نبوت وہ مقام ومنصب

الہی ہے جسے خداوند متعال خلق خدا کی ہدایت و رہبری کیلئے انسانوں میں سے کسی کو عطا کرتے ہیں انسان کی رہبری وہدایت کیلئے خدا کی طرف سے منتخب ہونے والی ہستیوں کے منصب کے مختلف و متعدد زاویے سے گوناگوں اعتبار کے حامل ہیں جنہیں مختلف ناموں سے قرآن کریم میں یاد کیا گیا ہے مثلاً نبوت' رسالت' امامت' ولایت' خلافت وغیرہ، لیکن اس تسلسل اصطفٰی اور انتخاب الٰہی میں درجہ نبوت کو ہی اولیت حاصل ہے شاید اسی وجہ سے اعتقادات میں نبوت کو مرکزیت کا درجہ حاصل ہے لہٰذا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ''نبوت'' کے لغوی اور اصطلاحی معنوں کے علاوہ اس منصب سے متعلق تمام ضروری ابحاث پر بات کی جائے۔ اس مقام پر ہم یہ واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی آیات میں ان کلمات کا استعمال (نعوذ باللہ) شعراء اور ادیب حضرات کے کلمات کے استعمال جیسا نہیں بلکہ یہاں ہر کلمہ میں حقائق پوشیدہ ہیں۔ علمائے اعتقاد نے بحث نبوت میں دو قسم کے ابواب کھولے ہیں:

۱۔ نبوت عامہ

۲۔ نبوت خاصہ

لیکن عقائد پر لکھی گئی کتابوں میں ان دونوں ابواب سے متعلق تسلی بخش بحث کا فقدان ہے یہ دونوں ابواب متعدد زاویۂ نگاہ سے تشریح وتوضیح طلب ہیں لہٰذا دین و مذہب کے بخن گو حضرات باب نبوت میں سیکولر اکیڈمیوں سے فارغ التحصیل لوگوں کے سوالات کا صحیح جواب نہیں دے پاتے یا جواب دینا مشکل ہو جاتا ہے ہم خود بھی اسی مشکل میں مبتلا ہیں تاہم ان صفحات کے توسط سے ذمہ دار افراد کی توجہ اس جانب مبذول کرنا چاہتے ہیں۔

باب نبوت عامہ میں علمائے اعتقاد صرف ایک قسم کی بحث سے متعلق چند سطور یا چند صفحات لکھ کر گزر جاتے ہیں وہ اس ضمن میں قاعدہ لطف، ضرورت ہدایت و رہبری' نجات از شقاوت' طلب سعادت اور تنہا عقل و علم کے ذریعہ انسان کی سعادت تک پہنچنے سے عجز و ناتوانی کی بات کر کے

آگے بڑھ جاتے ہیں، وہ ضرورت انبیاء کو تو لازم وضروری گردانتے ہیں لیکن اس سے متعلق دور قدیم اور دور جدید میں کیے جانے والے متعدد سوالات کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے ہیں اس سلسلے میں مختلف گروہوں نے درج ذیل سوالات اٹھائے ہیں جو بحث وتشریح اور جواب طلب ہیں۔

۱۔ خداوند متعال نے انسان کو دیگر مخلوقات سے افضل واشرف قرار دیا ہے، کیوں دوسری مخلوقات کی طرح اسکو اپنے حال پر نہیں چھوڑا؟ اگر وہ اس مخلوق کو بھی بطریق اولی اپنے عقل وعلم کے بھروسے پر چھوڑتے تو اسے کیا مشکل پیش آتی اور اس کو اس کی اپنی حالت پر نہ چھوڑنے کی صورت میں خود خدا کی خدائی میں کیا فرق پڑتا؟۔

۲۔ انسان کی عقل اور اسکا علم اور تجربات اسکی سعادت وہدایت کیلئے ناکافی ہیں تو خود خدا نے تمام انسانوں کے ساتھ بطور مستقیم تکلم نہیں کرتا اور وحی رابطہ کے دروازے سب کیلئے کیوں نہیں کھولتا تاکہ ہر انسان بلا امتیاز خدا سے رابطہ کر کے اپنے مسائل حل کروالیتا، ایسا کرنے میں اسکے لئے کیا حرج تھا؟۔

۳۔ جن ہستیوں کو خداوند متعال نے ہدایت ورہبری کیلئے اسی نوع انسانی سے اور اسی قوم سے منتخب کیا ہے، اگر یہ ذوات اپنی صلاحیت واہلیت کی بنیاد پر اس درجے پر فائز ہوئی ہیں تو اس صورت میں کیوں بہت سی نابغہ روزگار ہستیاں صلاحیت واہلیت مسلمہ کے باوجود اس مقام پر فائز نہیں ہوئیں؟ دوسری طرف اگر یہ بنیاد صحیح ہے تو ختم نبوت کی کیا دلیل ہے کیونکہ انسانی صلاحیت کی رشد ونمواب بھی جاری ہے۔

۴۔ اگر ان ذوات کو ان کی اپنی صلاحیت واہلیت کے بغیر خدا نے انتخاب کیا ہے تو ان کی چنداں فضیلت نہیں بنتی کیونکہ خدا اگر ان کو چھوڑ کر کسی اور کو منتخب کرتا تو وہ بھی ان جیسے ہوتے۔

اس جیسے اور سینکڑوں سوالات واستفسار دور قدیم سے عصر جدید کے انسان کے ذہنوں میں ابھرتے ہیں لیکن ان سوالات کی مثال تشنگی سی ہے جسے ابھی تک سیرابی نصیب نہیں ہوئی ہے کیونکہ

حوزات علمیہ دین ومذہب کے مبلغین نے فیصلہ کیا ہے کہ استخارے اور فاتحہ کے علاوہ دیگر مسائل میں قرآن کی طرف رجوع نہیں کرینگے کیونکہ ان کے خیال میں قرآن کے معانی ان کی سمجھ میں نہیں آتے یا یہ ابھی تک فقہ کے اجتہاد سے فارغ نہیں ہوئے ہیں تاکہ وہ اس سلسلہ کے سوالات کے جوابات کیلئے استفتائی کمیٹی تشکیل دے سکیں، ہماری اتنی وسعت نہیں کہ ہم جواب گو بنیں ہمارا مقصد صرف یہاں ارباب بست واختیار کی توجہ کو اس مسئلہ کی طرف مبذول کرنا ہے اسی طرح جہاں تک ہماری گنجائش ہے تو ہم انشاء اللہ چند صفحات سیاہ کریں گے۔

فلسفہ وضرورت بعثت انبیاء

علمائے اعتقاد، فلاسفہ ومتکلمین اور دانشمندان ادیان سماوی نے باب اعتقاد میں اثبات وجود باری تعالیٰ اس کی وحدانیت ذات وصفات اور خالقیت میں یگانگت کے بعد دوسرا اصل ''نبوت'' کو قرار دیا ہے۔ خداوند متعال اپنے اور بندوں کے درمیان واسطہ اور رابطہ کیلئے انہی میں سے کسی کو انتخاب اور اصطفیٰ کرتا ہے خود انسانوں ہی میں سے کسی فرد کو انتخاب کرنے کی ضرورت کے حوالے سے بہت سے علماء اور مفکرین نے اپنے اپنے زاویہ فکر ونگاہ سے دلائل وبراہین پیش کئے ہیں لیکن یہاں اتنی گنجائش نہیں کہ ان تمام دلائل وبراہین پر بحث کی جاسکے جبکہ ان میں سے بعض کا ذکر تو انکے سقم اور مخدوش ہونے کی بنا پر نہیں کیا جا سکتا لہٰذا ہم صرف چند دلائل کو اختصار کے ساتھ پیش کرنے پر ہی قناعت کریں گے۔ کسی مدعا کو ثابت کرنے کیلئے کثرت دلائل، مصنف اور مولف کے معلومات میں وسعت کی دلیل تو بن سکتی ہیں، لیکن صرف دلیل میں موجود قوت، قدرت اور مسلمہ اصولوں کے استناد ہی اصل مدعا کا مضبوط ثبوت ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہم اپنے مدعا کے اثبات میں موجود تمام دلائل کو نقل قرطاس کرنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے ہیں۔

وجود باری تعالیٰ اور اس کی ذات وصفات میں وحدانیت کو تسلیم کرنے کے بعد جب انسان اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو خود کو اس کائنات اور اس میں موجود دیگر مخلوقات سے ممتاز پاتا ہے وہ

اپنے اندر تین ایسی باتیں پاتا ہے جو اسے اپنے بارے میں سوچنے پر مجبور کرتی ہیں:

۱۔ ہدف خلقت کائنات بالخصوص خود انسان کا کیا ہدف ہے۔

۲۔ ''حریت اور آزادی'' انسان اپنے اندر دوسری مخلوق کی نسبت ایک قسم کی آزادی اور خودمختاری دیکھتا ہے۔

۳۔ انسان کی عقل وادراک درپیش مسائل میں عاجز وناتوان ہے۔

مندرجہ بالا تین نکات کی وجہ سے انسان خود کو کسی ایسی ہستی کا محتاج و نیاز مند پاتا ہے جو اپنے جیسے دیگر انسانوں سے ہر صفت میں ممتاز و مکرم ہو، جس کا ربط خود اس کے پیدا کرنیوالے خالق سے قائم ہو۔ کسی بھی انسان کو اگر بغیر بتلائے یا اس کی مرضی کے بغیر یا حالت غفلت میں کسی اور جگہ منتقل کیا جائے تو ہوش میں آتے ہی اس کے ذہن میں یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱۔اسے یہاں کس نے لایا ہے۔

۲۔کیوں لایا ہے۔

۳۔کب تک یہاں رہنا ہے۔

۴۔یہاں سے آگے کہاں جانا ہے۔

۵۔آگے اس کا انجام کیا ہوگا۔

اس دنیا میں بسنے والے ہر انسان کے سامنے بھی یہ پانچ سوال جواب طلب ہیں کیونکہ وہ یہاں اپنی مرضی سے نہیں آیا اور نہ ہی اس سلسلے میں اسے پہلے سے بتایا گیا تھا اُسے عالم غفلت میں اس دنیا میں لایا گیا ہے، ہوش تو بعد میں آیا ہے ہوش میں آنے کے بعد انسان جب کائنات میں غور کرتا ہے تو اسے اس کائنات کی بہت سی چیزوں کے معین اہداف نظر آتے ہیں مثلاً اگر چاردیواری میں ہوتا ہے تو سمجھتا ہے کہ یہ اسکی رہائش کیلئے بنائی گئی ہے، سبزی وغیرہ کو دیکھتا ہے تو سمجھ لیتا ہے کہ یہ کھانے کیلئے بنائی گئی ہیں، شمس وقمر اور انکی روشنی سب کی کچھ نہ کچھ غرض اور غایت دیکھتا ہے۔ یہ سب کچھ

دیکھنے کے بعد وہ سوچتا ہے، میری خلقت جو ان سب چیزوں سے افضل و اشرف ہے آخر اس کا ہدف کیا ہو سکتا ہے؟ اس سلسلے میں جب وہ معاشرے میں موجود اپنے سے زیادہ سمجھدار اور دانشمند لوگوں کی زندگیوں کا مشاہدہ کرتا ہے یا ماضی میں گزرنے والی عظیم شخصیات، عقلاء، فلاسفہ اور دانشوروں کی تاریخ کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے ان کی زندگی کی سرگرمیاں اور سمت و جہت متضاد، متصادم اور متناقض نظر آتی ہیں یہ دیکھ کر اس کی حیرانی اور سرگردانی اور بڑھ جاتی ہے اور اسکے سوالات کی شدت میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اپنی غرض خلقت سے متعلق سوالات کو دہراتا ہے لیکن جب کہیں سے بھی اسے اپنی غرض تخلیق کے بارے میں جواب نہیں ملتا بلکہ یہاں تک کہ کہا جاتا ہے کہ ''تمہاری خلقت کی کوئی غرض نہیں'' تو اسے کسی ایسی ہستی کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے جو اسے اس کے ہدف خلقت کی طرف رہنمائی اور رہبری کرے۔ ضرورت بعثت انبیاء کی یہ پہلی دلیل ہے۔

انسان کے اندر جب ہوش و حواس پیدا ہوتا ہے، فکری حس اس میں جب نمو و ظہور پاتی ہے، تو وہ خود کو دوسری مخلوقات سے جدا اور ممتاز پاتا ہے وہ کائنات کی ہر چیز کو مجبوری کی حالت میں گردش میں دیکھتا ہے وہ دیکھتا ہے کہ کائنات کے دوسرے موجودات اپنے اعمال خود منتخب نہیں کر سکتے یا ایسا کرنے کیلئے آزادی نامی کوئی چیز نہیں رکھتے۔ سورج، چاند، ستارے سب حرکت میں ہیں اور انکی حرکت میں ذرہ برابر بھی کمی بیشی نہیں دیکھی کیونکہ یہ اپنی حرکت میں مجبور ہیں جس طرح کوئی انسان اگر جیل خانے کے دروازے پر بیٹھا ہو تو اسے یہی نظر آتا ہے کہ روزانہ اس دروازے سے کتنے ہی مجبور آدمیوں کو باندھے ہوئے اندر لے جایا جاتا ہے اور کتنوں ہی کو باہر لایا جاتا ہے لیکن جیل کے محافظ خود کو آزاد سمجھتے ہیں حیوانات اور حشرات کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہے لیکن یہ حضرت انسان دیگر حیوانات سے مختلف ہے اپنے اعمال و کردار اور گفتار میں آزاد ہے ہر انسان کے حرکات اور سکنات دوسرے سے مختلف اور متضاد ہوتے ہیں پس معلوم ہوا کہ انسان دوسری مخلوقات سے ہٹ کر ایک مختار موجود ہے بلکہ کسی حد تک خود مختار ہے وہ اپنے اندر اس بات کو واضح اور روشن طور پر ملموس و

محسوس کرتا ہے وہ جس فعل کو انجام دینا چاہتا ہے اسے تمام تر مقدمات اور تیاریوں کے ساتھ اپنی مرضی سے انجام دیتا ہے اور جس کام کو نہیں کرنا چاہتا، سمجھانے کے باوجود کرنے کیلئے تیار نہیں ہوتا یہاں تک کہ بہت سے کام ایسے ہوتے ہیں جنھیں ظلم اور تشدد کے ذریعہ بھی اس سے ترک نہیں کروایا جاسکتا، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان ایک کام کو انجام دینے کا تمام تر ارادہ ظاہر کرنے کے باوجود منحرف ہو جاتا ہے اور کبھی منفی ارادہ ظاہر کرنے کے باوجود بعد میں اسی کام کو کر گزرتا ہے غرض مدعائے بیان یہ ہے کہ انسان ایک آزاد موجود ہے۔

اس کے اندر موجود آزادی کی یہ صفت اور ساتھ ہی دو اور صفات یعنی جلب منفعت (تمام فائدے والی چیزوں کو اپنی طرف کھینچنا) اور دفع ضرر (نقصان والی چیزوں کو اپنے سے دفع کرنا)۔ انسان کو غیر محدود آزادی استعمال کرنے کی طرف دعوت دیتی ہیں چونکہ دوسرے انسانوں میں بھی یہ صفت موجود ہے لہٰذا کہیں نہ کہیں دو انسانوں میں تصادم اور ٹکراؤ ہونا حتمی ہے چنانچہ ان حاملان آزادی کی حدود کا تعین ہونا چاہے کہ کس کو کہاں تک آزادی حاصل ہے، دنیا کے ملحد اور کافر آزادی مطلق کے داعی بھی یہ کہتے ہیں کہ ایک کی آزادای کی حد دوسرے کی آزادی پر ختم ہوتی ہے آزادی کا بے دریغ استعمال ایک کے حق میں اور دوسرے کے خلاف ہے جو ظلم ہے لہٰذا یہ حد بندی اور تعین آزادی دونوں کی باہمی رضامندی سے بھی طے پا سکتی ہے اور کوئی تیسرا فریق بھی اس کام کو انجام دے سکتا ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ چونکہ دونوں فریق فائدے کو جلب اور نقصان کو دور کرنا چاہتے ہیں اس لئے مفادات میں ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے لہٰذا کسی نہ کسی کی جانب داری کا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے، جسکا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حدود کا تعین انصاف سے ہٹ کر ہوگا۔ اس صورت حال سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ایک ایسا نظام موجود ہو جو دونوں میں سے کسی سے بھی وابستہ نہ ہو تاکہ جانب داری کا تصور ذہن سے نکل جائے صرف اتنا بھی کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ اس قانون اور نظام کا اجراء اور نفاذ کرنے والا مجری بھی نفع اور نقصان کی طمع سے پاک ہو لیکن انسانوں

میں کسی ایسی غیر جانب دار ہستی کا پایا جانا تقریباً ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ دنیا کے غیر جانبداری کے ساختہ نظاموں میں ہر جگہ جانبداری کی بو آتی ہے لہٰذا یہ کام کوئی ایسی ہستی ہی انجام دے سکتی ہے جو خلق و مافیہا سے بے نیاز ہو، صرف خدا کے نیاز پر باقی ہو، اسی کی منتخب کردہ ہو اور اپنا ہر عمل نفع اور نقصان سے ماوراء محض فرض شناسی کی بنیاد پر انجام دے، یہ صورت حال ضرورت بعثت انبیاءؑ کی دوسری دلیل ہے۔

نبوت خاصہ

نبوت خاصہ میں بھی دو قسم کی بحث موضوعِ گفتگو علماءِ اعتقاد میں قرار پائی ہیں:

۱۔ خداوند متعال نے کتنے انبیاء انسانوں کی ہدایت کیلئے مبعوث کیے ہیں۔

اس سلسلہ میں علمائے اعتقاد باب اعتقاد میں خداوند متعال کی طرف سے منتخب انبیاء کی تعداد عقل اور قرآن کریم اور معتبر و مستند روایات خاموش ہیں گرچہ مشہور یہ ہے کہ ان کی تعداد ایک لاکھ چوبیس ہزار تھی لیکن اس کی کوئی مستند دلیل پیش نہیں کی گئی بلکہ اجمال گوئی پر اکتفاء کیا گیا ہے۔

''نبوت'' لغت اور آیات قرآن میں

کتب لغات عربی، بالخصوص قرآنی تعلیمات کیلئے وضع شدہ کتابوں مثلاً مفردات راغب' قاموس قرآن' عمدۃ الفاظ' التحقیق فی کلمات القرآن وغیرہ میں کلمہ ''نبوت'' کی اصل کے بارے میں دو نظریہ پائے جاتے ہیں:

۱۔ نبوت کو مادہ ''نباء'' سے لیا ہے جس کے معنی خبر دینے کے ہیں ان علماء کا کہنا ہے کہ نباء کا ہمزہ ''ی'' میں تبدیل کرنے سے ''نبی'' بن جاتا ہے چونکہ اس کی اصل نباء ہے اور نباء کے معنی خبر دینے کے ہیں اس لئے اس نظریہ کے حامی علمائے لغت اپنے مدعا کے ثبوت میں مندرجہ ذیل آیات قرآنی پیش کرتے ہیں:

﴿نبی عبادی انی انا الغفور الرحیم﴾ ''میرے بندوں کو خبر کردو کہ میں بہت بخشنے والا ہوں'' (حجر/۴۹) ﴿قال نبانی العلیم الخبیر﴾ ''آپ نے کہا خدائے علیم وخبیر نے مجھے خبر دی'' (تحریم/۳) ﴿عن النباء العظیم﴾ ''بہت بڑی خبر کے بارے میں'' (نباء/۲) ﴿ونبئھم عن ضیف ابراھیم﴾ ''ان کو ابراہیم کے مہمانوں کے بارے میں اطلاع دے دو'' (حجر/۵۱) ﴿قل ھو نبوا عظیم﴾ ''کہہ دیجئے کہ یہ قرآن بہت بڑی خبر ہے'' (ص/۶۷) ﴿نبئنا بتاویلہ﴾ ''ذرا اس خواب کی تعبیر تو بتاؤ'' (یوسف/۳۶)

ان تمام آیات میں لفظ نباء خبر دینے کے معنوں میں آیا ہے۔ جس ہستی کو خداوند متعال منتخب کرتا ہے اس کا پہلا کام ہی غیب سے خبر دینا ہے۔ اسی لئے اسکو ''نبی'' کہتے ہیں۔

۲۔ اسکے بالمقابل صاحب السان العرب، تاج العروس اور بعض دیگر ماہرین لغت نے نبوت کو مادہ ''نبی'' ''ی'' پر تشدید والے لفظ نبی سے مشتق قرار دیا ہے انکا کہنا ہے نبی درحقیقت (ن، ب، ی، ء) تھا ہمزہ ''ی'' میں تبدیل اور مدغم ہوا تو نبی بنا، جس کے معنی بلند مرتبہ یا بلند درجہ کے ہیں۔ چنانچہ اہل عرب زمین سے اونچے ٹیلے کو ''نبوۃ'' کہتے ہیں جو شخص منتخب قرار پائے گا اور خدا کی طرف سے خبر دے گا یقیناً اس کا درجہ دیگر انسانوں سے بلند ہوگا۔

وہ ماہرین لغت جو نبی کو مادہ نبوۃ سے مشتق گردانتے ہیں اور اس سے بلند درجہ مراد لیتے ہیں، اپنے اس مدعا کیلئے قرآن کریم کی وہ آیات پیش کرتے ہیں جن میں اس کلمہ کا استعمال بعض بلند مناصب کے بعد ذکر ہوا ہے۔ اس سلسلے میں وہ استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قاعدہ تکلم کے مطابق ''خاص'' کا ذکر ہمیشہ ''عام'' کے بعد ہوتا ہے۔ لہٰذا نبی کو اگر خبر دینے والا سمجھا جائے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تو خدا سے رابطہ کا پہلا اور خاص مقام ہے جبکہ زیر نظر آیات میں خداوند متعال نے کچھ اور بلند مقامات کے ذکر کے بعد نبی کا ذکر فرمایا ہے مثلاً سورہ مبارکہ مریم میں صدیق کے بعد نبی کا ذکر فرمایا ہے اور اسی طرح سورہ مریم کی آیت ۳۰ میں حضرت عیسیٰؑ کو پہلے صاحب کتاب کہا ہے اس کے

بعد نبی ہونے کا ذکر کیا ہے:

﴿قال انی عبداللہ اتنی الکتب وجعلنی نبیا﴾ ''بچے نے کہا: میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب دی ہے اور مجھے نبی بنایا ہے'' سورہ آل عمران ۳۹ میں بھی آخر میں نبی کا ذکر ہوا ہے جبکہ سورہ مریم میں ''رسول'' کے بعد ''نبی'' کا ذکر کیا گیا ہے۔

بعض دیگر افراد کا کہنا ہے کہ مذکورہ بالا دونوں نظریوں میں کوئی اختلاف وتضاد نہیں ہے۔ کیونکہ جو شخص خدا سے خبر حاصل کر کے بندوں تک پہنچاتا ہے وہ کوئی معمولی انسان نہیں ہوتا۔ ایسا شخص یقیناً بلند مرتبہ اور بلند درجہ پر فائز ہوگا۔ لہٰذا لفظ ''نبی'' کو مادہ ''نباء'' سے مشتق گردانا بھی صحیح ہے اور مادہ ''نبوۃ'' سے سمجھنا بھی ٹھیک ہے بعض نے کہا ہے ''نبی'' بروزن فعیل ہے اور فعیل صفت مشبہ سے ہے یہ فاعل کے معنوں میں بھی آتا ہے یعنی خدا کی طرف سے خبر دینے والا اور اسی طرح مفعول کے معنوں میں بھی یعنی خدا سے خبر لینے والا۔ یہ دونوں صفات اس کے اندر موجود ہیں یعنی نبی خدا سے خبر لیتا بھی ہے اور خدا کی طرف سے خبر دیتا بھی ہے لہٰذا نبی بروزن فعیل مادہ نباء سے ہے جس کے دو معانی ہو سکتے ہیں:

۱۔ خبر لینے والا وصول کرنے والا یا جس کی خبر دیا جاتا ہے اور اس صورت میں فعیل بھی مفعول ہے

۲۔ خبر دینے والا اس وقت فعیل بھی فاعل ہے ان آیات میں ''نبی'' دوسرے معنی میں استعمال ہوا ہے:

علماء اعتقاد کا کہنا ہے بعض نبی وہ ہیں جن کو خدا نے خبر دی ہیں جیسے حضرت آدم صفی اللہ چنانچہ خدا نے فرمایا: ﴿یاادم اسکن انت وزوجک الجنۃ﴾

حضرت آدمؑ کے بارے میں ہے لیکن یہ نہیں آیا ہے کہ حضرت آدمؑ نے کسی کو خدا کی طرف سے خبر دی ہو اس پر ہم بعد میں بحث کریں گے، غرض یہ تھی ''نبوت'' کے لغوی معنٰی جو بیان ہوا۔

نبوت کے اصطلاحی معنی

علمائے اعتقاد نے نبی کی تعریف اسطرح کی ہے ''نبی اس انسان کو کہتے ہیں جو خدا سے بغیر واسطہ بشر کے خبر لیتا ہے'' فاضل مقداد نے کتاب ''حادی عشر'' کی شرح میں فرمایا: نبی وہ انسان ہے جو خدا کی طرف سے خبر دیتا ہے'' اس تعریف کے مطابق مندرجہ ذیل خبر دینے والے لوگ تعریف ''نبوت'' سے خارج ہیں:

۱۔ غیر خدا کی طرف سے خبر دینے والا نبی نہیں کہلائے گا۔

۲۔ عالم اور امام کو بھی نبی نہیں کہہ سکتے کیونکہ آئمہ اور علماء دونوں نبی کے توسط سے خبر دیتے ہیں یعنی امام اور علماء دونوں کا واسطہ بشر سے ہے۔

۳۔ ملائکہ خدا کی طرف سے خبر دیتے ہیں، لیکن نبی نہیں ہیں کیونکہ وہ انسان نہیں ہیں۔

صاحب تفسیر المیزان علامہ طباطبائیؒ نے تعریف نبوت بیان کرتے وقت اس قول کو ترجیح دی ہے کہ نبوت مادہ نباء بمعنی خبر سے مشتق ہے کیونکہ یہ شخص (نبی) خدا سے بذریعہ وحی خبر لیتا ہے اور بندوں تک اسکی خبر پہنچاتا ہے۔

علماء اعتقاد کے درمیان اس بات میں اختلاف پایا جاتا ہے کہ نبی اور رسول کے درمیان کیا فرق ہے علاوہ ازیں خود لفظ رسول کے معنی کے بارے میں بھی مختلف نظریہ پائے جاتے ہیں تاہم منصب اور مقام کے حوالہ سے اختلافی نقطہ نظر پیش کرنے سے پہلے ہم ان دونوں کے لغوی معنوں کے درمیان موجود فرق کو واضح کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

رسول

لغت میں، جیسا کہ قاموس قرآن' مفردات راغب اور تحقیق فی کلمات القرآن' میں آیا ہے ''رسول'' مادہ ''رسل'' سے ماخوذ ہے جو کسی کو آہستگی سے اٹھانے یا اسے اپنے حال پر چھوڑنے کے

معنوں میں استعمال ہوتا ہے یہ کلمہ اٹھانے کے ساتھ ساتھ کسی کو آرام اور نرمی کے ساتھ کسی کی طرف بھیجنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے مادہ رسول ان سات معنوں میں استعمال ہوا ہے: مسلط کرنا، بعثت کرنا' بھیجنا' فتح کرنا' نکالنا' متوجہ کرنا' اپنے آپ کو چھوڑنا اور نازل کرنا۔ صاحب مفردات قرآن نے بھی رسول کے معنی بھیجنا یا بعثت کرنا بیان کئے ہیں

لفظ رسول کھولنے کے معنوں میں بھی ذکر ہوا ہے:

﴿مایفتح الله للناس من رحمة فلا ممسك لها۔ وما یسك۔ فلا مرسل له من بعده﴾ ''اللہ انسانوں کیلئے جو رحمت کا دروازہ کھول کے دے تو کوئی اسکو بند کرنے والا نہیں اور جو بند کر دے تو اسکے بعد کوئی اسکو کھولنے والا نہیں'' (فاطر/۲) رسول، کسی چیز کو اسکے اختیار کے بغیر چھوڑنے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے:

۱۔ بارش کیلئے استعمال ہوا ہے:

﴿وارسلنا السمآء علیهم مدراراً وجعلنا الانهر تجری من تحتهم﴾ ''اور ہم نے ان پر آسمان سے موسلا دھار بارشیں برسائیں اور ان کے نیچے نہریں جاری کر دیں'' (انعام/۶) ﴿یرسل السماء علیکم مدرارا﴾ ''وہ تم پر آسمان سے موسلا دھار بارش برسائے گا'' (نوح/۱۱)

۲۔ ہوا چھوڑنے کو بھی رسول کہتے ہیں:

﴿ والله الذی ارسل الریاح فتثیر سحابا فسقنه الی بلد میت فاحیینا به الارض بعد موتها﴾ ''اللہ ہی وہ ہے جس نے ہواؤں کو بھیجا تو وہ بادلوں کو منتشر کرتی ہیں پھر ہم انہیں مردہ شہر کی طرف لے جاتے ہیں اور زمین کو مردہ ہو جانے کے بعد زندہ کر دیتے ہیں'' (فاطر/۹)

۳۔ پرندہ: ﴿وارسل علیهم طیراً ابابیل﴾ ''اور ان پر اڑتی ہوئی ابابیل کو بھیجا'' (فیل/۳)

۴۔ کسی چیز کو اس کے حال پر چھوڑ دینے کیلئے استعمال ہوا ہے جیسے شیطان:

﴿ارسلنا الشیطین علی الکفرین توزھم ازا﴾ ''ہم نے شیاطین کو کفار پر مسلط رکر کھا ہے جو انھیں اکساتے رہتے ہیں'' (مریم/۸۳)

اس حوالے سے ہم کہہ سکتے ہیں، کوئی بھی چیز مادی ہو یا روحانی' اچھی ہو یا بری' انسان ہو یا شیطان' ملک ہو یا جماد کو چھوڑنے کو رسول کہتے ہیں۔

۵۔ عام انسان کی طرف سے کسی اچھے یا برے مقصد کیلئے بھیجنے کو بھی رسول کہتے ہیں:

﴿فارسل فرعون فی المدائن حاشرین﴾ ''پھر فرعون نے مختلف شہروں میں لشکر جمع کرنے والے روانہ کر دیے'' (شعراء/۵۳)

۶۔ یہ کلمہ مرضی اور اختیار پر چھوڑنے والوں کیلئے بھی استعمال ہوا ہے۔ جیسے ملائکہ:

﴿فارسلنا الیھا روحنا فتمثل لھا بشرا سویا﴾ ''ہم نے اپنی روح کو بھیجا جو ان کے سامنے ایک اچھا خاصا آدمی بن کر پیش ہوا'' (مریم/۱۷) ﴿اللہ یصطفی من الملئکۃ رسلا و من الناس﴾ ''اللہ ملائکہ اور انسانوں میں سے اپنے نمائندے منتخب کرتا ہے'' (حج/۷۵) ﴿انہ لقول رسول کریم﴾ ''بے شک یہ ایک معزز فرشتے کا بیان ہے'' (تکویر/۱۹) ﴿ولما جاءت رسلنا لوطا﴾ ''اور جب ہمارے فرستادے لوط کے پاس پہنچے'' (ھود/۷۷) ﴿ان رسلنا یکتبون ما تمکرون﴾ ''تم جو مکاری کرتے ہو ہمارے فرشتے انکو لکھ جاتے ہیں'' (یونس/۲۱) ﴿قالو یلوط انا رسل ربك﴾ ''تو فرشتوں نے کہا کہ اے لوط ہم آپ کے پروردگار کے نمائندے ہیں'' (ھود/ ۸۱) ﴿ولما جاءت رسلنا ابراھیم بالبشری﴾ ''اور جب ہمارے فرشتے ابراھیم کے پاس بشارت لے کر آئے'' (عنکبوت/۳۱) ﴿ویرسل علیکم حفظۃ﴾ ''اور تم سب پر نگہبان فرشتے بھیجتا ہے'' (انعام/۶۱) ﴿وما ارسلوا علیھم حافظین﴾ ''حالانکہ انہیں

ان کا نگران بنا کر نہیں بھیجا گیا تھا'' (مطففین/۳۳) ﴿یرسل علیکما شواظ من نار﴾ ''تمہارے اوپر آگ کا سبز شعلہ اور دھوں چھوڑ دیا جائے گا'' (رحمن/۳۵) ﴿والمرسلت عرفا﴾ ''ان کی قسم جنہیں تسلسل کے ساتھ بھیجا گیا ہے'' (مرسلات/۱) ﴿بلی ورسلنا لدیھم یکتبون﴾ ''ہاں ہاں ہمارے فرشتے سب کچھ لکھ رہے ہیں'' (زخرف/۸۰)

یہاں سے ان افراد کو جو کسی کی طرف حامل پیغام ہوتے ہیں انہیں ''رسول'' کہتے ہیں علماء نے رسول کے یہ معنی بیان کرنے کیلئے درج ذیل کے آیات سے استفادہ کیا ہے، چنانچہ اس مناسبت سے رحمان ورحیم اللہ تبارک تعالی کی طرف سے بھیجے گئے انبیاء کرام کو رسول کہتے ہیں:

﴿انا ارسلنا الیکم رسولاً شاهداً علیکم کما ارسلنا الیٰ فرعون رسولاً﴾ ''(اے لوگو) ہم نے تمہاری طرف ایک رسول تم پر گواہ بنا کر بھیجا ہے جس طرح ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا تھا'' (مزمل/۱۵) ﴿فاتیا فرعون فقولا انا رسول رب العلمین﴾ ''آپ دونوں فرعون کے پاس جائیں اور اس سے کہیں: ہم رب العالمین کے رسول ہیں'' (شعراء/۱۶) مائدہ۳۲، مومنون۵۱، ہود۸، ﴿هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله﴾ ''وہ خدا جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کیساتھ بھیجا تا کہ اپنے دین کو تمام ادیان پر غالب بنائے'' (توبہ/۳۳) ﴿هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق﴾ ''وہی وہ خدا ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا'' (فتح/۲۸) ﴿هو الذی ارسل رسوله بالهدی﴾ ''وہی خدا ہے جس نے اپنے رسول کو ھدایت کے ساتھ بھیجا'' (صف/۹) ﴿ربنا لولا ارسلت الینا رسولا﴾ ''پروردگار تو نے ہماری طرف رسول کیوں نہیں بھیجا'' (طہٰ/۱۳۴) ﴿کما ارسلنا فیکم رسولا منکم﴾ ''جس طرح ہم نے تمھارے

درمیان تمہیں میں سے ایک رسول بھیجا ہے" (بقرہ/۱۵۱)

﴿وما نرسل بالآیت الا تخویفا﴾ "ہم تو نشانیوں کو صرف ڈرانے کیلئے بھیجتے ہیں" (بنی اسرائیل/۵۹)

مندرجہ بالا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ "رسول" لفظ "نبی" کی نسبت عام ہے کیونکہ یہ مختلف مقامات پر کئی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

انبیاء و مرسلین مندرجہ ذیل پیغام لائے ہیں:

۱۔ آیات الٰہی کی تلاوت

۲۔ لوگوں کے عقائد اور افکار، اخلاق، صفات نفسانیہ اور اعمال و عادات کا تزکیہ کرنا۔

۳۔ تعلیم کتاب

۴۔ حقائق و معارف

۵۔ دین اور دنیا سے متعلق گزشتہ، حاضر اور آئندہ سے متعلق ضروری مسائل۔

نبی اور رسول میں فرق

علمائے اعتقاد نے بعض روایات کو بنیاد بنا کر نبی اور رسول میں فرق کا ذکر کرتے ہوئے بیان فرمایا ہے کہ نبی جس پر خدا کی طرف سے وحی نازل ہوئی ہو، لیکن ضروری نہیں کہ اس وحی کو دوسروں تک پہنچانے کا بھی حکم دیا گیا ہو یعنی وحی ہو سکتی لیکن تکلیف تبلیغ کا حکم نہیں۔

اسکے برعکس اگر وحی ہو اور ساتھ ہی ابلاغ وحی کا بھی حکم ہو تو ایسی وحی کے حامل کو رسول کہتے ہیں۔

یہ فرق مندرجہ ذیل حقائق کے پیش نظر مخدوش و مردود معلوم ہوتا ہے:

۱۔ انسانی معاشرہ کے لئے کسی نظام اور قانون کا ہونا لازمی ہے اور اس نظام کو کامیابی سے چلانے کے لئے کسی ہادی یا رہبر کا وجود بھی ناگزیر ہے لہٰذا خدا پر لازم آتا ہے کہ اپنے بندوں میں سے کسی کو ہدایت اور رہبری کے لئے منتخب کرے اور چونکہ عملاً محال ہے کہ خدا ہر کس و ناکس

پر اپنے احکامات بلاواسطہ وحی کرے لہٰذا اس خلا کو پر کرنے کیلئے انہی انسانوں میں سے منصب نبوت کے لئے کسی کا منتخب ہونا ایک استثنائی ضرورت ہے لیکن کسی شخص پر وحی تو ہو، مگر دوسروں کو ہدایت کرنیکا حکم نہ ہو، یہ بات بعید از قیاس ہے کیونکہ مقام نبوت کیلئے کسی فرد کو منتخب کرنے میں پھر کیا حکمت قرار پائے گی؟۔

۲۔ جب خداوند عالم نے اپنے کچھ بندوں کو بلاواسطہ احکام شریعت وحی کرتا ہے تو کیونکر دیگر بندوں کو اس احکام کے، پہنچانے سے محروم رکھ سکتا ہے۔

۳۔ وہ ہستی کہ جسے خداوند عالم نے اپنی خبروں کے ابلاغ کیلئے منتخب کیا ہو، یہ خبر اگر وہ دیگر بندگان خدا تک نہ پہنچائے تو ایسی صورت میں اس کے ساتھ ہمارا کوئی واسطہ اور رشتہ ہی نہیں رہے گا اور جب کوئی تعلق ہی نہیں ہوگا تو پھر اس کا احترام بھی ہمارے لئے ضروری نہ رہے گا۔

۴۔ علمائے اعتقاد نبی اور رسول میں فرق بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ''نبی عام ہے جبکہ رسول خاص یعنی ہر رسول نبی ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں'' قانون تکلم وتخاطب کے لحاظ سے عام کا ذکر پہلے ہونا چاہئے اور خاص کو بعد میں جبکہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں نبی کا ذکر بعد میں ہوا اور رسول کا پہلے:

﴿انہ کان مخلصا وکان رسولا نبیا﴾ ''وہ میرے مخلص بندے اور رسول و نبی تھے'' (مریم/۵۱) ﴿وکان رسولا نبیا﴾ ''اور ہمارے بھیجے ہوئے رسول و نبی تھے'' (مریم/۵۴) ﴿وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی﴾ ''اور ہم نے آپ سے پہلے کوئی ایسا رسول یا نبی نہیں بھیجا ہے'' (حج/۵۲)

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ منصب نبوت خاص ہے اور منصب رسالت عام۔

۵۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۱۳ میں خداوند عالم نے بعثت نبی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ نبیوں کو انسانوں کے لئے بشیر و نذیر بنایا گیا ہے:

﴿فبعث اللہ النبین مبشرین و منذرین﴾ ''اللہ نے بشارت دینے والے اور تنبیہ کرنے والے انبیاء بھیجے''

۶۔ انبیاء کی تعداد کا ذکر کرتے ہوئے علمائے اعتقاد بعض روایات کی بنیاد پر کہتے ہیں کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء مبعوث ہوئے ہیں جبکہ رسولوں کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) بتائی جاتی ہے اگر یہ مان لیا جائے کہ تمام نبیوں نے تکلیف ابلاغ نہیں کی پھر فقط ۳۱۳ رسولوں کی تعداد بشر کی ہدایت کیلئے ناکافی ہے۔

۷۔ اگر عمل تبلیغ کو بجالانا صرف رسولوں ہی کی ذمہ داری ہے اور انھوں نے ہی ہمیں خبر الٰہی سے آگاہ کیا ہے تو باب اعتقاد میں ایمان بہ رسالت کا ذکر ہونا چاہئے تھا جبکہ یہاں ایمان بہ نبوت کا حکم ہے۔

۸۔ بہت سی آیات و روایات سے استدلال کرتے ہوئے متعدد علماء اور عرفاء نے بیان فرمایا ہے کہ انھیں الہام یا القائے قلب ہوا، القاء قلب وحی الٰہی کی اقسام میں سے ایک قسم ہے اس اصول کے تحت تو ان علماء اور عرفاء کو بھی نبی کہنا چاہئے جبکہ انھیں نبی نہیں کہا جاتا۔

۹۔ کثیر آیات و روایات کے تحت اگر خلق خدا جادہ مستقیم سے منحرف ہو جائے، انحراف اور بدعنوانیوں کو فروغ ملے، سنتیں مٹ جائیں تو ایسی صورت میں ہر عالم دین پر تبلیغ دین واجب ہو جاتی ہے جس سے پہلو تہی اور فرار کرنیکی صورت میں وہ مستحق عذاب الٰہی ٹھہرے گا تبلیغ کے اس فریضے کے باوجود علماء رسول نہیں کہلا سکتے۔

۱۰۔ اصول کافی میں رسول اور نبی کے فرق کے سلسلے میں نقل ہے:

''نبی وہ ہے جو خواب میں وحی لیتا ہے، آواز سنتا ہے مگر ملائکہ کو دیکھتا نہیں۔ جبکہ رسول وہ ہے جو خواب میں وحی لیتا ہے، آواز بھی سنتا ہے اور ملائکہ کو دیکھتا بھی ہے''

اس روایت کے تحت رسول اور نبی میں فرق تبلیغ احکام کرنے اور نہ کرنے میں نہیں ہے بلکہ یہ فرق

ملائکہ کو دیکھنے اور نہ دیکھنے میں ہے۔

۱۱۔ رسول جیسا کہ آیات قرآنی میں بھی آیا ہے، حامل پیغام کے بھیجنے کو کہتے ہیں اسکی وضاحت مفردات راغب اصفہانی میں اس طرح کی گئی ہے "رسول مادہ رسل سے ہے رسالت پیغام کو کہتے ہیں لہذا اصل پیغام "رسالت" کہلاتی ہے بھیجنے والے کو "مرسل" کہتے ہیں جسکی طرف بھیجا جائے اسے "مرسل الیہ" کہتے ہیں اور جسے بھیجا جائے اسے "رسول" کہتے ہیں اسی لئے انسان اور ملائکہ دونوں ہی رسول کہلاتے ہیں" پس معلوم ہوا کہ حامل پیغام ہونے کی وجہ سے پیغمبر کو رسول کہا جاتا ہے، لفظ رسول کا استعمال تنہا انسان و ملائکہ تک محدود نہیں بلکہ قرآن کریم میں پرندہ، ہوا، عذاب وغیرہ کے لئے بھی یہ مادہ استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ کریں:

﴿وھو الذی ارسل الریح بشرا بین یدی رحمتہ﴾ "اور وہ تو ہے جس نے اپنی رحمت (بارش) کے آگے ہواؤں کو خوشخبری دینے کیلئے بھیجا ہے" (فرقان/۴۸)﴾

﴿وارسل علیھم طیرا ابابیل﴾ "اور ان پر جھنڈ کے جھنڈ پرندے بھیجے" (فیل/۳)

﴿فارسلنا علیھم رجزا من السماء بما کانوا یظلمون﴾ "ہم نے ان پر آسمان سے عذاب بھیجا اسلئے کہ وہ ظلم کرتے تھے" (اعراف/۱۶۲)

۱۲۔ اگر رسول اسے کہتے ہیں جسے تبلیغ کا حکم دیا گیا ہے تو سورۂ بقرہ تیسرے پارے کی پہلی آیت میں خداوند عالم نے جو صریحاً یہ فرمایا ہے کہ بعض رسول دوسرے رسولوں پر فضیلت رکھتے ہیں: ﴿تلک الرسول فضلنا بعضھم علی بعض﴾ تو پھر یہ فضیلت کس بنیاد پر ہوگی۔

۱۳۔ آخری بات یہ ہے کہ طول تاریخ میں ہمیں ایک بھی ایسے نبی کا ذکر نہیں ملتا جس پر وحی ہوئی ہو مگر حکم تبلیغ نہ ہوا ہو۔

نبوت اکرام و استحقاق کے درمیان فرق

بعض مفکرین کا خیال ہے کہ نبوت صلاحیت اور قابلیت رکھنے والوں کا استحقاقی مقام ہے اس

کے بالمقابل بعض کا خیال ہے کہ نبوت کے حامل افراد کو عام انسانوں پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہے کیونکہ خدا جسے چاہتا ہے اسے نبی بنا دیتا ہے اگر ہمیں نبی بناتا تو ہم بھی نبی بن جاتے۔

یہ دونوں نظریہ جداگانہ طور پر راہِ مستقیم سے منحرف انحراف ہر صلاحیت اور قابلیت رکھنے والے انسان کو اس منصب کا مستحق نہیں بن سکتا اگر ایسا ہے تو ان انبیاءِ بزرگ کے قصۂ نبوت کی کیا تفسیر کریں گے جہاں حضرت موسیٰ "اولی العزم" پیغمبر کو پیدا ہوتے ہی خداوند متعال نے ماں کی گود سے اٹھا کر اس کے دشمن فرعون دعوائے الوہیت رکھنے والے ملحد اور کافر کے گھر میں پرورش کی، اور وہاں سے بے یار و مددگار شہر مدین میں حضرت شعیبؑ کی دامادی میں دیا۔

اسی طرح اس اولی العزم نبی کو یاد کریں جہاں وہ نبی اور اس کی بیوی اولاد پیدا ہونے سے مایوس ہو چکے تھے انھیں اس عمر میں ایک نبی سے نوازا جس عمر میں عادی طور پر کسی کے ہاں بچہ ہونا ممکن نہیں، یہ نبی حضرت ابراہیم خلیل اللہ ہیں:

﴿الحمدالله الذی وھب لی علی الکبر اسمٰعیل واسحٰق﴾

"ثنائے کامل ہے اس اللہ کیلئے جس نے عالم پیری میں مجھے اسماعیل اور اسحاق عنایت کیے" (ابراہیم/۳۹)

اسی طرح جب حضرت زکریا اور ان کی بیوی کی عمر صاحب اولاد ہونے سے گزر چکی تھی تو خداوند عالم نے انھیں ایک بیٹے سے نوازا جس کا نام حضرت یحییٰ تھا اور وہ نبی بھی تھے اور اس سے بھی تعجب خیز واقعہ اس نبی کا ہے جس کی نانی کو اولاد سے معذور و مایوس ہونے کی عمر میں ایک بیٹی سے نوازا اور اس بیٹی سے خداوند متعال نے بغیر شوہر ایک بیٹا بخشا جس کو گھوارے ہی سے نبوت کے مقام پر پہنچایا جس کا نام حضرت عیسیٰ ہے۔ کیا یہ انبیاء صلاحیت اور استحقاق کے مراحل سے گزرے ہیں یا کہ صرف اکرام الٰہی کا ثمر ہیں، اس کے مقابل میں یہ کہنا کہ جن کو خدا اکرام سے نوازتا ہے وہی برگزیدہ ہوتے ہیں اس میں ان کا اپنا کوئی کردار نظر نہیں آتا، یہ بھی ایک غلط منطق ہے کیونکہ سورۂ

بقرہ اور سورہ سجدہ کی آیت ۲۴ میں واضح طور پر ملتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو خداوند متعال نے ناقابل تحمل امتحان اور آزمائش سے گزارنے کے بعد اولی العزم نبی بنایا:

﴿وجعلنامنهم ائمة يهدون بامرنالماصبروا﴾ ''اور ہم نے ان میں کچھ لوگوں کو امام اور پیشوا قرار دیا ہے جو ہمارے امر سے لوگوں کی ہدایت کرتے ہیں''

یہاں سے یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ بعثت نبوت اور نبی الوہیت اور ربوبیت الٰہی کا تقاضا ہے جو کبھی بچپنے میں، کبھی بڑھاپے میں، کبھی جوانی میں، کبھی بغیر زحمت اور کبھی مشقتوں اور زحمتوں کے بعد عطا ہوتا ہے۔

نبی کی تعریف میں علماء اعتقاد نے فرمایا ہے نبی وہ انسان ہے جو خداوند متعال سے بغیر واسطہ بشر کے وحی لیتے ہیں یہاں اس قید کے بارے میں گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

انبیاء انسان و بشر ہیں

انسان: انسان کو اس کی استعداد، صلاحیت فضائل اور کمالات کا حامل ہونے کی وجہ سے 'انسان' کہتے ہیں:

پہلی صفت ''انسان'' اس بشریت کے پتلے کے اندر ایک حقیقت پوشیدہ ہے جو ان بشری خصوصیات اور تقاضوں سے بلند و ارفع ہے لیکن عام طور پر بشری تقاضے اس پر غالب ہے لہٰذا اسے انسانی تقاضے کی طرف جانے نہیں دیتے اسے اپنی طرف کھینچتے ہیں اس صورت میں اس انسان کی حالت ایسی ہے جو ان آیات میں بیان ہوئے ہیں:

۱۔ انسان جدل ہے:

﴿وكان الانسان اكثر شيء جدلاً﴾

''مگر انسان بڑا ہی جھگڑالو ثابت ہوا ہے'' (کہف/۵۴)

۲۔ انسان کفور ہے:

﴿ان الانسان لکفور مبین﴾ ''یہ انسان یقیناً کھلا ناشکرا ہے'' (زخرف/۱۵)

۳۔ انسان ھلوع ہے:

﴿ان الانسان خلق ھلوعا﴾ ''انسان یقیناً کم حوصلہ خلق ہوا ہے'' (معارج/۱۹)

۴۔ انسان ضعیف ہے:

﴿وخلق الانسان ضعیفا﴾ ''کیونکہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے'' (نساء/۲۸)

۵۔ انسان عجول ہے:

﴿وکان الانسان عجولا﴾ ''اور انسان بڑا جلد باز ہے'' (اسراء/۱۱)

۶۔ انسان مخلوقِ مٹی ہے:

﴿ان خلقکم من تراب ثم اذاانتم بشر تنتشرون﴾ ''اس نے تمہیں مٹی سے بنایا پھر تم انسان ہوکر (زمین میں) پھیل رہے ہو'' (روم/۲۰) ﴿واللہ خلقکم من تراب﴾ ''اللہ نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا'' (فاطر/۱۱)

۷۔ انسان ظلوم وکفار ہے:

﴿ان الانسان لظلوم کفار﴾

''انسان یقیناً بڑا ہی بے انصاف' ناشکرا ہے'' (ابراہیم/۳۴)

۸۔ انسان قتور ہے:

﴿وکان الانسان قتورا﴾ ''اور انسان بہت تنگ دل واقع ہوا ہے'' (اسراء/۱۰۰)

۹۔ انسان قنوط ہے:

﴿وان مسہ الشر فیئوس قنوط﴾ ''جب کوئی آفت آجاتی ہے تو مایوس ہوتا ہے اور آس توڑ بیٹھتا ہے'' (فصلت/۴۹)

۱۰۔ انسان منوع ہے:

﴿واذامسه الخیرمنوعًا﴾

''اور جب آسائش حاصل ہوتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے'' (معارج/۲۱)

۱۱۔ انسان طاغی ہے:

﴿ان الانسان لیطغیٰ﴾ ''انسان تو یقیناً سرکشی کرتا ہے'' (علق/۶)

۱۲۔ انسان کنود ہے:

﴿ان الانسان لربه لکنود﴾ ''یقیناً انسان اپنے رب کا ناشکرا ہے'' (عادیات/۶)

۱۳۔ انسان حب مال رکھتا ہے:

﴿وانه لحب الخیرلشدید﴾ ''اور وہ مال کی محبت میں سخت ہے'' (عادیات/۸)

۱۴۔ انسان کفران نعمت ہے:

﴿ولئن کفرتم ان عذابی لشدید﴾

''اور اگر ناشکری کرو تو میرا عذاب یقیناً سخت ہے'' (ابراہیم/۷)، یونس ۱۲

''بشر'':

اسی طرح اسے جسم وجسمانیت ظاہر محسوسات میں آنے والی شکل وصورت کے حوالے سے بشر کہتے ہیں حقیقت میں بشر اس کے ظاہری چہرے کا نام ہے خداوند عالم نے انسان کی خلقیت کا جب ذکر کیا تو ہمیشہ بشر کے حوالے سے بتایا ہے:

﴿واتٰکم من کل ماسالتموہ وان تعدوانعمت الله لاتحصوھاان الانسان لظلوم کفار﴾ ''اور اسی نے تمہیں ہر اس چیز میں سے دیا جو تم نے اس سے مانگی اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو تو شمار نہ کر سکو گے انسان یقیناً بڑا ہی بے انصاف ناشکرا ہے'' (ابراہیم/۳۴)

﴿وھو الذی خلق من الماء بشرًا﴾ ''اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر کو پیدا کیا'' (فرقان/۵۴) ﴿انی خالق بشرًا من طین﴾ ''میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں'' (ص/۱۷)

خلقت کے حوالے سے: انسان ۶۵ بار قرآن میں آیا ہے اس میں انسان کا ظاہری بدن چہرے شکل وصورت مراد نہیں بلکہ اس کی باطنی استعداد، صلاحیت جو اسکے اندر پوشیدہ ہے مراد ہے: خداوند عالم نے چند آیات کریمہ میں مختلف زاویئے سے اس نقطے پر اصرار کیا ہے:

۱۔ اگر ہم انسانوں کی ہدایت کیلئے ملائکہ بھیجتے تو ہم انہیں بھی بشریت کا لباس پہنا کر بھیجتے:

﴿ولو جعلنٰه ملکًا لجعلنٰه رجلًا وللبسنا علیھم ما یلبسون﴾

''اور اگر ہم اسے فرشتہ قرار دیتے بھی تو مردانہ شکل میں قرار دیتے اور ہم انھیں اسی شبہ میں مبتلا کرتے جس میں وہ اب مبتلا ہیں'' (انعام/۹)

۲۔ ہم نے ہر نبی کو اسی قوم سے انتخاب کیا ہے:

۳۔ ہم نے ان قوموں کی طرف انہی کے بھائی کو بھیجا ہے:

﴿والیٰ عادٍ اخاھم ھودًا﴾ ''اور قوم عاد کی طرف ہم نے انہی کی برادری کے ایک فرد ہود کو بھیجا'' (اعراف/۶۵) ﴿والیٰ مدین اخاھم شعیبًا﴾ ''اور اہل مدین کی طرف ہم نے انہی کی برادری کے ایک شعیب کو بھیجا'' (اعراف/۸۵) ہود ۵۰، ۶۱، ۸۴، نمل ۴۵، عنکبوت ۳۶، شوریٰ ۱۰۶، ۱۲۴، ۱۴۲، ۱۶۱۔

۴۔ تمام قوموں نے انبیاء کو یہ کہہ کر مسترد کیا کہ تم ہم جیسے بشر ہو:

﴿قالوا ان انتم الا بشر مثلنا تریدون ان تصدونا عما کان یعبد اٰبائونا﴾

''وہ کہنے لگے: تم تو ہم جیسے بشر ہو تم ہمیں ان معبودوں سے روکنا چاہتے ہو جن کی ہمارے باپ دادا پوجا کرتے تھے'' (ابراھیم/۱۰،۱۱) ﴿الذین ظلموا اھل

﴿هذا الا بشر مثلکم﴾ ''اور ظالم آپس میں سرگوشیاں کرتے ہیں: یہ شخص بھی تم جیسا بشر ہے'' (نحل/۱۰۳) حجر ۳۳، انبیاء ۳، مومنوں ۲۴، ۳۳، ۳۴، ۴۷، شوریٰ ۵۱، ۱۸۶، یٰسین ۱۵، تغابن ۶، مدثر ۲۵، ہود ۲۷، اسراء ۹۴، قمر ۲۴۔

۵۔ انبیاء نے کہا ہم تم جیسے بشر ہیں:

﴿قالت لهم رسلهم ان نحن الا بشر مثلکم﴾ ''ان کے رسولوں نے ان سے کہا: بے شک ہم تم جیسے بشر ہیں'' (ابراهیم/۱۱) ﴿قل انما انا بشر مثلکم یوحیٰ الی انما الٰهکم الله واحد﴾ ''کہہ دیجئے: میں تم ہی جیسا ایک انسان ہوں مگر میری طرف وحی آئی ہے کہ تمہارا معبود تو بس ایک ہی ہے'' (کہف/۱۱۰)

انبیاءؑ قرآنِ کریم میں فرماتے ہیں ہم بشری خصوصیات اور تقاضے میں تمہارے برابر ہیں۔

تمام انبیاء امّی ہیں

ہمارے معاشرے میں عقائد کو دلائل و برہان سے اخذ کرنے کے بجائے عقیدت کے دروازے سے حاصل کرنے کو زیادہ پسند کیا جاتا ہے جس چیز کو خداوند عالم نے ثبوت وحی کے لئے بطور دلیل پیش کیا ہے، ہم اسی کی رد میں تقاریر اور لکھتے ہیں لہٰذا اس مقام پر ہم ضروری سمجھتے ہیں کہ پہلے لفظ ''امّی'' کی کچھ وضاحت ہو جائے اور اسکے بعد وحی کی اصل حقیقت کو بھی سمجھ لیا جائے۔

تمام انبیاءؑ عام انسانوں کی مانند بشر ہیں، عام انسان اور بشر ہونے کے علاوہ تمام انبیاء امی ہیں۔ امّی کا مطلب یہ ہے کہ علم و ادب سیکھنے کیلئے انھوں نے نہ کسی دوسرے انسان کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا اور نہ کبھی ہاتھ میں قلم اور تختی اٹھائی لہٰذا نزول وحی سے پہلے وہ ان پڑھ ہی ہوتے ہیں کیونکہ عالم ہونے کیلئے تین صورتیں ہی ہیں اور چوتھی صورت نہیں ہے:

۱۔ علم اس کا ذاتی ہو جیسے علم خداوند متعال لہٰذا علم اسکی صفات ذاتی میں سے ہے

۲۔ علم کسبی ہو، یعنی دوسرے انسان کی شاگردی کر کے حاصل کیا ہو جیسا کہ تمام علماء اور نوابغ کا

علم۔

۳۔ علم خدا کی طرف سے موہبہ اور وحی کے ذریعے ملا ہو جیسے نبی کا علم الہٰذا نبیؐ نبی بننے سے پہلے ان پڑھ ہے۔ اسی لئے حضورؐ بار بار فرماتے تھے:

''لوگو ہم نے تمھارے درمیان ایک عرصہ تک زندگی گزاری ہے، تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو کہ ہم نے کسی سے کچھ نہیں سیکھا، جو کچھ ہم بیان کر رہے ہیں یہ کلام الٰہی ہے جو اس نے بذریعہ وحی نازل فرمایا ہے''

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ''اُمّی'' تھے:

کلمہ ''اُمّی'' قرآن کریم میں ایک مرتبہ حضرت محمدؐ کی صفات میں بیان ہوا ہے:

۱۔ ﴿الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التوراۃ والانجیل﴾

''(پس آج یہ رحمت اُن لوگوں کا حصہ ہے) جو اس پیغمبر، نبی اُمّی کی پیروی اختیار کریں جس کا ذکر انہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا ملتا ہے'' (اعراف/۱۵۷)

۲۔ یہ کلمہ اُس قوم کی صفت میں چند بار تکرار ہوا ہے جس میں پیغمبر اسلامؐ مبعوث ہوئے:

﴿ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم﴾ ''وہی ہے جس نے اُمیّوں کے اندر ایک رسول خود اُنھی میں سے اٹھایا'' (جمعہ/۲) ﴿وقل للذین اوتوا الکتاب والامیین ء اسلمتم فان اسلموا فقد اھتدوا﴾ ''پھر اہل کتاب اور غیر اہل کتاب دونوں سے پوچھو کیا تم نے بھی اس کی اطاعت و بندگی قبول کی؟ اگر کی تو وہ راہِ راست پا گئے'' (آل عمران/۲۰) ﴿قالوا لیس علینا فی الامیین سبیل﴾ ''وہ کہتے ہیں ''اُمیّوں (غیر یہودی لوگوں) کے معاملے میں ہم پر کوئی مواخذہ نہیں ہے'' (آل عمران/۷۵) ﴿ومنھم امیون لا یعلمون الکتاب﴾ ''ان میں سے ایک دوسرا گروہ اُمیّوں کا ہے

جو کتاب کا تو علم رکھتے نہیں'' (بقرہ/۷۸)

پیغمبر اکرم حضرت محمدؐ ''نبی امی'' کے لقب سے زیادہ معروف ہیں نبی کو ''نبی امی'' کہنے کی مختلف توجیہات کی گئیں ہیں:

۱) چونکہ مکہ کو ام القریٰ کہتے ہیں جو کہ کل روئے زمین کا مرکز اور مصدر ہے اور پیغمبر اکرمؐ کا تعلق بھی اسی شہر مکہ سے ہے اسلئے آپ کو امّی کہا جاتا ہے۔

۲) چونکہ اہل مکہ ان پڑھ جاہل تھے یا اپنے علم، فضل اور اندر موجود اقدار اور فضیلت کو اپنے ہی پاؤں تلے روند کر جاہلیت کی زندگی گزارتے تھے لہٰذا ان کے جاننے والے بھی جاہلوں کے حکم میں شمار ہوتے تھے کیونکہ وہ بت پرستی کرتے تھے آپؐ اسی قوم سے تھا اور آپ اسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے، اس وجہ سے آپ کو ''امّی'' کہا گیا ہے:

﴿الذین یتبعون الرسول النبی الامی﴾

''جو لوگ رسول نبی امی کا اتباع کرتے ہیں'' (اعراف/۱۵۷)

مستشرقین نے قرآن کریم کے خلاف نقد و انتقاد کیلئے اٹھائے جانے والے کلمات میں سے کلمہ ''اُمی'' کو سب سے زیادہ اہمیت اور اہتمام کے ساتھ اٹھایا ہے، اگر یہ بات مان لی جائے کہ پیغمبر لکھ پڑھ سکتے تھے تو مشرکین کے اس دعویٰ کو تقویت ملے گی جو کہتے تھے کہ آپکو مکہ میں موجود ایک مسیحی تعلیم دیتا تھا چنانچہ سورہ نحل آیت ۱۰۳ میں اسی طرف اشارہ ہے:

﴿ولقد نعلم انهم یقولون انما یعلمه بشر﴾ ''اور ہم خوب جانتے ہیں کہ یہ مشرکین یہ کہتے ہیں کہ انہیں کوئی انسان اس قرآن کی تعلیم دے رہا ہو''

۳) پیغمبرؐ نہ پڑھ سکتے تھے نہ لکھ سکتے تھے اور جو کچھ اس وقت خبر دے رہے تھے وہ صرف وحی الٰہی تھی جسکا سلسلہ بعثت سے شروع ہوا چنانچہ سورۂ نجم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''ہمارا پیغمبر وحی کے بغیر کچھ نہیں کہتا'' یہ اس نظریہ کی تائید کہ پیغمبر پڑھ لکھ نہیں سکتے تھے

۴) قرآن کریم میں پیغمبر اسلام کیلئے امی ہونے کو بطور صفت بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تمام لوگوں پر یہ بات واضح وعیاں ہو جائے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنی امت کے سامنے جو کچھ پیش کرتے تھے وہ کسی سے حفظ کیا ہوا یا کسی کتاب سے ماخوذ نہیں ہوتا تھا بلکہ آپؐ اس میں تابع وحی تھے، پیغمبر اکرمؐ نہ لکھ سکتے تھے اور نہ پڑھ سکتے تھے اس کے ثبوت میں یہ آیت کریمہ ملاحظہ فرمائیں:

﴿وکذلک اوحینا الیک روحا من امرنا﴾ ''اور اسی طرح ہم نے آپ کی طرف اپنے حکم سے روح (قرآن) کی وحی کی ہے'' (شوریٰ/۵۲)

جبکہ مستشرقین نے یہ کوشش کی ہے کہ لوگ قرآن کی بجائے اُن (مستشرقین) کی بات پر یقین کر کے یہ مان لیں کہ پیغمبر لکھتے تھے اور پڑھتے تھے اور یہ قرآن انھوں نے تورات، انجیل اور اہلِ کتاب کی شخصیات سے حاصل کیا ہے چنانچہ مستشرقین کے سپیرنجر (SPRENGER) نے اپنی کتاب ''حیات وعقیدہ محمدؐ'' میں ذکر کیا ہے کہ اُمی کا مطلب بت پرستی ہے اسی طرح جنٹلز (KLSGENTI) ونسیک (WENSINCK) ہورووٹس (HOROVITS) بلاشیر (BLACHERE) اور رودی پارٹ (RUDIPARET) وغیرہ نے کبھی تو اس کلمۂ اُمی کو اس حوالے سے اٹھایا ہے کہ یہ پیغمبر اکرمؐ قرآن یا دین اسلام میں قوم پرستی، فرسودگی اور جاہلیت کے آثار میں سے ہیں اور کبھی انھوں نے اپنی ہی اس بات کے خلاف حضرت محمدؐ کو لکھنے پڑھنے والا گردانا ہے۔

دوسری طرف ایک عرصے سے ہمارے منابر سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ آپؐ وحی سے ہٹ کر از خود لکھ پڑھ سکتے تھے، چنانچہ انھوں نے پیغمبر اکرمؐ تو درکنار حضرت علی علیہ السلام جو خود صدہا بار فرماتے ہیں کہ میرے سینے میں موجود تمام علوم مجھے رسول اللہ سے ملی ہے: [علمنی رسول اللہ] رسول اللہ نے مجھے ہزار باب سکھائے ہیں، اس کے باوجود یہ جاہل آپؐ کے بارے میں کہتے ہیں جب آپؐ پیدا ہوئے تو سجدے میں تورات، انجیل، زبور، قرآن پڑھ لیا ہم سب کیلئے یہ بات لمحۂ فکریہ ہے کہ کیوں ہمارے منابر سے اس موضوع کو خود محمدؐ اور آپ کی دعوت سے زیادہ

اٹھایا جاتا ہے؟ اس سے کس کی خدمت ہوتی ہے کیا اس سے وحی الٰہی کی ترویج ہوتی جو پیغمبر اکرمؐ اور اسلام کے بارے میں ہے یا مستشرقین کے اس مدعا کو تقویت ملتی ہے جہاں وہ کہتے ہیں کہ حضرت محمدؐ نے قرآن کریم کو تورات، انجیل اور اُن کے علماء سے حاصل کیا ہے۔

مستشرقین کے تربیت یافتہ یا گماشتہ مسلمانوں کا یہ کہنا ہے کہ آپ لکھ بھی سکتے تھے اور پڑھ بھی سکتے تھے وہ یہ فکر اندر سے مستشرقین کی فکر کو تقویت دینے کی خاطر کہتے ہیں اور باہر سے سادہ لوح مسلمانوں کو منوانے کیلئے یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ ان پڑھ 'پڑھ لکھ نہ جاننا' ایک عیب ہے اور حضور ہر عیب سے پاک ہیں لہٰذا انھیں اُمی نہیں کہہ سکتے، چاہے وہ مستشرقین کی تائید کے خاطر کہتے ہوں یا سادہ خام خیالی میں کہتے ہوں ان کی یہ فکر فرسودہ عقل ونقل سے متصادم ہے ان خیالات کے حامل افراد نے اپنی خام اور ناقص سوچ کے تحت یہ کہہ کر اُمی ہونے کو مسترد کیا کیونکہ ان کے خیال میں پڑھنا لکھنا بذات خود ایک فضیلت ہے اور پیغمبرؐ چونکہ افضل اور اشرف الناس تھے، لہٰذا اس فضیلت سے محروم نہیں رہ سکتے اور اگر ایسا تھا تو معاذ اللہ پیغمبر ایک ناقص انسان تھے اور خدا نے ایک ناقص انسان کو نبوت کیلئے منتخب کیا ہے دراصل خود انکی یہ سوچ ناقص اور درج ذیل وجوہات کی بنا پر غلط ہے:

الف) علم، شجاعت، سخاوت یا کوئی بھی صفت بذات خود کوئی فضیلت نہیں رکھتی بلکہ یہ اپنی جگہ وسائل اور ذرائع ہیں ان کی فضیلت ان کے اہداف سے وابستہ ہے علم کے بارے میں آیا ہے [شرف العلوم شرف الغایات] بلکہ یہ سب اسی وقت قابل تعریف وستائش ہیں جب انھیں صحیح طریقے سے استعمال کیا جائے لہٰذا کثیر روایات میں عالم بے عمل کو شجر بے ثمر اور نہر بے آب سے تشبیہ دی گئی ہے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا کہ عالم بے عمل دین کیلئے نقصان دہ اور آخرت میں عذاب الٰہی کا زیادہ مستحق ہے پس معلوم ہوا کہ علم بذات خود کوئی بافضیلت شئے نہیں جب تک اس سے صحیح طور پر استفادہ نہ کیا جائے۔

ب) کسی انسان کی قوت سماعت اس لئے کمال انسانی سمجھی جاتی ہے کہ وہ آواز کو سنتا ہے لہٰذا وہ لوگ جو آواز سنتے ہیں نہ سننے والوں سے بہتر ہیں لیکن فرض کریں ایک ایسا شخص جو سماعت ظاہری اور بصارت ظاہری نہ رکھنے کے باوجود بہتر، صاف ستھرا اور زیادہ سنتا بھی ہو اور دیکھتا بھی ہو تو کیا ایسا شخص بھی قوت سماعت اور بصارت سے محروم شخص کے زمرے میں آئے گا جو باطنی سماعت اور بصارت رکھتا ہو اور کیا اس کے مقابلہ میں وہ پہلا شخص جو قوت سماعت رکھتا ہے اس سے بافضیلت قرار پائے گا؟۔

ج) اگر یہ کہا جائے کہ پیغمبر اکرمؐ پڑھ لکھ سکتے تھے یعنی خدا نے انہیں یہ صلاحیت دے رکھی تھی، لیکن وہ بندگان خدا پر یوں ظاہر کرتے تھے کہ آپ کچھ جانتے ہی نہیں ہیں' ایسا ہونا تو ممکن ہی نہیں (نعوذ باللہ) یہ تو ایک بڑا دھوکہ ہوگا اسکی مثال ایک ایسے انسان کے مانند ہوگی جس نے کسی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد اعلیٰ ڈگری حاصل کی ہو لیکن لوگوں پر یہ ظاہر کرے کہ گرچہ وہ پڑھا لکھا نہیں، اسکے باوجود سب کچھ جانتا ہے یہ تو فریب اور دھوکہ بازی ہوئی، کبھی نہ کبھی یہ راز فاش ہو گا اور لوگوں کو اصل بات کا پتہ چل جائے گا خدا اور رسول خدا سے متعلق ایسا تصور محال ہے۔

قرآن کی درج ذیل آیات سے بھی آنحضرتؐ کا اُمی ہونا ثابت ہوتی ہے:

﴿وما کنت تتلوا من قبلہ من کتاب ولا تخطہ بیمینك اذًا لارتاب المبطلون﴾ ''(اے نبیؐ) تم اس سے پہلے کوئی کتاب نہیں پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے اگر ایسا ہوتا تو باطل پرست لوگ شک میں پڑ سکتے تھے'' (عنکبوت/۴۸) ﴿ان اتبع الا ما یوحی الی﴾ ''میں تو اسی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر وحی آتی ہے'' (احقاف/۹) ﴿ولئن شئنا لنذھبن بالذی اوحینا الیك......﴾ ''جو کچھ پیغمبر کے پاس ہے وہ وحی ہے اگر ہم چاہیں تو واپس لے سکتے ہیں'' (بنی اسرائیل/۸۶) ﴿نحن نقص علیك احسن القصص بما اوحینا الیك ھذا القران وان کنت من قبلہ لمن

الغفلين﴾ ''ہم آپ کے سامنے ایک بہترین قصہ بیان کر رہے ہیں جس کی وحی اس قرآن کے ذریعے آپ کی طرف کی گئی ہے، اگرچہ اس سے پہلے آپ بے خبر لوگوں میں سے تھے'' (یوسف/۳) ﴿لقد کنت فی غفلة من هذا﴾ ''یقیناً تم اس کی طرف سے غفلت میں تھے'' (ق/۲۲) اعراف/۱۷، یونس/۲،۴،۱۰۲،

اسی طرح قرآن کریم میں مکرر اور بار بار آیا ہے کہ آپ وہاں نہیں تھے' آپ اس وقت نہیں تھے' آپ نہیں جانتے تھے ہم نے آپ کو بتایا ہے لہذا پیغمبر اکرم کا اُمی ہونا یعنی نہ لکھنا اور نہ لکھے ہوئے کو پڑھنا آپؐ کے معجزات میں سے ہے، لہذا جو لوگ پیغمبر کا اُمی ہونا یعنی پڑھنا' لکھنا نہ جاننے کو رد کر کے پڑھنے لکھنے کو ثابت کرتے ہیں آج کے مستشرقین اُس وقت کے مشرکین کی منطق کو دھرا رہے ہیں یا ان کی آواز میں آواز ملا رہے ہیں۔

تمام انبیاءؑ اللہ کی جانب سے مبعوث بہ رسالت ہو اسی کیفیت میں ہوئے ہیں۔

انبیاء اور علم غیب

علم غیب کے بارے میں بحث اور گفتگو کیلئے مناسب ترین جگہ بحث نبوت ہے کیونکہ خداوند متعال اپنے ذات پر ایمان لانے کے بعد نبوت پر ایمان کو علم غیب میں شمار کیا ہے کیونکہ نبی کی نبوت' نبی کی خبریں سب غیب سے ہی وابستہ ہیں، بحث نبوت میں علم کا موضوع غیب دو زاویوں سے مناسب اور سزاوار ہے:

الف) دعوائے نبوت کرنے سے پہلے یہی شخص ایک عام انسان کی حیثیت سے معاشرہ میں زندگی بسر کر رہا ہوتا ہے۔ وہ تمام خصوصیات، صفات اور نفسیات کے اعتبار سے بھی دیگر انسانوں کے مانند ہوتا ہے وہ انہی انسانوں کے معاشرہ میں، ان کے سامنے ہی پیدا ہوتا ہے اس نے یہیں رشد و نمو پائی ہوتی ہے اور دیگر لوگوں کے مانند ہی زندگی گزاری ہوتی ہے اس نے غلط رسومات، خرافات اور غلط عادات کے سوا، معاشرہ کی تمام اجتماعی سرگرمیوں میں دوسرے انسانوں کے دوش

بدوش حصہ لیا اوراس معاشرہ کے نشیب وفراز کے ادوار کودیکھتا ہے،لوگوں نے کبھی ان انبیاء سے کوئی غیر معمولی حرکات وسکنات نہیں دیکھی لہٰذا لوگوں نے انبیاء سے کہا ہم ایسا انتظار کرتے تھے:

﴿قالوا یٰصٰلح قد کنت فینا مرجوّا قبل﴾ ''انھوں نے کہا: اے صالح! اس سے پہلے ہم تم سے بڑی امیدیں وابستہ رکھتے تھے'' (ھود/۶۲)

ب) اس انسان (نبی) نے کسی مکتب، کسی استاد، کسی معلم کے حضور علم وآگاہی کیلئے زانوئے تلمذ نہیں کیا اس نے شاگردی کیلئے کسی کے آگے سرنہیں جھکایا اس نے لکھنے کی مشق کیلئے نہ کبھی تختی لی اور نہ قلم پکڑا۔ لہٰذا ایک ایسے ہی انسان کو عربی زبان میں امّی کہتے ہیں لہٰذا نبی کو اُمی کہنا سو فیصد حقیقت اور واقعیت سے مطابقت رکھتا ہے۔ خداوند متعال نے ہمیشہ امی ہی کو منصب نبوت کیلئے انتخاب فرمایا ہے۔ شاید اس میں یہ حکمت پوشیدہ ہو کہ یہ انسان جو دعوائے نبوت کر رہا ہے، سرچشمہ وحی سے متصل ہے اور من اللہ خبر دیتا ہے۔

موضوع علمِ غیب انبیاء کو کھولنے کیلئے ضروری ہے کہ ''علم'' اور ''غیب'' دونوں پر جداگانہ بحث وگفتگو کریں ''علم'' جیسا کہ علماء نے تعریف کی ہے کسی چیز کی شکل وصورت کا ذہن میں حاضر ہونا یا ہر وہ چیز جو انسان کے سامنے ہو اسے علم کہا جاتا ہے دوسرا کلمہ ''غیب'' ہر وہ غیر محسوس، پوشیدہ چند چیز ہے جو حواسِ ظاہری کے مشاہدے میں نہیں آتی اسے ''غیب'' کہتے ہیں اگر اس تک رسائی ہو جائے اور آگاہی حاصل ہو تو اس سے متعلق خبر کو علم غیب کہتے ہیں۔

کائنات کے تمام تر حقائق یعنی مادیات، مجردات اور عقلیات سب کو شامل کرنے کے بعد انکو خداوند عالم نے بہت سی آیات قرآنی میں دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:

الف: ایک ''عالم غیب'' یعنی وہ حقائق جو ہماری نظروں سے مخفی او جھل اور پوشیدہ ہیں۔

ب: دوسرا ''عالم شہود'' یعنی وہ حقائق جو نظروں کے سامنے موجود ہیں۔

چنانچہ درج ذیل آیات قرآنی میں اس تقسیم کی طرف اشارہ کیا گیا ہے:

﴿علم الغیب والشهادة وهو الحکیم الخبیر﴾ ''وہ غیب اور شہادت ہر چیز کا عالم ہے اور دانا و باخبر ہے'' (انعام/۷۳) ﴿وستردون الی علم الغیب والشهادة فینبئکم بما کنتم تعلملون﴾ ''پھر تم اس کی طرف پلٹائے جاؤ گے جو کھلے اور چھپے سب کو جانتا ہے اور وہ تمہیں بتا دے گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو'' (توبہ/۱۰۵) ﴿علم الغیب والشهادة الکبیر المتعال﴾ ''وہ پوشیدہ اور ظاہر، ہر چیز کا عالم ہے۔ وہ بزرگ ہے اور ہر حال میں بالاتر رہنے والا ہے'' (رعد/۹)

﴿علم الغیب والشهادة العزیز الحکیم﴾ ''حاضر اور غائب ہر چیز کو جانتا ہے، زبردست اور دانا ہے'' (تغابن/۱۸)

یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ موجودات عالم دو حصوں یعنی غیب اور حضور میں تقسیم کیے گئے ہیں، ہم آپ کے سامنے غیب کے اقسام پیش کریں گے۔

اقسام غیب

۱) **غیب حقیقی:** وہ موجود جو ہر زمانہ میں اور ہر زاویہ نگاہ سے غیب مطلق ہے اسے غیب حقیقی کہتے ہیں، نہ زمان اسے عیاں کر سکتا ہے، حتی کہ خوردبین اور دوربین اسے نمایاں کر سکتی ہیں ہمیشہ سے غیب تھا آج بھی غیب میں ہے اور آئندہ بھی غیب میں رہے گا وہ کسی کے لئے کسی بھی وقت حضور اور شہود میں تبدیل نہیں ہو سکتا یہ غیب حقیقی ذات باری تعالی ہے وہ نہ صرف اس عالم مادی میں غیب میں ہے بلکہ اسکے بعد آنے والے عالم بالا یعنی آخرت میں بھی غیب ہی رہے گا جتنی بھی آیات اور روایات، اس ذات تک رسائی یا اسکی رویت کے بارے میں بیان کی گئی ہیں انکا مقصد رویت بصیرت ہے نہ رویت بصری کیونکہ وہ کبھی بھی کسی شکل میں نہیں آسکتا اور اسکی حقیقت پر ایمان کامل اور حق الیقین کے درجہ پر فائز ہونے کو رویت اور بصارت سے تعبیر کیا گیا ہے ورنہ بصارت طبیعی اور

ٹیکنالوجی اسے درک کرنے سے قاصر ہیں۔

۱) غیب حقیقی

وہ ہستی جو ہر معنی اور ہر زاویہ کے حوالہ سے غیب ہو، اغیاب میں سب سے زیادہ غیب کہے جانے کے لائق و سزاوار ہو، جس کا کسی بھی اعتبار سے شہود مادی و جسمانی میں آنا ممکن نہ ہو، وہ ''غیب مطلق'' یا ''غیب حقیقی'' کہلاتی ہے۔

خداوند تعالی کی ذات غیب مطلق ہے جبکہ کل کائنات اس کے لئے حضور وعیاں ہے۔ لہٰذا خداوند متعال کے متعلق یہ کہنا کہ وہ علم غیب جانتا ہے، ہرگز مناسب نہیں کیونکہ کوئی چیز کسی بھی صورت میں کبھی بھی خدا کیلئے غیب ہے ہی نہیں، پس یہ کہنا کہ ''خدا علم غیب جانتا ہے'' سے مراد یہ ہے کہ وہ علوم اور حقائق جو ہمارے لئے غیب ہیں وہ سب کے سب اس کے لئے حضور وشہود میں ہیں ہر چیز ہمیشہ اس کے حضور اور شہود میں رہتی ہے اس بات کو ہم ایک مثال کے ذریعہ سمجھ سکتے ہیں فرض کریں کہ ہم خود اپنے بارے میں یہ خیال کریں کہ ہم اس وقت یہاں نہیں ہیں یا یہ کہ وجود میں آئے ہی نہیں ہیں کیا حقیقت میں ایسا ممکن ہے؟ ہرگز نہیں، ہم کتنا ہی اپنے آپ کو پوشیدہ اور غائب کریں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہر حال میں ہم خود اپنے حضور میں حاضر ہونگے بالکل اسی طرح اس رب کائنات کے لئے ہر چیز ہمہ وقت حاضر اور ناظر رہتی ہے لہٰذا علم غیب خدا، مخلوقات کے علوم غیب سے کئی اعتبار سے ممتاز اور جدا ہے خدا علم غیب نہیں رکھتا بلکہ اس کیلئے کوئی چیز غیب میں نہیں ہے لہٰذا فرماتے ہیں:

﴿ولله غیب السمٰوٰت والارض﴾

''اور آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتوں کا علم صرف اللہ کو ہے'' (ھود/۱۲۳)

۱) دنیا ومافیھا، ماضی، حال، مستقبل، کچھ بھی خدا کیلئے غیب نہیں، بلکہ سب کچھ اس کیلئے حاضر اور شاہد ہے پھر بھی یہ کہنا کہ ''اس کے پاس علم غیب ہے'' یہ دراصل ہماری نسبت سے کہا جاتا ہے

کیونکہ جو چیز ہمارے لئے غیب ہے، وہ اسے جانتا ہے۔

۲) جس طرح ذات خدا غیر محدود ہے اسکا علم بھی لامحدود ہے علم خدا کسی حدو قید میں نہیں آسکتا چونکہ علم خدا، ذات خدا سے جدا نہیں اس لئے وہ بھی غیر محدود ہے اس کے سوائے دیگر تمام مخلوقات کے علوم، چاہے وہ اس کے منتخب اور مصطفیٰ بندے ہی کیوں نہ ہوں، اس کی نسبت محدود ہیں وہ تو بس اتنا جانتے ہیں جتنا انھیں خداتعالیٰ نے سکھایا ہے چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے منقول آیت کریمہ ہے: "میں وہ جانتا ہوں جو تو نے مجھے سکھایا ہے"۔

۳) علم خدا اس ذاتی ہے، کسی سے ماخوذ نہیں ہے اس کے علاوہ جتنی بھی مخلوقات ہیں، کسی کا علم ان کا ذاتی نہیں کیونکہ خود انکا وجود ذاتی نہیں بلکہ اللہ کا عطا کیا ہوا ہے تو بھلا انکا علم کس طرح ذاتی ہو سکتا ہے؟ جس طرح انکی ذات کی بقاء ذات خدا سے وابستہ ہے، اسی طرح انکا علم بھی اس سے وابستہ ہے چنانچہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات کریمہ میں خداوند عالم نے علم غیب حقیقی کو اپنی ذات سے مختص کیا ہے:

﴿وعنده مفاتح الغيب لا يعلمها الا هو﴾ "اور اس کے پاس غیب کے خزانے ہیں جنہیں اس کے علاوہ کوئی نہیں جانتا ہے" (انعام/۵۹) ﴿قل لا يعلم من فى سموات والارض لغيب الا الله﴾ "کہہ دیجئے کہ آسمان و زمین میں غیب کا جاننے والا اللہ کے علاوہ کوئی نہیں ہے" (نمل/۶۵) ﴿قال انما العلم عند الله﴾ "انہوں نے کہا کہ علم تو بس خدا کے پاس ہے" (احقاف/۲۳) ﴿قل انما العلم عند الله﴾ "آپ کہہ دیجئے کہ علم تو بس خدا کے پاس ہے" (ملک/۲۶) ﴿انك انت علام الغيوب﴾ "تو، تو غیب کا جاننے والا بھی ہے" (مائدہ/۱۱۶) ﴿تلك من انباء الغيب نوحيها اليك ما كنت تعلمها﴾ "یہ ہیں علم کی کچھ خبریں جو ہم آپ کی طرف وحی کر رہے ہیں اس سے پہلے نہ آپ ان باتوں کو جانتے تھے" (ھود/۴۹) ﴿قل الله اعلم بما لبثوا له غيب

السموات والارض﴾

"کہہ دو کہ جتنی مدت وہ رہے اسے خدا ہی خوب جانتا ہے۔ وہی آسمانوں اور زمین کی پوشیدہ باتیں جانتا ہے" (کہف/۲۶)

۲) غیب عرفی: عُرفِ عام میں ہر وہ چیز جو انسان کے حواسِ خمسہ سے اوجھل ہو اور اسکی حدود بصارت سے باہر ہو، اسکے دائرہ افق سے خارج ہو، زمانہ اسے غیب کہتے ہیں ہوسکتا ہے پہلے وہ حضور میں ہو، اب غیب میں چلی گئی ہے جیسے انبیاءِ گذشتہ، اقوام وملل گذشتہ یا ابھی غیب میں ہے اور آنے والے زمانہ میں حضور میں تبدیل ہو جائے اس غیب کے مختلف مصادیق ہیں:

الف) زمان گزشتہ

دور حاضر کے انسان کیلئے گذشتہ زمانہ غیب ہے یعنی اس سے پہلے گزرنے والے تمام انسان، موجودات، واقعات اور حوادث اس انسان کیلئے غیب ہیں قانون طبیعی کے حوالہ سے اس کیلئے انکا حضور میں تبدیل ہونا ممکن نہیں مگر یہ کہ وحی الٰہی کے ذریعے جیسے قرآنِ کریم میں آیا ہے:

﴿وما کنت بجانب الغربی اذقضینا الیٰ موسی الامروما کنت من الشٰھدین﴾ "اور آپ اس وقت (طور کے) مغربی جانب موجود نہ تھے جب ہم نے موسٰی کی طرف حکم بھیجا اور آپ مشاہدہ کرنے والوں میں سے نہ تھے" (قصص/۴۴) ﴿وان کنت من قبلہ لمن الغٰفلین﴾ "اور آپ اس سے پہلے (ان واقعات سے) بے خبر تھے" (یوسف/۳) کسی آلے میں ضبط ہوئی ہوں۔

ب) زمان مستقبل

ہر آئندہ آنے والا دن اور اس میں ظہور پذیر ہونے والے واقعات دور حاضر کے انسان کیلئے غیب ہیں ممکن ہے آج کا انسان آئندہ زمانہ تک زندہ رہے اور آج جو کچھ اس کے لئے غیب ہے کل حضور اور شہود بن جائے یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس غیب کے حضور میں تبدیل ہونے سے پہلے ہی وہ اس

دنیا سے رخصت ہو جائے۔

۳) غیب مکانی

ہر وہ چیز جو انتہائی فاصلہ پر واقعہ ہو غیب ہے جب تک فاصلوں کو نزدیک کر کے دکھانے والے آلات استعمال نہ کئے جائیں جیسا کہ پہلے غیب کی تعریف میں بیان کیا جا چکا ہے، انسان کی حد بصر سے باہر شش جہات انسان کیلئے غیب ہیں جب تک وہ نقل و حرکت نہ کرے یا وہ وسائل اور ذرائع جو دور کو نزدیک اور چھوٹے کو بڑا کر دکھاتے ہیں، انھیں استعمال نہ کرے، اس کیلئے یہ سب کچھ غیب رہے گا۔

۴) (غیب حجمی) حجم میں چھوٹا ہونے سے

بہت سے اجسام اتنے چھوٹے ہیں کہ طبیعی بصارت انکی رویت سے محروم رہتی ہے لہٰذا یہ اجسام غیب میں رہتے ہیں تاوقتیکہ دیکھنے کے لئے ایسا آلہ استعمال نہ کیا جائے جو انہیں چند گنا بڑا کر کے دکھائے۔

۵) غیب مجرد

غیب مجرد وہ ہے جو اپنی لطافت کی وجہ سے کسی بھی وسائل حس میں نہیں آتا، تمام مجردات جسم اور جسمانیات سے خارج ہیں وہ کسی خوردبین اور دوربین یا کسی دیگر آلے میں نہیں آسکتے، اس کی چند قسمیں ہیں:

۱۔ مجرد حقیقی: مجرد حقیقی صرف ذات خداوند متعال تک محدود ہے یہ ذات کسی بھی صورت میں کسی مادہ کی شکل وصورت میں نہیں آسکتی جو چیز مادی شکل وصورت بھی آجائے تو سمجھ لیں کہ وہ مجرد حقیقی نہیں ہے۔

۲۔ مجرد لطیف الجسم: یعنی مجرد حقیقی نہیں ہے بلکہ وہ مجرد مجازی ہے وہ خود کو دیگر موجودات جسمانی کی شکل وصورت میں تبدیل کر سکتا ہے جیسے ملائکہ مجردات عالم علوی سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ کسی

وقت بھی خود کو جسم کثیف (ٹھوس) میں تبدیل کر سکتے ہیں لیکن نجس العین شکل وصورت میں تبدیل نہیں کر سکتے جیسے وہ ملائکہ جو حضرت ابراہیمؑ حضرت لوطؑ اور حضرت مریم بتول (س) کے پاس بشر کی صورت میں آئے اور اسی طرح حضرت محمدؐ کے پاس "دحیہ کلبی" کی صورت میں آئے اور جنگِ بدر میں مشرکین نے ملائکہ کو بشر کی صورت میں دیکھا ملائکہ کو اپنی حقیقی صورت میں صرف پیغمبر اکرمؐ نے دیکھا۔

۳۔ "جن": مجرداتِ سفلی ہے جو ہر اچھے برے کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

۴۔ مجرد کی چوتھی قسم وہ ہے جو کسی مادہ کی شکل وصورت میں نہیں آسکتی لیکن مادے میں حلول کر سکتی ہے اور جگہ بنا سکتی ہے جیسے روح، عقل، ایمان، ملائکہ، علم، کفر، شرک دریا وغیرہ یہ تمام چیزیں مجردات کہلاتی ہیں۔ انسان انکی آثار اور نشانیوں کے ذریعہ آگاہی حاصل کر سکتا ہے ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے محسوسات میں نہیں آتیں، اس کے باوجود انسان ان کے وجود کو تسلیم کرتا ہے۔

۶) حجاب وموانع

ہر وہ شئے غیب ہے جس کے اور انسان کے درمیان موانع حائل ہوں جیسے انسان کے اندر موجود جراثیم جن سے انفیکشن لاحق ہوتا ہے غیب ہیں یا حمل اس وقت تک غیب رہے گا جب تک وہ وسائل استعمال میں نہ لائے جائیں جو اس حجاب میں شگاف کر کے حقائق کو حضور (شہود) میں تبدیل کرتے ہیں غرض ان میں سے بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن تک دور انبیاءؑ اور ائمہؑ میں رسائی و آگاہی بشر کیلئے میسر نہیں تھی لہٰذا یہ چیزیں اس وقت کے انسانوں کیلئے غیب تھیں مگر انبیاء کرامؑ نے بغیر کسی ظاہر وسائل اور ذرائع کے، وحی الٰہی کی روشنی میں بہت سی ایسی چیزوں کی خبر دی بعض آیات اور روایات میں اسے علم بالغیب کہا گیا ہے یہ تمام اقسام غیب مادی ہیں۔

۷) غیب مجازی

اس کے علاوہ غیب کے جتنے بھی مصادیق اور مظاہر ہیں، سب کے سب شہود اور حضور کے دور سے گذر کر غیب میں تبدیل ہوئے ہیں مثال کے طور پر دنیا میں جتنے بھی انسان گزرے ہیں وہ ایک عرصہ زندگی گزارنے کے بعد اس دنیا سے کوچ کر گئے اور یہاں کے حوالے سے غیب میں چلے گئے۔ اس دنیا میں پھر سے انکا حضور اور شہود ناممکن ہے سوائے اس کے کہ اس عالم کی بساط کو جمع کر کے اس سے پردے کو ہٹایا جائے تو ممکن ہے کہ شہود و حضور میں آجائیں اسی طرح جو آج موجود ہیں کسی نہ کسی دن وہ بھی غیب میں چلے جائیں گے لہٰذا وہ ذات جسکے لئے حضور اور شہود جسمانی یا مادی کبھی بھی ممکن نہیں اور وہ غیب جو حقیقی معنوں میں غیب کہے جانے کا مستحق ہے، وہ ''غیب مطلق'' اور وہ ''غیب حقیقی'' ذات باری تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور نہیں، اس لئے قرآن کریم میں سورۂ توحید یا سورۂ اخلاص کو ائمہ اطہارؑ نے نسب خدا کہا ہے اس سورۂ مبارکہ میں خداوند عالم نے اپنی ذات کی تعریف کا آغاز ''ھُوَ'' سے کیا ہے لفظ ''ھُوَ''، ضمیر غائب ہے ضمیر غائب سے سورۂ کی ابتداء کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ خلق خدا جان لے کہ کبھی بھی اور کسی بھی صورت میں ذات خدا رویت بصری میں نہیں آئے گی۔

درج بالا مثال سے ثابت ہوتا ہے کہ ایمان بالغیب یعنی غیر بصری اور غیر سمعی موجود پر عقیدہ قائم کرنا عقل وفطرت انسانی سے متصادم اور متضاد نہیں ہے بلکہ ناگزیر ہے لیکن پہلے ایمان بالغیب اور علم غیب میں فرق واضح ہونا ضروری ہے۔

ایمان بالغیب اور علم غیب

عقائد میں سب سے بنیادی عقیدہ ایمان بالغیب ہے یعنی وجود خدائے واحد و یکتا اور اسکی ذات وصفات میں وحدانیت ہونے پر ایمان، اس کے علاوہ تمام انبیاء، حیات بعد الموت، برزخ، حشر و نشر، جنت اور جہنم سب پر ایمان رکھنا بھی لازمی ہے لیکن یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان کو غیب کی

خبر دی جائے کیونکہ اس وقت دنیا میں بہت سے گروہ نکلے ہیں جو علم غیب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اس ضمن میں یہ کبھی آیات اور روایات سے بھی استدلال کرتے ہیں اس سلسلہ میں ایک فہرست پیش خدمت ہے:

۱۔ علم نجوم رکھنے والے۔

۲۔ سائنسی ماہرین۔

۳۔ عرفاء۔

۴۔ آئمہ معصومینؑ۔

۵۔ انبیاءِ کرامؑ۔

انبیاء کا حامل علم غیب ہونا ہمارے عقائد کے بنیادی معتقدات میں شمار ہوتا ہے۔ اس لئے علم غیب کے موضوع پر گفتگو انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ اسلئے بھی ضروری ہے کہ ظاہری طور پر بعض آیات قرآنی اور روایات اور اسی طرح جدید سائنسی علوم اور اہل طریقت و سیر سلوک اور عرفان سے نقل ہونے والے واقعات اور قصے آپس میں متضاد و متصادم نظر آتے ہیں اس موضوع کے بارے میں بہت زیادہ افراط و تفریط سے کام لیا گیا ہے اور شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا ہے علم غیب کو صرف خدا تک محدود رکھنا یا اسے توسیع دینے کے سبب اعتقادات میں کثیر اختلافات پیدا ہو گئے ہیں لہٰذا ضروری ہے کہ اس موضوع پر زیادہ سے زیادہ گفتگو کی جائے تا کہ تمام زاویوں سے اس مسئلہ کو واضح کیا جا سکے۔

''خدا علم غیب جانتے ہیں'' یہ جملہ ایک لکنت زبان انسان کی گفتگو کے مانند ہے یا ایک عمیق اور باریک فلسفی و علمی مسائل کسی طالب علم یا جاہل انسان کی زبان سے جاری ہونے کی طرح ہے کیونکہ خدا کیلئے کوئی شے غیب نہیں کہ اس کے بارے میں خدا کو علم کی ضرورت ہو قرآن میں کہیں بھی یہ جملہ نہیں ملتا ہے بلکہ خدا فرماتے ہیں جو تمہارے لئے غیب ہے وہ ہمارے پاس ہے لہٰذا عالم

الغیب کہنے کے مستحق انبیاء ہیں کیونکہ وہ انسانوں کوغیب سے خبر دیتے ہیں ان کی باتوں پر یا انکی خبروں پر تصدیق کرنے کو"ایمان بالغیب" کہتے ہیں لیکن آپ کے غیب کی کمیت کو جذبہ محبت اورعقیدت سے ناپا نہیں جاسکتا ہے اس سلسلہ میں سب سے پہلا اور واحد ذریعہ وہ کتاب ہے جو پیغمبر اکرمؐ نے اپنی غیب گوئی یا غیب کی خبر کے سند میں پیش کیا ہے وہ قرآن کریم ہے اس سلسلہ میں ہمیں قرآن ہی کی طرف رجوع کرنا ہے وہ انبیاءؑ یا ہمارے پیغمبر کیلئے کتنے غیب رکھنے کی تصدیق کرتے ہیں۔

"نبی" اس انسان کو کہتے ہیں جو دیگر انسانوں کے ساتھ ہر لحاظ سے برابر کا شریک ہو اور انسان ہونے میں دیگر انسانوں کے مقابلہ میں کسی قسم کا فرق اور امتیاز نہیں رکھتا ہو ہر وہ صفت جسے انسان کی انسانیت میں کمال تصور کیا جائے، نبی میں بطور اتم پائی جاتی ہے اور ہر وہ چیز جو انسان کو انسانیت سے گرانے کا سبب بنتی ہے اور اس کو حیوانیت اور بہیمیت سے متصف کرتی ہے، ان سے یہ پاک اور منزہ ہوتے ہیں چونکہ انبیاء کرامؑ دیگر انسانوں کے مانند ہوتے ہیں، ان ہی کے درمیان نشو نما پاتے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں اس وجہ سے. بہت سے لوگوں نے انہیں خدا کا نمائندہ قبول کرنے سے یہ کہ کر انکار کردیا: "تم بھی ہمارے جیسے بشر ہو"

علم غیب پیغمبر، پیغمبر کا ذاتی علم نہیں بلکہ خدا کا ودیعت اور عطا کیا ہوا ہے چنانچہ قرآن کریم کی متعدد آیات علم غیب پیغمبر کے ان کا ذاتی ہونے کی رد میں وارد ہوئی ہیں:

﴿تلك من انباء الغيب نوحيها اليك ما كنت تعلمها انت ولا قومك من قبل هذا﴾ "پیغمبر یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی ہم آپ کی طرف وحی کررہے ہیں جن کا علم اس قبل نہ آپ کو تھا نہ آپ کی قوم کو" (هود/۴۹) ﴿وما يدريك لعله يزكى﴾ "اور تمھیں کیا معلوم شاید وہ پاکیزہ نفس ہوجاتا" (عبس/۳) ﴿وما ادرك ما عليون﴾ "اور تم کیا جانو کہ علیین کیا ہے" (مطففین/۱۹) ﴿وما ادراك ما ليلة القدر﴾ "اور

آپ کیا جانیں کہ یہ سب قدر کیا چیز ہے" (قدر/۲)

خود پیغمبر نے بھی علم غیب کے جاننے کے بارے میں صراحت کے ساتھ نفی کی ہے ملاحظہ فرمایئے:

﴿ولا اعلم الغیب ولا اقول لکم انی ملک﴾ "اور نہ ہم عالم غیب ہیں اور نہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ملک ہیں" (انعام/۵۰)

﴿ولا اعلم الغیب ولا اقول انی ملک﴾ "اور نہ ہر غیب کے جاننے کا دعوی کرتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں" (ہود/۳۱) ﴿ولو کنت اعلم الغیب﴾ "اور اگر میں غیب سے باخبر ہوتا" (اعراف/۱۸۸) ﴿قالو لا علم لنا﴾ "وہ کہیں گے کہ ہم کیا بتائیں تو خود ہی غیب کا جاننے والا ہے" (مائدہ/۱۰۹)

آل عمران ۱۷۹ اور سورۂ جن آیت ۲۶ اور ۲۷ میں خداوند عالم نے فرمایا کہ علم غیب خلائق میں سے صرف وہی جانتے ہیں جنھیں ہم منتخب کرتے ہیں:

﴿علم الغیب فلا یظھر علیٰ غیبه احدًا۔ الا من ارتضی من رسول﴾ "وہ غیب کا جاننے والا ہے اور اپنا غیب کسی پر ظاہر نہیں کرتا۔ سوائے اس رسول کے جسے اس نے برگزیدہ کیا ہو"۔

خدا اور انبیاء کے علم غیب میں بنیادی فرق

علم غیب انبیاء ورسل علم غیب خداوند متعال سے دو لحاظ سے مختلف ہیں:

۱) علم غیب انبیاء ورسل دیگر خلائق کے علم غیب کے مقابلہ میں تالاب یا حوض کے مقابلہ میں سمندر کا ہے حوض کے مقابلہ میں سمندر کو غیر محدود قرار دیا جاسکتا ہے، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سمندر خود اپنی جگہ محدود ہے لہذا انبیاء کا علم ہم جیسوں کے مقابلہ میں سمندر کے مانند ہونے کے باوجود علم خدا کے سامنے محدود اور ناچیز ہے یہ کہنا شرک اور کفر کے مترادف ہوگا

کہ جو کچھ خدا جانتا ہے نبی بھی جانتا ہے آیات نفی شریک خداوند متعال اس مدعا کے بطلان پر مہر محکم ہیں۔

۲) دوسرا فرق یہ ہے کہ نبی کا علم غیب، خدا کے علم غیب کے مقابلے میں عارضی، طفیلی، وابستگی اور نیاز مندی ضرورتاً اور وقتی کا علم ہے۔ یہ نبی یا رسول کل تک عام انسانوں کے مانند تھے، لیکن آج خداوند متعال سے ارتباط کی وجہ سے خطا اور اشتباہ سے محفوظ اور علم سالم اور غیب کے حامل ہو گئے ہیں وہ اس علم کو لینے میں، محفوظ کرنے میں، غرض ہر لحاظ سے اس ذات پاک کے نیاز مند اور محتاج ہے اور ہر آن اور ہر لحظہ، منتظر وحی رہتے ہیں اس نیاز مندی اور ضرورت کو خلائق پر ثابت کرنے کی خاطر پیغمبر اکرمؐ بارہا لوگوں کے سوالوں کے جواب میں فرماتے تھے:

''تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں'' چنانچہ سورہ والضحیٰ کی شان نزول کے ذیل میں بیان ہوا ہے کہ ایک مرتبہ نبی اکرمؐ پر کچھ مدت کیلئے وحی کا سلسلہ بند ہوا تا کہ خداوند عالم نے سورہ نجم میں جو یہ فرمایا کہ ہمارا نبی بغیر وحی کے گفتگو نہیں کرتا، اس کا عملی مظاہرہ ہو جائے۔ لہٰذا جب وحی کا نزول بند ہو گیا تو آپ کی گفتگو بھی بند ہو گی۔

انبیاء اور دنیا کے دانشوروں کی غیب گوئی میں فرق

دنیا میں قدیم دور سے لیکر دور حاضر تک کے مختلف علماء اور دانشور اپنے اپنے شعبوں مثلاً سیاسیات، اقتصادیات، اجتماعیات، فلکیات، ماحولیات، جنگ وغیرہ میں اپنی تحقیق کی بنیاد پر پیشن گوئیاں کرتے آئے ہیں اور یہ سلسلہ اب بھی جاری و ساری ہے، نت نئی ایجادات کے نتیجہ میں حاصل ہونے والے وسائل و ذرائع کے بعد غیب گوئی میں بہت مدد ملی ہے مثال کے طور پر ماہرین فلکیات کیلئے نئی رسدگاہوں کا دستیاب ہونا، علم طب میں الٹرا ساؤنڈ اور جدید لیبارٹریوں کی سہولیات کے ذریعہ شکم مادر میں موجود بچے سے متعلق معلومات کی فراہمی اور مصنوعی (سٹلائیٹ) سیاروں کے ذریعہ قبل از وقت دوسرے ممالک کی جنگی سرگرمیوں کی خبریں ملنا وغیرہ۔ بعض دشمنان دین اور

ضد دین عناصر نے ان آلات کی مدد سے فراہم ہونے والی معلومات کو مثال بنا کر انبیاءؑ کی غیب گوئی کو بے قدر و قیمت ثابت کرنے کی کوشش کی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ ان ماہرین علوم وفنون کی غیب گوئی اور انبیاء کی غیب گوئیوں میں متعدد زاویوں سے نمایاں فرق ہے:

۱) انبیاء کرام نے کسی مکتب اور مدرسہ میں ان موضوعات پر نہ درس لیا اور نہ اس سلسلے میں انہوں نے کبھی کوئی تحقیق اور ریسرچ کی ہے جبکہ دانشور حضرات ایک عمر حصول تعلیم اور تحقیق میں گزارنے کے بعد اس قابل ہوتے ہیں کہ اپنے شعبہ میں غیب گوئی (پیشن گوئی) کر سکیں۔

۲) انبیاء جو بھی غیب گوئی کرتے تھے وہ بغیر کسی مادی وسائل اور ذرائع اور تجسس و تحقیق کے کرتے تھے، جبکہ آج کل کے غیب گو (پیشن گوئی کرنے والے) حضرات مادی وسائل و ذرائع پر انحصار کرتے ہیں مثلاً اگر شکم مادر میں موجود مولود کے بارے میں ڈاکٹر کچھ کہتا ہے تو وہ ایک خاص مشین اور آلے کا محتاج ہے، یہ مشین اور آلہ بجلی کی برقراری کا محتاج ہے، حتٰی اس مواد کا محتاج ہے جو اس آلے میں استعمال ہوتا ہے، تب کہیں جا کر وہ کچھ بتا سکتا ہے۔

۳) بہت سے مایہ ناز غیب گو حضرات، ماہرین علوم وفنون نے پیشن گوئیاں کی ہیں۔ لیکن ایسا بھی ہوا کہ بعد میں انھیں شرمندگی اٹھانی پڑی کیونکہ امر واقعہ انکی پیش گوئی کے مطابق نہ ہوا۔ اسکے برعکس انبیاء و آئمہ نے غیب کی جو باتیں بتائیں کبھی بھی اور ذرہ بھر بھی خلاف واقعہ نہ نکلیں۔

حقیقت وحی

علمائے اعتقاد لکھتے ہیں کہ نبی وہ انسان ہے جو بغیر کسی واسطہ بشر کے، خدا سے ہدایت اور شریعت لیتا ہے اس اخذ کو قرآن کریم نے وحی کا نام دیا ہے دور قدیم سے عصر حاضر تک بہت سے خود غرض، مفاد پرست اور دین دشمن عناصر نے اس منصب کے تصور کو کمزور کرنے، غلط ٹھہرانے یا انسان کو اس سے جدا رکھنے کی خاطر مختلف زاویوں سے مختلف توجیہات وضع کی ہیں۔

بعض نے عقل کے ہوتے ہوئے حصول سعادت کو وحی سے بے نیاز گردانا ہے۔ دور حاضر میں

نت نئے انکشافات واختراعات اور تجربی علوم میں محیر العقول پیشرفت کو بنیاد بنا کر وحی سے بے نیازی کی مہم چلائی جا رہی ہے بعض نے وحی کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے بعد اس تک رسائی حاصل کرنے کے دروازے کو فتح کرنے کی کوشش کی ہے انکا خیال ہے کہ انسان کے اندر ایسی انمول صلاحتیں موجود ہیں جن کی بدولت کبھی کبھی فوق العادت غیر عادی اور غیر معمولی افعال ظہور ونمود پاسکتے ہیں، یعنی انتہائی کوششوں کے بعد، زحمتوں اور تکلیفوں کو برداشت کر کے یا عبادت اور ریاضت کے ذریعہ، تطہیر اخلاق کی منازل طے کرتے ہوئے ایسے مقام ومنصب پر فائز ہو سکتے ہیں اس فکر کے حامل لوگوں کے خیال میں بندگان خدا شوق لقاء اللہ میں مسابقہ ومقابلہ کے اس میدان میں داخل ہوتے ہیں، بعض پیچھے رہ جاتے ہیں اور بعض آگے بڑھ جاتے ہیں، اسی طرح سے بعض مقام ولایت حاصل کر لیتے ہیں اور بعض نبوت ورسالت کے درجہ پر فائز ہو جاتے ہیں، اس فکر کو فروغ دینے والے لوگ اپنے مدعا کیلئے کسی نہ کسی آیت ٬روایت ٬مشاہدہ ٬خواب یا کہانی کا سہارا لیتے ہیں ان میں سے بعض تو مذموم عزائم رکھتے ہیں، بعض وہ ہیں جو حسن نیت کے ساتھ میدان تحقیق میں قدم رکھتے ہیں لیکن حقیقت درک نہیں کر پاتے ٬بعض دلائل وبراہین سے زیادہ کہانیوں اور کہاوتوں پر بھروسہ کر کے راستہ بھٹک جاتے ہیں۔

جہاں تک سیر الی اللہ، لقاء اللہ اور قرب خدا کا تعلق ہے، یہ راستہ، یہ دروازہ، خلائق کیلئے فقط کھلا ہی نہیں ہے بلکہ خدا کی طرف سے اس پر آنے کیلئے دعوت عام ہے دعوت نامہ کتب آسمانی ہیں اور بلانے والے انبیاء ومرسلین ہیں جو لوگ اس راستہ پر قدم رکھتے ہیں انکو ہر قدم پر خدا کی مدد، نصرت اور رہنمائی حاصل ہوتی ہے لیکن مقام نبوت ورسالت ایسا منصب نہیں جو صلاحیت اور کوشش کے نتیجہ میں حاصل ہو سکے اس منصب پر بقدر ضرورت زمان اور مکان، خداوند متعال محدود افراد کو خلائق کی ہدایت کیلئے منتخب کرتا ہے اس انتخاب کی ابتدا سے لیکر انتہا تک خدا اور ان منتخب بندوں کے درمیان رابطہ کا نام "وحی" ہے چنانچہ سورہ مبارکہ شوری آیت ۵۱ میں ارشاد باری تعالی ہے:

﴿وما كان لبشر ان يكلمه الله الا وحيا او من وراى حجاب او يرسل رسولا فيوحى باذنه ما يشاء﴾ ''اور کسی انسان کیلئے نہیں کہ اللہ اس سے باتیں کرے مگر وحی کے ذریعے یا پردہ کے پیچھے سے یا پھر وہ پانے کسی پیغامبر (فرشتے) کو بھیجتا ہے اور وہ حکم خدا کے مطابق جو کچھ اللہ چاہتا ہے وحی کرتا ہے''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ خداوند عالم اپنے ان منتخب بندوں سے اس طرح سے تخاطب اور تکلم نہیں کرتا کہ جسطرح ایک انسان دوسرے انسان سے ہم کلام ہوتا ہے بلکہ یہاں انداز تخاطب اور تکلم کچھ اور ہے اور اس انداز تخاطب کو خدا نے وحی کا نام دیا ہے یہ تکلم کبھی کسی حجاب کے ذریعہ ہوتا ہے جیسا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے درخت کے ذریعہ گفتگو فرمائی، اور کبھی ملائکہ (جبرائیل) کے توسط سے، وحی کا ایک اور ذریعہ القاء فی القلب ہے جو کبھی الفاظ اور کلمات کی شکل میں ہوتا ہے جیسے آیات قرآنی اور کبھی کلمات اور الفاظ کا حجاب بھی نہیں ہوتا، صرف معانی وحی ہوتے ہیں۔ قارئین کرام اس کتاب کے صفحات میں اتنی گنجائش نہیں کہ ہم اس موضوع کو وسعت دے سکیں اس لئے ہم ضروری نکات کی طرف آیتوں کا حوالہ دیکر گفتگو کو مختصر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

وحی کے معنی

لغت کے مطابق کسی بات کو تیزی کے ساتھ اور اشاروں میں سمجھانے کو ''وحی'' کہتے ہیں۔ راغب اصفہانی نے وحی کے معنی رمز گوئی وراسی طرح طبرسی نے بھی وحی کے لفظی معنی دلوں میں خنور بیان کئے ہیں قرآن کریم میں بھی مختلف اقسام وحی کا ذکر آیا ہے چنانچہ لغت اور قرآن کریم میں وحی کے وسیع معنی ملنے کی وجہ سے مفاد پرستوں کو نبوت کی غلط تفسیر کرنے کا موقع ملا، قرآن کریم میں درج ذیل وحیوں کا ذکر آیا ہے۔

ا۔ وحی بہ جماد: سورۂ فصلت آیت ۱۲ میں آسمان کو وحی کرنے کا ذکر ہے:

﴿واوحی فی کل سمآء امرھا﴾ ''اور ہر آسمان میں اس کا حکم پہنچادیا''

۲۔ شہد کی مکھی کو وحی:

﴿واوحی ربك الی النمل ﴾ ''اور آپ کے رب نے شہد کی مکھی پر وحی کی'' (نحل/۶۸)

۳۔ عادی انسان پر وحی: سورۂ قصص آیت ۷ میں مادرِ موسیٰ اور سورۂ آل عمران ۴۵ میں جناب مریم پر وحی کا ذکر ہے:

﴿واوحینا الی ام موسیٰ﴾ ''اور ہم نے مادر موسیٰ پر وحی بھیجی'' ﴿اذقالت الملئکة یمریم ان اللہ یبشرك بکلمة﴾ ''جب فرشتوں نے کہا: اے مریم! اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے'' (آل عمران/۴۲)

۴۔ نبی پر وحی: سورۂ شوریٰ آیت ۵۲ میں اسکا ذکر موجود ہے:

﴿وکذلك اوحینا الیك روحًا من امرنا﴾ ''اور اسی طرح ہم نے اپنے امر میں سے ایک روح آپ کی طرف وحی کی ہے'' (بقرہ/۱۹۷) بقرہ ۹۷

یہی وہ وحی ہے جس سے خداوند عالم نے انسانوں کی ہدایت اور رہبری کیلئے بعض منتخب بندوں کو نوازا ہے۔ یہ وحی دیگر وحیوں سے مختلف ہے۔

وحی نبی کا سبب امتیاز

جن لوگوں کا خیال ہے کہ منصب نبوت اور رسالت صلاحیتوں، کوششوں اور ریاضتوں کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے، یہ فکر سو فیصد غلط اور بے بنیاد ہے تاریخ ہمیں کسی ایک نبی کا بھی پتہ نہیں دیتی جسے اس طریقہ سے یہ منصب حاصل ہوا ہو، اس کے برعکس جیسا کہ بیان ہوا خداوند عالم نے اس منصب کیلئے ہمیشہ ''امی'' کا انتخاب فرمایا ہے کسی بھی نبی کی تعلیم اور تربیت حاصل کرنے کا تاریخ میں کہیں بھی ذکر نہیں ملتا، بلکہ بعض کو تو تعلیم وتربیت وریاضت کے مواقع ہی میسر نہیں آئے۔ جناب موسیٰ کی مثال لے لیجئے جنھوں نے پہلے شکم مادر میں پرورش پائی، پھر دریائے نیل کے موجوں میں اور پھر طاغوت

کے گھرانے میں، اسی طرح بشر اول آدم صفی اللہ کو منصب نبوت عطا کرنا، عیسیٰ کا گہوارے میں بات کرنا، نبی خاتم کو یہ کہہ کر یہ امی ہیں، پڑھ لکھ نہیں سکتے، سید الانبیاء منتخب کرنا، یہ سب واقعات اس بات کی واضح دلیل ہیں کہ یہ منصب صلاحیتوں، کوششوں اور ریاضتوں سے حاصل ہونے والا نہیں ہے بلکہ زمان و مکان اور خلائق کی ضرورت کے پیش نظر خداوند عالم انہی انسانوں میں سے بعض کو اس کیلئے منتخب فرماتا ہے اور جب انتخاب کر لیتا ہے، تو ان پر وحی نازل کرتا ہے۔

چنانچہ قرآن کریم کے مطابق انبیاء نے نبوت مسترد کرنے والوں کو یہی جواب دیا کہ "ہاں واقعا ہم بھی تم جیسے بشر ہیں لیکن ہم میں اور تم میں فصل "وحی" ہے۔

﴿قل انما انا بشر مثلکم یوحی الی انما الھکم الہ واحد﴾ "آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہارے ہی جیسا ایک بشر ہوں مگر میری طرف وحی آتی ہے کہ تمہارا خدا ایک اکیلا ہے" (کہف/۱۱۰)

غرض نبی کا دوسرے انسانوں سے امتیاز یا بقول فلاسفہ، فصل نبی "وحی" ہے۔ کسی انسان کو نبوت کے لئے انتخاب، وحی کے ذریعہ ہوتا ہے اور اس نبی کی دعوت کا آغاز دعوائے نزول وحی سے ہوتا ہے جو ایک غیب کی خبر ہوتی ہے، گویا دعوائے نبوت کا آغاز دعوائے علم غیب سے ہوتا ہے اگر انبیاء سے علم غیب چھین لیا جائے تو وہ بھی عام انسانوں کی صف میں نظر آئیں گے۔

عصمت انبیاء

خدا اپنے بندوں کی ہدایت اور رہبری کیلئے خود انہیں میں سے بعض کو منتخب کر کے مبعوث فرماتا ہے آیات قرآنی اور روایات میں ان ہستیوں کو نبی، رسول اور امام کہا گیا ہے خداوند عالم نے ان ہستیوں کی اطاعت کو اپنی اطاعت سے مربوط کیا ہے یعنی جو انکی اطاعت کرتے ہیں گویا وہ خدا کی اطاعت کرتے ہیں ان ہستیوں کو واجب الاطاعت قرار دینے کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ انھیں ہر قسم کی غلطیوں، جنایتوں اور آلودگیوں سے پاک و منزہ رکھا جائے اور اسکی ضمانت بھی خداوند متعال کی

طرف سے ملنی چاہئے، بس اسی کو عصمت کہتے ہیں، یہی عصمت کی حقیقت ہے اور خداوند عالم کی جانب سے دی گئی یہی ضمانت امت کے لئے اس کے نمائندوں پر اعتماد کا سبب بنتی ہے۔

عصمت، لغتِ عرب اور قوامیسِ قرآنی میں

مادۂ عصمت: ع، ص، م (عصم) سے لیا گیا ہے اور اس کے معنی جیسا کہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے: ''امساک'' ہیں عصمت بمعنی ''امساک'' ہے۔ کتاب صحاح میں عصمت کے معنی ''منع'' کے بیان کئے گئے ہیں چنانچہ کہا جاتا ہے ''عصمت الطعام'' یعنی کھانے سے روکنا۔

عصمت آیات قرآنی میں

قرآن مجید میں یہ لفظ بچانے کے معنوں میں آیا ہے:

سورۂ مبارکہ مائدہ آیت ۶۷ میں ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ ﴿قال ساوی الی جبل یعصمنی من الماء﴾ ''کہا: میں کسی پہاڑ کا سہارا پکڑتا ہوں جو مجھے پانی سے بچائے گا'' (ہود/۴۳)

۲۔ ﴿مالہم من اللہ من عاصم﴾

''ان کو خدا سے بچانے والا کوئی بھی نہیں ہوگا'' (یونس/۲۷)

۳۔ ﴿قل من ذالذی یعصمکم من اللہ ان اراد بکم سوء او اردبکم رحمۃ﴾

''ان سے کہہ دو اگر خدا تمہارے ساتھ برائی کا ارادہ کر بیٹھے تو کون ایسا ہے جو تمہیں اس سے بچائے، یا بھلائی ہی کرنا چاہے'' (احزاب/۱۷)

۴۔ ﴿واللہ یعصمك من الناس﴾ ''اللہ تمہیں لوگوں سے بچائے گا'' (مائدہ/)

آیت اللہ تقی مصباح یزدی عصمت کے معنی بیان کرتے ہوئے دو نکتے بیان فرماتے ہیں:

۱۔ نگاہ داشتن یعنی محفوظ رکھنا

۲۔ مانع شدن یعنی مانع ہونا

عصمت کے اصطلاحی معنی

اصطلاح میں عصمت اس ملکہ نفسانی کو کہتے ہیں جس کا حامل انسان خطا اور اشتباہ سے باز رہتا ہے۔ایسے افراد کو معصوم کہتے ہیں، یعنی خدا نے انہیں خطا اور گناہ سے محفوظ رکھا ہے چنانچہ عصمت کے معنی خطا اور گناہ سے محفوظ ہونا ہے اب یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ معصوم کو خطا اور گناہ سے خدا نے محفوظ رکھا ہے یا اس ملکہ عصمت نے؟ حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں باتوں میں کوئی فرق نہیں ہے کیونکہ ملکہ نفسانی بھی خدا ہی کی طرف سے عنایت شدہ ہے۔

تعریف عصمت ابن ابی الحدید معتزلی کی نظر میں

ابن ابی الحدید معتزلیؒ نے نہج البلاغہ کی شرح میں عصمت کی تعریف مختلف زاویوں سے کی ہے:

۱۔ عصمت ایک ایسی صفت یا خاصیت ہے کہ جس انسان میں بھی پائی جائے، اسے گناہ سے محفوظ رکھتی ہے۔

۲۔ معصوم وہ ہے جو معصیت پر قدرت رکھتا ہے، لیکن اسکا مرتکب نہیں ہوتا۔

۳۔ معصوم اطاعت اور معصیت دونوں پر قدرت رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود نہ وہ ترک اطاعت کرتا ہے نہ فعل معصیت کا مرتکب ہوتا ہے، عصمت کی سند کیا ہے یعنی اس کے عوامل اور علل کی برگشت کہاں پر ہوتی ہے۔

یہ صفت کسی انسان میں کیسے اور کیونکر پیدا ہوتی ہے، اس بارے میں چار اقوال ہیں:

۱۔ قوی الارادہ ہونا: مضبوط قوت ارادہ انسان کو شہوت اور خواہشات نفسانی کی پیروی سے دور رکھتا ہے، قوی الارادہ انسان شہوت کے غلبہ میں نہیں آتا بلکہ اس پر غلبہ پاتا ہے اس قوت ارادہ کو علمائے نفس نے ''ملکہ'' کہا ہے اسی ملکہ کی بنا پر انسان افعال قبیح سے باز رہتا ہے اور اطاعت پر گامزن رہتا ہے۔

۲۔ حامل علم ہونا: چونکہ معصوم انسان اطاعت کے بے بہا اور بے شمار فوائد اور معصیت کے مضرات اور نقصانات سے آگاہ ہوتا ہے، اس لئے وہ ترک اطاعت اور فعل معصیت نہیں کرتا۔

۳۔ نفس کا محاسبہ کرنا: معصوم انسان اپنی خطاؤں اور غلطیوں پر، اپنے نفس کی سرگرمیوں کا ہمیشہ محاسبہ کرتا ہے اگر سہو ونسیان اس سے سرزد ہوجائے تو اپنے آپ کو سرزنش کرتا ہے۔

۴۔ خدا کے واضح بیان کا حامل ہونا: معصوم انسان خدا کی طرف سے واضح اور روشن بیان حامل ہوتا ہے اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کونسی چیزیں حرام ہیں کون کون سے اعمال فعل اطاعت ہیں۔

اگر انسان میں یہ چار صفات ہوں تو وہ معصوم از گناہ ہوجاتا ہے گویا یہ چار باتیں عصمت کے مقدمے ہیں یا یوں کہے کہ عصمت ان چار چیزوں پر قائم ہے۔

عصمت کی ایک تفسیر کی برگشت یہ ہے کہ معصوم انسان کسی فعل کے نفع اور نقصان کے بارے میں حق الیقین کے درجہ پر فائز ہوتا ہے ایک ایسے انسان سے معصیت کا ارتکاب ممکن ہی نہیں، وہ کبھی بھی ضرر رساں عمل بجالانے کا انتخاب کر ہی نہیں سکتا، کسی فعل کے ضرر کا حق الیقین ہونے کے بعد بھلا کوئی عاقل انسان کیسے اسکا مرتکب ہوسکتا ہے؟ اسکی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ مثلاً کوئی عاقل انسان زہر کو زہر جان کر غلطی یا اشتباہ سے بھی نہیں کھاتا، بلند عمارت کی چھت سے خود کو نیچے نہیں گراتا، کبھی بھول کر بھی گٹر کا پانی نہیں پیتا، وغیرہ وغیرہ، یہ مثالیں مفروضہ عصمت کو عقلی طور پر ممکن ثابت کرنے کیلئے پیش کی گئی ہیں۔

عصمت انبیاء کی ضرورت

انبیاء کرامؑ کو خداوند متعال نے اپنے بندوں کی ہدایت اور رہبری کیلئے بھیجا ہے جب کسی ہستی کو خدا وند عالم اپنی طرف سے بندوں کی ہدایت و رہبری کے لئے بھیجے تو یقیناً وہ چاہے گا کہ اس کے بندے اس کے نمائندے کی اطاعت کریں، تمام نشیب وفراز میں اس کی پیروی کریں اور اسکے قول و

فعل کو دل و جان سے قبول کریں یہ اسی صورت میں ممکن ہے، جب بندوں کو یہ یقین ہو جائے کہ یہ مدعی نبوت جو کچھ کہتا ہے خالص وحی ہے اس کے قول و فعل میں کسی قسم کی خطا، غلطی، نسیان، بھول یا ذاتی انا پرستی کا شائبہ بھی نہیں ہے بلکہ وہ ان خرافات سے لاتعلق اور دور ہے یہ یقین حاصل ہو جانے کے بعد ہی بندگان خدا اس کی اطاعت کو عین اطاعت خدا گردانتے ہیں اور پھر اس کے قول پر یقین کرتے ہیں کہ وہ خالصتاً وحی پر مبنی ہے لہٰذا نبی کے قول و فعل میں تضاد نہیں ہونا چاہئے، اس کے افعال اور کردار کو وحی کا آئینہ دار ہونا چاہئے یعنی اگر کبھی وہ کچھ نہ بولے اور کوئی عمل نہ کرے تب بھی یقین ہو کہ اس کا یہ فعل وحی کے مطابق ہے نبی کو ایسی ہی عصمت پر فائز ہونا چاہئے، اس سلسلے میں علمائے اعتقاد نے چند دلائل قائم کئے ہیں۔

عصمت انبیاءؑ کی دلیل

ا۔ دلیل اعتماد

اگر انبیاء معصوم نہ ہوں، عام انسانوں کی طرح طرح جھوٹ اور گناہوں کا ارتکاب کرتے ہوں، تو یہ احتمال باقی رہتا ہے کہ جو حکم انہوں نے دیا ہے، کہیں غلط نہ ہو یا بھول کر نہ کہہ دیا ہو۔ علاوہ ازیں یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وحی کو پہنچانے میں سستی سے کام لیا ہو، وقت گزر گیا ہو، مگر پہنچایا نہ ہو، ایسے تمام احتمالات نبی کی شان کے خلاف ہیں اور ایسی صورت میں عقلی طور پر اس پر سے اعتماد اٹھ جائے گا اگر نبی گناہ کرے تو اسکا مطلب یہ ہے کہ وہ فاسق ہو گیا جب نبی ہی فاسق ہو گا تو اس کی خبر پر اعتماد بھی نہیں رہے گا اس خبر کو لینے کیلئے تحقیق کی ضرورت ہو گی جبکہ نبی کے مشکوک ہو جانے کے بعد تحقیق کے ذرائع نہیں رہتے، لوگ کیسے معلوم کریں گے کہ اس نبی نے جو بات کہی ہے وہ سچ ہے یا جھوٹ، ایسے حالات میں انسان کیسے خدا سے رابطہ قائم کرے گا؟ چنانچہ ایسی صورت میں نبوت مشکوک ہو جائے گی اور جب نبوت میں شک ہو گا تو فلسفہ نبوت ہی لغو قرار پائے گا لہٰذا ضروری ہے کہ خداوند عالم جس ہستی کو نبی، حجت یا اپنا نمائندہ بنا کر بھیجے، وہ معصوم ہو۔

۲۔ دلیل اخلاق

انسانی معاشرہ میں لوگ ہمیشہ اعلیٰ اور ارفع اخلاق کے حامل افراد کے گرد جمع ہوتے ہیں، ان کے نقل وحرکت اور سیرت روش کو اپنانا اپنے لئے اعزاز اور افتخار گردانتے ہیں چنانچہ اگر نبی سے گناہ سرزد ہو، اگر نبی اپنے قول وفعل کا خود پابند نہ ہو تو اس کی شخصیت لوگوں کی نظروں میں گر جائے گی بلکہ اسکا شمار امت کے پست ترین لوگوں میں ہوگا کیونکہ نبی کا گناہ عام انسانوں کے گناہ کے مانند نہیں قرار دیا جاسکتا۔ خداوند عالم سورۂ احزاب کی آیت ۳۰ میں فرماتا ہے:

﴿ینساء النبی من یات منکن بفاحشۃ مبینۃ یضعف لھاالعذاب ضعفین﴾

"اے پیغمبر کی ازواج اگر تم برائی کروگی تو تمہیں اس کی دوگنی سزا دیں گے"

ایک عام شخص کو ایک گناہ پر ایک سزا دی جاتی ہے۔ اگر کسی کو اس سے زیادہ سزا دی جائے تو یہ خلاف عدالت ہوگا مثلاً زانی کیلئے سو (۱۰۰) کوڑوں کی سزا ہے اگر اسے ایک سو پانچ کوڑے مارے جائیں تو یہ زائد پانچ کوڑوں کا لگایا جانا اس پر ظلم ہوگا ایک آدمی کو تو ایک گناہ پر ایک سزا ملے لیکن ازواج نبی میں سے کوئی بی بی اگر ایک گناہ کی مرتکب ہوں تو سزا دوگنی ملے، ایسا کیوں ہے؟ اسکا جواب یہ ہے کہ ایک طرف تو وہ امت کی ایک فرد ہیں اور دوسری طرف پیغمبر کی ازواج ہیں، اسی لئے ان پر دوگنی سزا کا تاکیدی حکم ہے تاکہ پیغمبر کی ساحت اور شخصیت دور سے ہی لوگوں کو پاک ومنزہ نظر آئے یعنی یہ کہ لوگ پیغمبرؐ کے گرد ونواح کے افراد کو دیکھ کر ان پر اعتماد قائم کریں۔ اگر لوگ پیغمبر کے قرب اور جوار میں رہنے والوں ہی کو آپ کی لائی ہوئی شریعت کی خلاف ورزی کرتا دیکھیں گے تو یہ بات ان کے لئے پیغمبرؐ پر عدم اعتماد کا سبب بنے گی چنانچہ اسی لئے پیغمبر کی ازواج اگر گناہ کا ارتکاب کریں تو انکی سزا دوگنی ہوگی کیونکہ گناہ بھی دوگنا شمار ہوگا ایک تو حکم خدا کو ٹھکرایا اور دوسرے رسول کو داغدار بنایا۔

جب نبی کے قریبی افراد گناہ کی صورت میں دوسروں کی نسبت زیادہ گناہگار ٹھہرائے جائیں گے تو

خیال فرمایئے کہ اگر خود نبی گناہ کا ارتکاب کرے تو اس کا گناہ کتنا زیادہ شمار ہوگا لہذا ایک گناہگار فرد، خدا کا منتخب نمائندہ ہو، یہ بات خلاف عقل ہے:

﴿انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهر كم تطهيرا﴾ "بس اللہ کا یہ ارادہ ہے کہ اے اہل بیت تم سے ہر برائی کو دور رکھے اور اس طرح پاک و پاکیزہ رکھے جس طرح پاک و پاکیزہ رکھنے کا حق ہے" (احزاب/۳۳) اس آیت میں خدا نے اعلان فرمادیا کہ نبی ہر قسم کی رجس سے پاک و مطہر ہے۔

۳۔دلیل اطاعت :

اگر نبی مقام عصمت پر فائز نہ ہو اور اس سے غلطی و نسیان سرزد ہونے لگے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شیطان کی زد میں آگیا ہے اور جو شخص بھی شیطان کی زد میں آجائے اسکی اطاعت، شیطان کی اطاعت ہوگی اور جو شیطان کے فریب میں آجائے، وہ نبی نہیں ہوسکتا چنانچہ سورۂ مبارکہ ص آیت ۸۳،۸۲ میں ہے:

﴿قال فبعزتك لا غوينهم اجمعين الا عبادك المخلصين﴾ "اس نے کہا کہ پھر تیری عزت کی قسم میں سب کو گمراہ کردوں گا علاوہ تیرے ان بندوں کے جنہیں تو نے خالص بنالیا ہے"

۴۔ نبی کے قول و فعل میں تضاد ہونا خدا کے نزدیک ایک مذموم فعل ہے کیونکہ قرآن کریم کی متعدد آیات میں ایسے لوگوں کی مذمت کی گئی ہے۔ملاحظہ فرمایئے:

﴿كبر مقتاً عندالله ان تقولوا مالاتفعلون﴾ "اللہ کے نزدیک یہ سخت ناراضگی کا سبب ہے کہ تم وہ کہو جس پر عمل نہیں کرتے ہو" (صف/۳) ﴿اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسكم﴾ "کیا تم لوگوں کو نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور خود اپنے کو بھول جاتے ہو" (بقرہ/۴۴) ﴿وقال الاعراب امناقل لم تؤمنوا ولكن قولوا اسلمنا لما يدخل الايمان فى

قلوبکم﴾ ''یہ عرب کے بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں تو آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ اسلام لائے کہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا ہے'' (حجرات/۱۴)

۵۔ خداوند عالم نے قرآن کریم میں اپنے انبیاء کی غیر مشروط اطاعت کا حکم دیا ہے اور اس کو واجب قرار دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔

﴿واطیعوا اللہ والرسول لعلکم ترحمون﴾ ''اور اللہ ورسول کی اطاعت کرو کہ شاید رحم کے قابل ہو جاؤ'' (آل عمران/۱۳۲) ''کہہ دیجئے کہ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ جو اس سے روگردانی کرے گا تو خدا کافرین کو ہرگز دوست نہیں رکھتا'' (آل عمران/۳۲)

﴿قل اطیعوا اللہ والرسول فان تولوا فان اللہ لایحب الکفرین﴾ ''مسلمانوتم لوگوں کیلئے رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ عمل ہے'' (احزاب/۲۱)

۶۔ اگر نبی کی اطاعت اس بات کے ساتھ مشروط سمجھی جائے کہ نبی کے صحیح اوامر اور نواہی کی اطاعت کی جائی اور جس وقت وہ غلط اوامر اور نواہی کا حکم دے تو اس کی مخالفت کی جائے جیسا کہ علماء کے بارے میں حکم ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ''براہمہ'' جو کہ عدم بعثت نبی کے قائل ہیں، انکی دلیل عدم ضرورت بعثت انبیاء کی تائید ہوگی۔ کیونکہ اگر امت نہیں جانتی (صحیح اور غلط اوامر) تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ امت کو جہالت میں ایک ایسے انسان کے سپرد کر دیا جائے جو خود غلطی سے محفوظ نہیں اور اگر امت جانتی ہے تو اس صورت میں امت نبی کے محتاج نہیں ہے۔ نبوت کی ضرورت تو امت کی جہل ونادانی کی وجہ سے ہوتی ہے اگر امت حلال وحرام، اطاعت اور معصیت کو خود جانتی ہوتی تو اس صورت میں نبی کی ضرورت ہی ختم ہو جاتی۔

۷۔ اگر نبی گناہ کرتا ہے تو کیا امت پر واجب ہے کہ اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرے، یا نہیں؟ اگر نہیں کرتے تو یہ نبی اس سلسلہ کو جاری رکھے گا کیونکہ کوئی اس کو روکنے ٹوکنے والا نہیں اور روکتے ہیں تو اس میں درج ذیل قباحتیں ہیں:

۷۔۱ امت کے روک ٹوک کرنے سے اسے اذیت ہوگی اور جس شخص کی طرف سے اسے اذیت پہونچے گی وہ مستحق عذاب خدا ہوگا۔ کیونکہ جو خدا اور رسول خدا کو اذیت پہنچاتا ہے اس پر خدا کی لعنت ہے اور اسکے لئے دردناک عذاب ہے:

﴿ان الذین یوذون اللہ ورسول لعنھم اللہ فی الدنیا وآخرۃ واعدلھم عذابا مھینا﴾

''جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو اذیت دیتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں اللہ نے لعنت کی ہے اور اس نے ان کے لئے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے'' (احزاب/۵۷)

لہذا جو شخص نبی کو روک ٹوک کرتا ہے اس پر لعنت ہوگی۔ دوسری طرف اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا نہیں کرتا تو ترک واجب کا مرتکب ہوتا ہے۔

۷۔۲ نبی جب گناہ کرے گا تو اس کی حیثیت گر جائے گی۔ لوگ اسے نفرت کی نظر سے دیکھیں گے اور جب لوگ اس سے نفرت کرنے لگیں تو فلسفہ بعثت انبیاء خود بخود ختم ہو جائے گا۔

۷۔۳ اگر نبی گناہ کا ارتکاب کرے گا تو وہ ظالم ہوگا جبکہ خداوند عالم سورۂ بقرہ آیت ۱۲۴ میں فرماتا ہے:

﴿لاینال عھدی الظالمین﴾ ''خدا یہ عہدہ ظالمین کو نہیں دیتا ہے''

۸۔ اگر لوگ نبی کو گناہ اور آلودگیوں سے مس ہوتے ہوئے دیکھیں گے تو اس صورت میں نبی کی کشش ختم ہو جائے گی۔ اس لئے بھی نبی کو ہر قسم کے گناہ وخطا سے پاک ومبراء اور معصوم ہونا چاہئے۔

۹۔ ہم لوگ نبی کے محتاج ہیں کیوں کہ ہم راہ خیر وشر کو یا تو جانتے ہی نہیں اور اس معاملہ میں جاہل ہیں، یا جانتے تو ہیں مگر غفلت، سستی، بھول اور نسیان کے سبب اسے انجام نہیں دیتے، اس دوسری صورت میں ایک یاد ہانی کرنے والا یعنی مذکر چاہئے، لیکن جب نبی بذات خود گناہ کا مرتکب ہوگا تو وہ خود ایک ہادی اور رہبر کا محتاج ہوگا ایسی صورت میں اس کی حیثیت عام انسانوں کے برابری ہو جائے گی سورۂ یونس آیت ۳۵ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿قل ھل من شرکائکم من یھدی الی الحق قل اللہ یھدی للحق، افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع امن لا یھدی الا ان یھدی فمالکم کیف تحکمون﴾ ''ان سے پوچھ تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہو؟ کہو وہ صرف اللہ ہے جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، پھر بھلا بتاؤ جو حق کی طرف رہنمائی کرتا ہے، وہ اسکا زیادہ مستحق ہے کہ اسکی پیروی کی جائے یا وہ جو خود راہ نہیں پاتا، الا یہ کہ اسکی راہنمائی کی جائے آخر تمہیں ہو کیا گیا ہے، کیسے الٹے الٹے فیصلے کرتے ہو''

انسانی حرکات اور سکنات کی اقسام:

۱۔ ایک ایسا عمل جو وہ خود انجام دیتا ہے اور تمام انسان اسے انجام دیتے ہیں، یہ ایک عادی عمل ہے۔ اس میں نہ جائے سوال و پرستش ہے نہ تنقید۔

۲۔ دوسرا عمل غیر عادی ہے یعنی غیب سے خبر دینا یہ دو حالتوں سے خالی نہیں ہے:

۱۔۲ شیطان خبر دیتا ہے یہ شیطان کا القا ہے جیسے کاہن وغیرہ، جیسا کہ سورۂ انعام آیت ۱۲۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ان الشیطین لیوحون الی اولیھم لیجادلوکم﴾ ''اور شیاطین تو اپنے والوں کی طرف خفیہ اشارے کرتے ہیں تا کہ یہ لوگ تم سے جھگڑا کریں''

۲۔۲ خدا خبر دیتا ہے۔ یہ خبر نبی کے ذریعہ بندوں تک پہنچتی ہے اسے وحی کہتے ہیں۔
قرآن کریم کی متعدد آیات میں آیا ہے کہ شیاطین ایک دوسرے کو وحی کرتے ہیں ملاحظہ فرمائیے:

﴿وان الشیطن لیوحون الیٰ اولیٰھم لیجادلوکم﴾ ''شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شکوک واعتراضات القا کرتے ہیں'' (انعام/۱۲۱)

شیطانی اعمال کیا ہیں۔ خداوند کریم میں نے متعدد آیات قرآن کریم اس کا بالکل واضح اعلان فرمایا ہے:

۱۔ شیطان ہمیشہ برائی کا حکم دیتا ہے:

﴿الشیطن یعد کم الفقر و یامر کم بالفحشاء﴾ ''شیطان تمہیں تنگدستی کا خوف دلاتا ہے اور بے حیائی کی ترغیب دیتا ہے'' (بقرہ/۲۶۸)

۲۔ شیطان خدا کے اولیاء کو ڈراتا ہے:

﴿الذی یتخبطه الشیطن من المس﴾ ''جس کو شیطان نے چھو کر حواس باختہ کیا ہو'' (بقرہ/۲۷۵) ﴿انما ذالکم الشیطن یخوف اولیاء ہ فلاتخافوان ان کنتم مومنین﴾ ''یہ (خبر دینے والا) شیطان جو اپنے دوستوں کو ڈراتا ہے لہٰذا اگر تم مومن ہو تو ان لوگوں سے نہیں مجھ سے ڈرو'' (آل عمران/۱۷۵)

۳۔ جس کے ساتھی برے ہوں، سمجھو وہ شیطان کا ساتھی ہے:

﴿ومن یکن الشیطن له قرینا فساء قرینا﴾ ''بات یہ ہے کہ شیطان جس کا رفیق ہو جائے تو وہ بہت ہی برا رفیق ہے'' (نساء/۳۸)

۴۔ شیطان انسان کو مغرور کرتا (دھوکا دیتا) ہے:

﴿وما یعدھم الشیطن الا غرورا﴾ ''اور ان کے ساتھ شیطان کے وعدے بس فریب پر مبنی ہوتے ہیں'' (نساء/۱۲۰)

۵۔شراب، جوا، بت پرستی سب اعمال شیطانی ہیں:

﴿یاایھا الذین امنوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام من عمل الشیطن﴾ ''اے ایمان والو! شراب اور جوا اور مقدس تھان اور پانسے سب ناپاک شیطانی عمل ہیں'' (مائدہ/۹۰)

۶۔جس پر شیطان کا غلبہ ہو جائے اسے اپنے اعمال اچھے نظر آتے ہیں:

﴿واذ زین لھم الشیطن اعمالکم وقال لا غالب لکم الیوم من الناس وانی جار لکم﴾ ''اور جب شیطان نے ان کے اعمال آراستہ کر کے انھیں دکھائے اور کہا: آج لوگوں میں سے کوئی تم پر فتح حاصل کر ہی نہیں سکتا'' (انفال/۴۸)

۷۔شیطان انسان کا دشمن ہے:

﴿ان الشیطن للانسان عدو مبین﴾ ''کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے'' (یوسف/۵)

۸۔شیطان، انسان کو خدا سے دور کر کے انسانوں پر بھروسہ کرواتا ہے:

﴿فانسہ الشیطن ذکر ربہ فلبث السجن بضع سنین﴾ ''مگر شیطان نے اسے بھلا دیا کہ وہ اپنے مالک سے یوسف کا ذکر کرے یوں یوسف کئی سال زندان میں پڑے رہے'' (یوسف/۴۲)

خلاصہ یہ کہ اگر نبی سے گناہ سرزد ہو تو اسکا مطلب یہ ہوگا کہ وہ شیطان کے فریب میں آگیا ہے اور جو شیطان کے فریب میں آجائے وہ نبی نہیں ہو سکتا۔

عصمت انبیاء کے بارے میں فرق اسلامی کے نظریات:

۱۔ انبیاء ابتدائی عمر سے لے کر آخری لحہ حیات تک، فکری اعتبار سے، عملی اعتبار سے، صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کے سہواً یا عمداً ارتکاب سے، غرض ہر لحاظ سے معصوم ہیں۔

۲۔ ایک عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء بعثت کے بعد سے آخری عمر تک تو تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کے

سہواً یا عمداً ارتکاب سے محفوظ ہیں، لیکن بعثت سے پہلے ارتکاب گناہ خارج از امکان نہیں۔ یہ عقیدہ ''حشیوہ'' کہلاتا ہے اور ایک تحقیر آمیز عقیدہ ہے بعض علمائے اسلام اس عقیدہ کے بارے میں سہل انگاری سے کام لیتے ہیں اور بے بنیاد اور غیر مستند باتوں کو عقیدہ کی سند بناتے ہیں۔ یہ عقیدہ اسکی ایک مثال ہے۔

۳۔ خوارج عقیدہ رکھتے تھے ہیں کہ انبیاء سے گناہ کا سرزد ہونا ممکن ہے حالانکہ خود ان کے نزدیک ہر گناہ موجب کفر ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کا نبی کافر ہو سکتا ہے۔

۴۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ انبیاء سے گناہ کبیرہ سرزد نہیں ہو سکتا تاہم گناہ صغیرہ کا ارتکاب ممکن ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۵۔ گروہ اہل حدیث کا بانی عبدالوہاب کہتا ہے کہ انبیاء کا قبل بعثت معصوم ہونا ضروری نہیں، البتہ بعد بعثت معصوم ہونا ضروری ہے۔

۶۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ انبیاء سے قصداً یا عمداً گناہ سرزد نہیں ہو سکتا تاہم سہواً یا نسیان کے سبب گناہ ہو سکتا ہے۔

۷۔ ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ یوں تو انبیاء گناہ کے مرتکب نہیں ہوتے لیکن پوشیدہ طور پر اور لوگوں سے چھپا کر گناہ کرنے میں کوئی حرج نہیں۔

۸۔ ایک اور گروہ ہے جس کا عقیدہ ہے کہ انبیاء کے لئے عصمت ضروری نہیں، وہ ہر حال میں گناہ کر سکتے ہیں۔

۹۔ انبیاء کو تمام گناہوں سے چاہے وہ کبیرہ ہوں، یا صغیرہ، جو انکی حیثیت کو معاشرہ میں مخدوش کرتے ہوں، بعثت سے پہلے بھی اور بعثت کے بعد بھی، پیدائش سے لیکر وفات تک ہمیشہ ان سے پاک اور معصوم ہونا چاہئے، یہی عقیدہ شیعہ امامیہ ہے۔

عصمتِ انبیاء

موضوع عصمت انبیاء صدر اسلام کے دور کے مسلمانوں کا موضوع بحث اور گفتگو نہیں تھا۔ یہ موضوع بعد کے دور کے رونما ہونے والے حالات اور اسلامی ریاست پر قابض حکام کے ذاتی مفادات کی خاطر اور دین کے بنیادی عقائد کو مشکوک بنانے کی مذموم کاوش کے نتیجہ میں مورد بحث و مجادلہ قرار پائی ہے۔ کسی ایک فرد، گروہ یا مملکت کے کسی دوسرے فرد، گروہ یا ملک پر اعتماد بھروسہ کرنے کیلئے جو ضمانتیں متصور ہیں درج ذیل میں بیان کریں گے:

۱۔ رہبر پر اعتماد کی ضمانت:

پورا انسانی معاشرہ خواہ وہ کسی رنگ اور نسل سے تعلق رکھتا ہو، دنیا کے کسی خطے میں بستا ہو، ملحد ہو یا دین اور مذہب کا پیرو ہو، علاقائی سطح پر انسانوں کا چھوٹا سا گروہ ہو یا ملکی اور بین الاقوامی سطح کی کوئی تنظیم، معاشرے کی بھلائی کیلئے کام کرنے والے لوگ ہوں یا دہشت اور وحشت پھیلانے اور لوٹ مار مچانے والے، اپنے آپ کو منظم رکھنے کیلئے سب کو ایک نظام اور ایک منتظم اور رہبر کی ضرورت ہوتی ہے، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں۔ کسی رہبر اور نظام کو لوگ اس وقت تک اپنے مقدرات سپرد نہیں کرتے جب تک ذہنی طور پر اس پر اعتماد کی ضمانت نہ فراہم کی جائے، انسان کی نجی زندگی میں بھی ایسے مواقع کم ہوتے ہیں کہ بغیر ضمانت کے کوئی چیز کسی کے سپرد کر دی جائے سوائے ان چند نادر موقعوں کے کہ جہاں ایک شخص دوسرے پر اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر حد سے زیادہ اعتماد کرتا ہو۔

۲۔ حلفیہ ضمانت: سیکولر معاشرہ میں زندگی کے تمام مسائل چاہے وہ اجتماعی ہوں یا سیاسی اور اقتصادی، سب میں دین مذہب کو بے دخل رکھا جاتا ہے انفرادی زندگی میں یہ لوگ چاہے دین اور مذہب کے انتہا پسندی کی حد تک ہی پابند کیوں نہ ہوتے ہوں، لیکن امور دنیوی کو دین سے بالکل لا

تعلق رکھتے ہیں ایسا معاشرہ ملحد اور بے دین ہو یا دین مذہب کا پیرو، دین کو معاشرہ میں بے دخل اور بے کردار رکھتا ہے۔ ہر معاشرہ میں لوگ اپنے مقدرات کو کسی فرد یا کونسل کے سپرد کرنے سے پہلے اپنے اعتماد کا تحفظ چاہتے ہیں۔ ان تحفظات کو عام رائج اردو زبان میں ضمانت کہتے ہیں، اس ضمانت کو حاصل کرنے کے لئے ایک طریقہ یہ رائج ہے کہ ایک حلفیہ بیان ترتیب دیا جاتا ہے جسے مذکورہ شخص اجتماع میں کھڑے ہو کر سب کے سامنے دہراتا ہے، بعد میں اس بیان پر اس سے امضاء لیا جاتا ہے اس طرح سے وہ یہ عہد کرتا ہے کہ وہ اس تنظیم کے آئین اور دستور کی پابندی اور پاسداری کرے گا، اپنے منصب سے متعلق ذمہ داریوں کو پورا کرے گا، اس سلسلہ میں کسی قسم کی سستی، کاہلی اور خیانت نہیں کرے گا اور اسرار کو غیروں پر فاش نہیں کرے گا بس اس مسودہ کو پڑھ کر سنانے اور اس پر دستخط لینے ہی کو ضمانت سمجھا جاتا ہے، اس کے بعد چاہے وہ اس آئین کی موجودگی میں کتنا ہی خرد برد کرے، آئین سے کتنی ہی بے وفائی برتے، اسے کوئی فرق نہیں پڑتا تمام ترکج روی کے باوجود وہ کسی صورت میں بھی کرسی کو نہیں چھوڑتا، اگر غلطی ثابت ہونے کے بعد اسے ہٹا دیا جائے تو وہ دوبارہ بھی برسر اقتدار آسکتا ہے اور پھر نئے سرے سے حلف برداری کے ذریعہ ضمانت دے سکتا ہے، یہ طریقہ کار ہر چھوٹی بڑی سطح پر ایک سنت بنی ہوئی ہے۔ اس قسم کی ضمات کے نمونے تاریخ اسلام کے صفحات پر بھی ملتے ہیں جن میں سے دو واقعات بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

پہلا واقعہ اس وقت نمودار ہوا جب حضرت عمر بن خطاب کی نامزد کردہ چھ رکنی کمیٹی نے امیدواروں سے ان شرائط پر پابند رہنے کا عہد لیا، حضرت عثمان نے چھ رکنی کمیٹی کے سامنے بیان دیا کہ اگر انہیں خلیفہ منتخب کر لیا گیا تو وہ کتاب خدا، سنت رسول اور سیرت شیخین پر عمل کے پابند رہیں گے لیکن برسر اقتدار آنے کے فوراً بعد انہوں نے بیت المال، مسلمین کی جان و مال اور عزت و ناموس کو مروان بن حکم کے سپرد کر دیا، مروان بن حکم وہ شخص ہے جسے رسول اکرمؐ نے اسکی سابقہ اسلام دشمنی اور پیغمبرؐ کے حق میں جسارت آمیز حرکتوں کی وجہ سے مدینہ بدر کر دیا تھا، خلیفۂ اوّل اور دوم نے

حضرت عثمان سمیت اکابر بنوامیہ کی سفارش کے باوجود حکم رسول اللہؐ کے احترام کو باقی رکھا اور اسے واپس مدینہ آنے کی اجازت نہیں دی، مگر حضرت عثمان نے برسر اقتدار آنے کے بعد نہ صرف یہ کہ اس کو واپس مدینہ بلا لیا بلکہ مسلمانوں کے تمام مقدرات اس کے سپرد کر دیئے، اس طرح انہوں نے کتاب خدا، سنت رسول اور سیرت شیخین سب ہی کو پس پشت ڈالا اور مروان کو مقدم رکھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عامۃ المسلمین میں رفتہ رفتہ اشتعال پھیل گیا بہت کوشش کی گئی کہ خلیفہ وقت اسے معذول کریں لیکن حضرت عثمان نے اس سلسلے میں کسی کی بات پر دھیان نہ دیا آخر کار اس کو بچانے کی کوشش میں خود کو ہی قربان کر دیا۔

اسکے باوجود آج کل کے مقابلہ میں وہ دور پھر بھی بہتر تھا کیونکہ اس دور میں خلفاء اور ان کے اردگرد جمع ہونے والے حاشیہ برداروں پر مسلمان کڑی نظر رکھتے تھے، اس وقت کی امت، حاکم و حکمران طبقہ پر شاہد تھی، جبکہ آجکل یہ صفات مسلمانوں میں مردہ ہو چکی ہیں جس کے نتیجے میں ہم دیکھتے ہیں دینی و مذہبی قائدین ہوں یا سیاسی رہنما، ان کے اطراف جمع ہونے والے افراد دونوں ہاتھوں سے قوم کو لوٹ رہے ہیں لہٰذا وہ یہ نعرہ بلند کرتے ہیں، ''انصاف یہ ہے ان کو موقع دی جائے ،مدت پوری کرنے دیا جائے لوٹنے والوں کو دوبارہ موقع دیا جائے'' لیکن اس کے باوجود انکے خلاف کوئی آواز نہیں اٹھائی جاتی بلکہ بعض بقول امام خمینیؒ مختلف بہانے بنا کر مفت میں ان کا دفاع کرتے ہیں۔

اس سلسلہ کی دوسری مثال معاویہ ابن ابی سفیان کی ہے معاویہ نے سنہ ۴۱ ہجری میں پیغمبر اکرمؐ کے سبط اکبر حضرت امام حسن مجتبیٰ علیہ السلام کے ساتھ ہونے والی نبرد آزمائی میں مختلف حیلوں اور بہانوں سے امام حسن علیہ السلام کو صلح کی دعوت دی اور صلح کی تمام شرائط پر اپنی آمادگی کا وعدہ کیا اس نے امام حسنؑ کی خدمت میں حلفیہ بیان پیش کیا کہ امام حسنؑ خلافت اسکے سپرد کرنے کے عوض جو شرائط بھی لکھیں گے وہ سب اسے قبول ہوں گی۔ امام حسنؑ نے اس صلح نامہ پر شرائط درج کر کے

امضاء کیا، لیکن جب معاویہ کلی طور پر مسند خلافت پر قابض ہوگیا تو اس نے اعلان کیا "یہ صلح نامہ میرے پاؤں کے نیچے ہے میں اسکا پابند نہیں ہوں"

آج بھی بیشتر دینی اور سیاسی حلقوں میں یہی صورتحال نظر آتی ہے اگرچہ پہلی بار برسر اقتدار آنا ذرا مشکل ہوتا ہے، لیکن ایک مرتبہ آجانے کے بعد اپنا قبضہ برقرار رکھنے کیلئے کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی، برسراقتدار آنے کیلئے عوام سے جو وعدے وعید کئے جاتے ہیں، کرسی پر بیٹھنے کے بعد، کوئی وعدہ یاد نہیں رہتا بلکہ کئے گئے وعدوں کی دھجیاں اڑادی جاتی ہیں۔

۳۔ **ملکہ عدالت:** اہل دین و مذہب کے نزدیک رہبران قوم میں ملکہ عدالت کا ہونا، عوام کیلئے ان پر اعتماد کی ضمانت فراہم کرتا ہے۔ دنیا میں جہاں جہاں اہل دین و مذہب کا معاشرہ ہے وہاں کے لوگ دین کے علاوہ بہت سے دنیاوی امور زندگی میں بھی اپنی ممکنہ حدود میں رہتے ہوئے نظام شریعت کی پابندی کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور چونکہ ہر زمان و مکان کے رہنے والوں کیلئے ہمیشہ ہر علاقے کے لوگوں کے لئے ہمیشہ رہبر معصوم تک رسائی ممکن نہیں ہوتی، چنانچہ اس مقصد کے لئے وہ خود اپنے درمیان سے ایک عادل عالم فرد کو منتخب کرتے ہیں اور اس کے ملکہ عدالت کی بنیاد پر ہی اس پر اعتماد کرتے ہیں دوسرے لفظوں میں اپنے دین و دنیا کے مسائل اور مقدرات کسی کے سپرد کرنے سے پہلے اس میں ملکہ عدالت ہونے یا نہ ہونے کی تحقیق کرتے ہیں، اس ضمن میں شواہد و گواہ جمع کرتے ہیں اور جب یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ وہ عالم و عادل ہے، اس میں دینی و مذہبی ذمہ داریوں کی انجام دہی میں کوئی کوتاہی و سستی دیکھنے میں نہیں آئی ہے اور اسے کسی گناہ کا ارتکاب کرتے نہیں دیکھا گیا ہے، تب اس پر اعتماد کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

چنانچہ امام جمعہ، امام جماعت اور انتخاب مرجع تقلید میں ہمیشہ سے یہی وطیرہ رہا ہے کہ اعلمیت اور عدالت کی تحقیق کے بعد ہی ان پر بھروسہ کیا جاتا ہے لیکن اس نظام میں بھی عملاً دو نقص پایا جاتا ہے:

۱۔ ایک مرجع وقت کے لئے کس حد اور کس قسم کی عدالت کی ضرورت ہے، کیونکہ عدالت کے

چند مراتب ہوتے ہیں:

(۱) عدالت اسلامی، ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہئے پابند انجام واجبات اور ترک محرمات۔

(۲) عدالت امام جمعہ و جماعت۔

(۳) عدالت گواہ اور شاہد مقدمات۔

(۴) عدالت قاضی: ایک مقامی عدالت کے قاضی کی عدالت میں اور ملک کے اعلیٰ درجۂ عدالت کے قاضی کی عدالت میں میں فرق ہونا ضروری ہے کیونکہ مقامی قاضی کی ذمہ داری صرف قضاوت تک محدود ہے جبکہ اعلیٰ عدالت کے کی قاضی عدالت کے علاوہ تمام قاضیوں کی نصب اور عزل ان کے اختیار میں ہے اگر خدانخواستہ اس کی عدالت میں خلل آجائیں تو پورے ملک کی عدالتوں کی جڑیں ہل جائیں گی بلکہ ملک کا ہی اللہ حافظ۔

(۵) عدالت مرجع اور رہبر۔

منصب مرجعیت پر بٹھاتے وقت تو عدالت ہونے یا نہ ہونے کے بارے میں تحقیق کی جاتی ہے لیکن بعد میں نظارت کا کوئی بندوبست نہیں ہوتا۔ گویا نبی یا امام کی مانند انہیں بھی معصوم گردانتے ہوئے، انکے لئے عدالت سے انحراف کو غیر عقلی قرار دے دیا جاتا ہے، جبکہ خود مراجع اس بات کے معتقد نہیں چنانچہ آیت اللہ العظمٰی سید محسن الحکیم نے عدالت مرجعیت کے بارے میں فرمایا کہ مرجعیت پر فائز ہونے سے پہلے تو عدالت ہوتی ہے لیکن بعد میں اس پر قائم رہنا ایک مشکل مرحلہ ہوتا ہے۔

اگر مرجع خود عدالت پر قائم رہنے کی کوشش بھی کرے تو وہ افراد جو اس کے اردگرد ہوتے ہیں، اسے ثابت قدم نہیں رہنے دیتے بلکہ دنیا بھر کے مفاد پرستوں کے نمائندہ ان کے مجلس شوریٰ میں پہنچ جاتے ہیں اسلام کی سربلندی یا اصلاحی اقدامات کو مصلحت نہ ہونے کا بہانہ بنا کر باز رکھتے ہیں جسکے نتیجے میں ملت ہر آئے دن رجوع قہقری کر رہی ہے لہٰذا عقل و شرع اور تجربہ کے تحت ہماری ذمہ

داری قرار پاتی ہے کہ جس طرح انتخاب کے وقت ان کو پرکھا تھا، بعد میں بھی نظارت کو جاری رکھا جائے، وہ بھی ہم جیسے انسان ہی ہیں، نبی یا امام کی طرح معصوم تو بہر حال نہیں ہیں، یہاں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پیغمبرؐ، امامؑ اور مجتہدین سے قرب رکھنے والی ہستیوں کا کردار ایسا ہونا چاہئے کہ وہ امت اور ان قائدین کے درمیان حائل نہ ہوں بلکہ ان کے مابین قرب کا باعث بنیں، خداوند عالم نے سورۂ احزاب میں ازواجِ رسول کو مخاطب کرتے ہوئے اسی بات کی جانب اشارہ فرمایا ہے کہ انہیں چاہئے کہ پیغمبر کی ساحت کا خیال رکھیں۔ حضرت امام جعفر صادقؑ نے اپنے قریب ترین افراد سے فرمایا:

''تم ہمارے اور دوسروں کے درمیان باعث قرب بنو، نہ یہ کہ تمھاری وجہ سے لوگ ہم سے دور ہو جائیں''

جب نبی اور امام کے گرد رہنے والے افراد کے لئے ایسے احکامات موجود ہیں تو غور طلب بات یہ ہے کہ مراجعین کے اردگرد رہنے والوں کی کیا ذمہ داری ہونی چاہئے، پس معلوم ہوا کہ یہ اتنا اہم فریضہ ہے کہ اگر اسکو ادا کرنے میں کوتاہی برتی جائے تو امت ناقابل تلافی نقصان سے دوچار ہو سکتی ہے۔

حدود عصمت

عصمت کا لفظ سنتے ہی پہلے مرحلہ پر جو معنی ذہن میں آتا ہے وہ گناہ و معصیت سے محفوظ ہونا ہے، عصمت کا یہ تصور اس کے مختلف مصادیق میں سے ایک مصداق ہے، انبیاء کی جس عصمت کے ہم معتقد ہیں، اس کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے انبیاءؑ و ائمہؑ کی عصمت کی چار حدود ہیں:

۱۔ انبیاء کا فکری ماخذ خطا، غلطی، اشتباہ اور نسیان سے محفوظ ہے۔ عصمت میں یہ دائرہ سب سے وسیع تر اور سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے دنیا کے تمام نامور فلاسفہ، نوابغ روزگار اور علماء کا مصدر علم اور فکر خود ان جیسا ایک جائزہ الخطا ہے جبکہ انبیاء کا ماخذ علم، کثیر آیات قرآنی کے تحت یا تو مستقیم

طور پر خداوند کریم کی ذات ہے جیسا کہ سورۂ نمل کی آیت ۶ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿وانك لتلقى القرآن من لدن حكيم عليم﴾ ''اور تم کو یہ قرآن (خود) خدائے حکیم ودانا کی طرف سے عطا کیا جاتا ہے'' یا پھر وہ جبرئیل امین کے توسط سے خبر لیتے ہیں جنہیں خود خداوند عالم نے سورۂ شعراء آیت ۱۹۳ میں ''امین'' کہا ہے: ﴿نزل به الروح الامين﴾ ''جسے روح الامین نے اتارا''

خداوند عالم سورۂ نجم آیت ۳، ۴ میں فرماتا ہے:

﴿وما ينطق عن الهوى۔ ان هو الا وحي يوحى﴾ ''وہ ہرگز ہوائے نفس سے بات نہیں کرتا۔ جو کچھ وہ کہتا ہے وحی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے''

۲۔ انبیاء حفظ وحی میں معصوم ہیں یعنی خدا سے وحی لینے کے بعد ان پر بھول و نسیان طاری نہیں ہوتا جیسا کہ سورۂ اعلیٰ آیت ۴ میں خدا نے فرمایا ہے کہ ہم آپ کو اس طرح سے پڑھائیں گے کہ پھر آپ بھولیں گے نہیں: ﴿سنقرئك فلا تنسى﴾ ''ہم خود آپ کو پڑھائیں گے پس آپ اسکو نہ بھولیں گے''

۳۔ انبیاء تبلیغ کے عمل میں بھی معصوم ہیں یعنی جب بات پہنچاتے ہیں تو گفتگو میں اشتباہ اور اجمال گوئی نہیں کرتے جیسا کہ سورۂ نجم کی آیت ۳، ۴ جو اوپر بیان کی گئی ہیں ارشاد ہوا ''جو کچھ بھی وہ کہتا ہے وحی کے سوا کچھ بھی نہیں'' اور سورۂ رحمٰن آیت ۲ میں بیان ہوا: ﴿علم القران خلق الانسان علمه البيان﴾ ''اور اسی نے قرآن کی تعلیم دی۔ اسی نے انسان کو خلق کیا اور اسی نے بیان بھی سکھایا''

۴۔ اسی طرح مقام عمل میں بھی انبیاء معصوم ہیں کیونکہ گناہ سرزد ہونے کے وہ اسباب جو عام انسانوں میں معمول کے طور پر ہوتے ہیں انبیاء وائمہ ان سے محفوظ ہیں۔

حقیقت عصمت

جو انسان خداوند متعال کی طرف سے خلق کی ہدایت اور رہبری کیلئے منتخب ہو، اسے معصوم ہی ہونا چاہئے۔ بصورت دیگر اس پر جو اعتراضات وارد ہوتے ہیں وہ ہمیں قبول کرنا پڑیں گے۔

عصمت کے حامل سے ترک اطاعت یا فعل معصیت کا ارتکاب ناممکن قرار دیا جاتا ہے، حقیقت عصمت کیا ہے؟ کیا یہ کوئی ایسی نا قابل تعریف حقیقت ہے جس کا سمجھنا یا سمجھانا ممکن نہیں ہے؟ یا یہ کہ یہ ایک مفروضہ ہے جو فریق مخالف کو خاموش کرنے اور اہل گرائش یعنی ایمان رکھنے والوں کی تسکین کی خاطر گھڑا گیا ہے؟ یا پھر یہ مخالفین اسلام کو مخالفت سے باز رکھنے کی خاطر اوپر سے پہنی ہوئی کوئی خلعت ہے؟ علمائے اعتقاد نے عصمت کی حقیقت کی دو تفسیر کی ہیں:

ا۔ یہ ایک لطف ہے جس سے خداوند عالم نے اپنے منتخب نمائندوں کو نوازا ہے اس لطف کے وارد ہونے کے بعد ان میں نہ ترک اطاعت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور نہ فعل معصیت کا تصور ذہن میں آتا ہے۔

عصمت کی یہ تعریف در حقیقت بڑی مبہم تعریف ہے یہ ایک معما اور غیر واضح شئے کی غیر واضح الفاظ میں تفسیر کرنے کی مانند ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی انگریزی زبان سے ناآشنا شخص جب کسی انگریزی کلمہ کا مفہوم پوچھے تو اس کا ترجمہ ترک یا جرمن زبان میں کیا جائے جبکہ وہ شخص انگریزی کی طرح ان زبانوں سے بھی نابلد ہے اس تعریف کے تحت عصمت ایک ایسی طاقت ہے جس کے ہوتے ہوئے ترک اطاعت یا ارتکاب معصیت ناممکن ہے اس تعریف میں عصمت کی تفسیر ''لطف'' سے کی گئی ہے جبکہ لطف بھی خود ایک نامعلوم کلمہ ہے یہ کلمہ بجائے خود جائے سوال واستفسار رکھتا ہے کیا لطف کوئی جسمانی خلیہ ہے جسکی خوبی یہ ہے کہ اس کی وجہ سے انسان نہ ترک اطاعت کرتا ہے اور نہ فعل معصیت؟ یا یہ کوئی ایسی روحانی صفت ہے کہ جو دیگر صفات کی مانند وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مرحلہ وار انسان کی اندر نمو پاتی ہے، جیسے علم، طلب، رضا، ناراضگی وغیرہ؟ یا پھر یہ کوئی بیرونی چیز ہے جو جسم وروح سے منفصل ہے، جو اسے مہلک اور نامطلوب حالات سے اسی طرح محفوظ رکھتی

ہے جسطرح کہ ایک چرواہا، بھیڑ، بکریوں کی نگرانی کرتا ہے اور انہیں خطرات سے بچاتا ہے، یا کسی چھوٹے بچے کی نگرانی پر معمور شخص اسے گرنے سے، گندی چیزیں کھانے سے اور جسم کو ضرر پہنچانے والی چیزوں سے محفوظ رکھتا ہے؟۔

پیغمبر اکرمؐ کے مبعوث ہونے سے پہلے کے دور کے بارے میں جناب امیر المومنینؑ نہج البلاغہ میں فرماتے ہیں: خداوند عالم نے فرمایا: ہم نے ان پر (رسول اللہ پر) ایک مَلَک کو موکل کیا تھا جو انہیں محاسن اخلاق کی راہ پر گامزن کرتا تھا اور برائیوں سے روکتا تھا"۔ اگر ہم یہاں مَلَک کا ترجمہ اس معروف جنس موجود سے کریں تب تو ٹھیک ہے ورنہ اگر یہاں ملک کا ترجمہ عصمت سے کیا تو اس صورت میں عصمت کے ذیل میں بیان کردہ دوسری تفسیر کی طرف برگشت کرنا پڑے گی۔

۲۔ بعض علمائے اعتقاد نے عصمت کو لطف کی بجائے 'ملکہ نفسانی'' سے تعبیر کیا ہے یعنی یہ کہ یہ انسان کے جسم سے مربوط کوئی شے نہیں بلکہ ایک نفسانی صفت ہے انسان کا نفس اس صفت کے رسوخ پانے سے اور اس سے آراستہ و پیراستہ ہونے کے سبب فعل معصیت یا ترک اطاعت کی طرف نہیں جاسکتا۔

عصمت کو چاہے آپ لطف الٰہی کہیں یا ملکہ نفسانی، ہمارا سوال اسی جگہ پر قائم ہے کہ آیا اس صفت تک پہنچنے کیلئے لطف الٰہی اور ملکہ حاصل کرنا ہر انسان کیلئے ممکن ہے؟ کیا انسان کے لئے یہ میدان صاف ہے، یہ دروازہ سب کیلئے کھلا ہوا ہے اور سب اس درجہ پر فائز ہوسکتے ہیں؟

اگر ایسا ہے تو پھر انبیاء یا خدا کے مخصوص بندوں کے لئے کوئی خاص ضمانت نہیں ہوئی جس کی ضرورت تھی کیونکہ اس مقام تک ہر شخص پہنچ سکتا ہے اگر یہ خاص طور پر صرف انبیاء کیلئے مختص ہے اور دوسروں کو میسر نہیں تو اس صورت میں بھی ان حضرات کا کوئی امتیاز یا ان کی کوئی فضیلت نہ ہوئی، کیونکہ جسے خدا نے بخشا وہ پا گیا اور جسے نہیں دے وہ محروم رہا۔

عقیدہ عصمت انبیاء پر اشکالات اور اعتراضات

انبیاء کے بارے میں عمداً یا استفہاماً مختلف زاویہ نگاہ سے اشکالات اور اعتراضات کیے جاتے ہیں۔ اس مذہب کے خلاف عمداً کمر بستہ ہو کر اشکالات اور اعتراضات کرنے والے کسی بھی صورت ہمارے جوابات سے قانع اور مطمئن نہیں ہونگے، مگر جو افراد نا سمجھی میں ایسا کرتے ہیں ہم پہلے ان کے ذہنوں میں پیدا ہونے والے اشکالات اور اعتراضات کے اسباب اور وجوہات کو بیان کریں گے، اس کے بعد ان کا ذکر کریں گے اور پھر تیسرے مرحلے میں اپنی بساط علمی اور آگاہی کے حدود میں رہتے ہوئے ان اشکالات کے جوابات دینے کی کوشش کریں گے۔

اعتراضات اور اشکالات کے اسباب اور وجوہات

۱۔ بہت سے افراد کسی بھی موضوع پر غور و فکر یا باریکی میں جانے کی زحمت کرنے کیلئے آمادہ نہیں ہوتے ہیں، سرسری اور سطحی طور پر سنتے ہیں اور اسی سے ذہن میں ابھرے ہوئے اشکال کو پیش کرتے ہیں۔

۲۔ دوسرا اشکال فلسفی بنیاد پر ہے وہ انبیاء کو عام بشر سمجھتے ہیں اور بشر کی خلقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے خطا سرزد ہو سکتی ہے ورنہ وہ بشر نہیں رہتا۔

۳۔ بعض لوگ عصمت کے وصف کو صرف انبیاء وائمہ سے مخصوص کرنے کو، ان کیلئے کوئی فضیلت نہیں سمجھتے کیونکہ اس صفت کے حصول میں ان کا اپنا کوئی کردار نہیں ہے اور یہ صفت ان کے ارادے کے بغیر ان میں پیدا ہوئی ہے فضیلت اس وقت ہے جب اس کے ہونے میں ان کا اپنا کوئی اپنا کردار ہو جب انبیاء کا صفت عصمت کے حصول میں کوئی کردار نہیں تو پھر یہ ان کیلئے کوئی فضیلت بھی نہیں ہے اور اگر یہ صفت حاصل کرنا دوسروں کیلئے بھی ممکن ہو تو اس صورت میں یہ ان کیلئے کوئی امتیاز نہیں رہتا۔

۴۔ بعض لوگوں نے عصمت کے معنی شیطان کی زد اور اس کے بہکانے میں انسان کا نہ آنا بیان

کئے ہیں کتب آسمانی کی بعض آیات میں صریح طور پر آیا ہے کہ بعض انبیاء شیطان کی زد میں آنے اور اس کے بھکانے سے محفوظ نہ رہ سکے۔

اب یہاں پر ہم عصمت کئے جانے والے اعتراضات کا جائزہ لیں گے:

۱۔ کیا ممکن ہے کہ عصمت کے لئے جو چار عناصر اوپر بیان کئے گئے ہیں، انسان انہیں بطور کامل حاصل کر سکے؟

۲۔ کیا انسان کے لئے یہ ممکن ہے کہ اسے، انسان سے مربوط ہر قسم کے نفع اور نقصان کا علم حق الیقین کے درجہ تک حاصل ہو جائے؟

پہلے ہم دوسرے سوال کو زیر بحث لاتے ہیں اس سوال کا جواب یہ ہے کہ کسی فعل کے نفع و نقصان کی صحیح تشخیص کرنا فقط دنیاوی زندگی پر انحصار کرنے والے انسان کیلئے ایک ناممکن عمل ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب انسان حیات دنیوی کے بعد ایک اور حیات جسے حیات ابدی کہتے ہیں، اسکا بھی تصور کرے اور اس پر یقین رکھے کیونکہ دنیا میں رہ کر انسان کو بہت سے ایسے افعال انجام دینا پڑتے ہیں جن سے بظاہر نقصان ہی نظر آتا ہے لیکن اسکے باوجود انہیں انجام دینا ضروری ہوتا ہے، جیسے زکوۃ ہے خمس وخیرات ہے، یہ سب مالی نقصان ہے، اسی طرح جہاد ہے، جنگ میں شریک ہو کر جان دینا، نقصان کے سوا اور کیا ہے؟ اگر نقصان کے بارے میں حق الیقین کو کافی سمجھا جائے، تو پھر ان نقصان دہ اعمال کا حق الیقین ہونے کے باوجود ارتکاب کرنے والوں کی کیا توجیہ کریں گے؟

لہذا اس سوال کے جواب کا پہلا مرحلہ تو یہ ہے کہ کسی انسان کے لئے ہر چیز میں موجود تمام تر نفع ونقصان کا علم ہونا اور ہر چیز کے تمام ضرر رساں اور فائدہ مند پہلوؤں سے آگاہی رکھنا کسی طور ممکن ہی نہیں ہے دنیا میں جتنی بھی نابغہ روزگار شخصیات گزری ہیں، وہ سب فقط اپنے مخصوص شعبوں میں ہی آگاہی رکھتی تھیں، دوسرے شعبوں میں جاہل تھیں، علماء، فقہاء، مجتہدین اور عرفاء حضرات ہی کو لے لیجئے، یہ لوگ روحانی علوم میں تو ملکہ رکھتے ہیں لیکن وہ تمام چیزیں کہ جو جسمانی ضرر کا باعث ہو

سکتی ہیں، سب سے واقفیت نہیں رکھتے اور اسی لئے یہ ہستیاں جسم کو نقصان پہنچانے والے مضرات کا ارتکاب کرسکتی ہیں اس کے برعکس ایک طبیب جسمانی ضرر پہنچانے والی چیزوں سے خوب واقف ہوتا ہے جبکہ روحانی مضرات سے نابلد ہوتا ہے۔

دوسرے مرحلہ پر کسی فعل کے نفع ونقصان کو فقط دنیا سے مربوط کرنا، یا فقط آخرت سے ارتباط دینا، تفسیر عصمت میں مشکلات کے اسباب پیدا کرتا ہے چنانچہ نفع ونقصان کو فقط دنیا یا فقط آخرت سے ارتباط دینے والوں کو مشکلات کا سامنا رہتا ہے اسکی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ ایک انسان فقط وقتی یا چند لمحوں کی دنیاوی ذلت وخواری سے بچنے کیلئے خودکشی کرلیتا ہے اور یوں اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے یقیناً یہ گناہ کبیرہ ہے۔

۲۔ دوسرا انسان جسکے نزدیک آخرت ہی کی زندگی سب کچھ ہے، دنیا میں رہبانیت کی زندگی اختیار کرلیتا ہے یہ شخص بھی گناہ کا مرتکب ہورہا ہے۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ کیا ایک عام انسان کیلئے یہ ممکن ہے کہ وہ اپنے اندر صفت عصمت بطور کامل پیدا کرلے؟ اس کی وضاحت ہم عصمت سے متعلق چند دیگر اہم مفاہیم کے بیان کے بعد آئندہ صفحات میں کریں گے۔

انسان سے گناہ سرزد ہونے کے اسباب ووجوہات:

۱۔ جہل ونادانی: انسان سے گناہ سرزد ہونے کے اسباب وعلل میں سے ایک اس کے وجوب اور اسکی حرمت یا اسکی قباحت اور مذموم ہونے کے بارے میں، جہل ونادانی ہوتی ہے اگر کوئی شخص کسی فعل کی حرمت وقباحت یا اس کے مذموم ہونے کے بارے میں قطعی طور پر نابلد اور لا علم ہو تو ایسے فعل کو وہ بغیر کسی جھجک کے انجام دیتا ہے بلکہ بسا اوقات اس فعل کو انجام دے کر راحت اور مسرت محسوس کرتا ہے مثلاً اگر کسی کو سود کی کثیر رقم ہاتھ آجائے تو اسے خوشی ہوتی ہے

بلکہ وہ اسے خدا کی طرف سے عطیہ وانعام گردانتا ہے اسی طرح مغربی دنیا میں ایک نوجوان لڑکا اور نوخیز لڑکی اگر باہمی رضامندی سے گناہ کبیرہ کا ارتکاب کریں، جس پر انکے یہاں کسی قسم کی پابندی بھی نہیں، تو جب انھیں اس بات کا قطعاً علم ہی نہیں کہ خدا کے نزدیک یہ ایک حرام اور قبیح فعل ہے تو ظاہر ہے کہ انھیں احساس جرم بھی نہیں ہوگا۔ اسی طرح ہمارے یہاں بہت سی خواتین انتہائی شرمناک آرائش وزیبائش کے ساتھ، کھلے عام بے حجاب گھومتی پھرتی ہیں انھیں سرے سے بے حجابی کی حرمت کا علم ہی نہیں، اس لئے اس میں ذرہ برابر بھی کراہت وقباحت محسوس نہیں کرتیں۔ اسی طرح بہت سے احکام مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوۃ وغیرہ کے وجوب کے بارے میں اگر کسی کو علم نہیں اور ایک عمر گزر جائے تو ممکن ہے کہ ایسا انسان اس وجہ سے ان گناہوں کے عقاب سے بچ جائے یا کم از کم اس میں تخفیف ہو جائے کیونکہ اس کیلئے ابلاغ حجت نہیں ہوئی، اس تک تبلیغ پہنچی ہی نہیں۔

۲۔ ذاتی خواہشات: گناہ کے ارتکاب کا ایک سبب انسان کی ذاتی خواہشات ہیں۔ اگر معلوم بھی ہو اور بتا بھی دیا گیا ہو کہ یہ فعل برا ہے یا یہ کہ اس فعل کی انجام دہی نقصان دہ اور ضرر رساں ہے، جیسے کبھی مریض کی خواہش ایسی غذا کھانے کی ہوتی ہے جسے طبیب نے منع کیا ہے۔ انسان میں بہت سی ایسی خواہشات کے عناصر موجود ہیں مثلاً راحت طلبی، منصب اور اقتدار کی خواہش، مال اور دولت کی خواہش، لذیذ کھانوں کی خواہش، جنسی خواہشات وغیرہ وغیرہ، جو اسے گناہ کی طرف کھینچتی ہیں۔ مختلف قوتیں ہیں جو انسان کے اندر ان خواہشات کو جنم دیتی ہیں مثلاً حرص وحسد، غضب وشہوت، جنسی خواہشات وغیرہ، ان خواہشات کے روکنے کا اگر کوئی بندوبست نہ ہو، اگر کوئی بڑی قوت وطاقت ان کو روکنے والی نہ ہو تو انسان لازماً گناہ کا ارتکاب کرے گا۔

انبیاءؑ ان اسباب وعوامل سے محفوظ ہیں لہٰذا وہ عام انسانوں کے لئے اسوۂ حسنہ قرار پائے ہیں جیسا

کہ خداوند عالم نے فرمایا کہ تمہارے لئے رسول بہترین نمونہ ہیں اس سلسلے میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں:

﴿لقد کان لکم فی رسول الله اسوة حسنة﴾ ''تمہارے لئے پیغمبر خدا کی پیروی بہتر ہے۔'' (احزاب/۲۱) ﴿قل ان کنتم تحبون الله فاتبونی یحببکم الله ویغفر لکم ذنوبکم والله غفور رحیم۔ قل اطیعو الله والرسول فان تولو فان الله لا یحب الکافرین﴾ ''اے پیغمبر لوگوں سے'' کہہ دو کہ اگر تم خدا کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا بھی تمھیں دوست رکھے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور خدا بخشنے والا اور مہربان ہے کہہ دو کہ خدا اور رسول کا حکم مانو اگر نہ مانو گے تو خدا بھی کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔'' (آل عمران/۳۱،۳۲)

عصمت انبیاء کے خلاف قرآنی آیات سے استدلال

الف۔ حضرت آدم کے بارے میں شبہات:

﴿فازلهما الشیطن عنها فاخرجهما مما کان فیه﴾ ''پس شیطان انکی لغزش کا سبب بنا اور جس بہشت میں وہ تھے وہاں سے نکال دیا'' (بقرہ/۳۶) ﴿قال ربنا ظلمنا انفسنا وان لم تغفر لنا وترحمنا لنکونن من الخاسرین﴾

''ان دونوں (آدم وحوا) نے عرض کیا اے ہمارے پروردگار ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کے اگر تو ہم کو نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں ہو جائیں گے'' (اعراف/۲۳)

ب۔ حضرت نوح کے متعلق شبہ

سورہ ھود آیت ۴۷ میں حضرت نوح علیہ السلام کے گناہ کی طرف نسبت ہے:

﴿قال رب انی اعوذبك ان اسئلك مالیس به علم﴾ ''نوح نے کہا کہ خدایا میں

اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ اس چیز کا سوال کروں جسکا علم نہ ہو"

ج۔ حضرت ابراھیمؑ کے بارے میں شبہات:

﴿فلما جن علیہ الیل راکو کبا قال ھذا ربی فلما افل قال لا احب الافلین﴾ "جب رات ہوئی، تاریکی نے اسے ڈھانپ لیا تو اس نے ایک ستارے کو دیکھا تو کہا کیا یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ غروب ہو گیا تو کہا میں غروب ہونے والے کو پسند نہیں کرتا" (انعام/۷۶) ﴿واذقال ابراھیم رب ارنی کے فتحی الموتی قال اولم تومن﴾ "اور جب ابراہیم نے کہا پروردگار مجھے دکھا تو کیسے مردوں کو زندہ کرتا ہے، فرمایا کیا تم ایمان نہیں لائے" (بقرہ/۲۶۰) ﴿قال بل فعلہ کبیرھم ھذا فسئلو ھم ان کانوا ینطقون﴾ "ابراھیم نے کہا بلکہ یہ کام ان کے بڑے نے کیا ہوگا ان ہی سے پوچھو اگر یہ بات کر سکتے ہیں" (انبیاء/۶۳)

د۔ حضرت موسیٰ کے بارے میں شبہات:

﴿وفعلت فعلتك التی فعلت وانت من الکفرین﴾ "اور تو نے وہ کام جو انجام نہیں دینا چاہے تھا انجام دیا ہے اور تو کافروں میں سے تھا" (شعراء/۱۹) ﴿قال فعلتھا اذا وانا من الضالین﴾ "موسیٰ نے کہا کہ وہ قتل میں نے اس وقت کیا تھا جب میں غافل تھا" (شعراء/۲۰) ﴿ففررت منکم لما خفتکم فوھب لی ربی حکما وجعلنی من المرسلین﴾ "پھر میں نے تم لوگوں کے خوف سے گریز اختیار کیا تو میرے رب نے مجھے نبوت عطا فرمائی اور مجھے اپنے نمائندوں میں سے قرار دیا" (شعراء/۲۱) ﴿فوکزہ موسی فقضی علیہ قال ھذا من عمل الشیطن انہ عدو مضل مبین﴾ "موسیٰ نے اس دشمن کے سینہ پر ایک مکا مارا اور اس کا کام تمام کر دیا وہ زمین پر گرا اور مر گیا۔ موسی نے کہا یہ ایک عمل شیطانی تھا بیشک وہ شیطان دشمن اور صریح بہکانے والا ہے" (قصص

﴿قال رب انی ظلمت نفسی فاغفرلی فغفرلکم انه هوالغفور الرحیم﴾ ''موسیٰ نے کہا اے میرے پروردگار میں نے اپنے اوپر ظلم کیا تو مجھے بخش دے پس اللہ نے اسے بخش دیا وہ اللہ بیشک بخشنے والا رحم کرنے والا ہے'' (قصص/۱۵،۱۶)

و۔ حضرت یوسف کے بارے میں شبہات:

﴿ولقد همت وهم بها لو لا ان رابرهان ربه كذلك لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصين﴾ ''اور اس عورت نے قصد کر لیا تھا ان کا اور اگر وہ اپنے رب کی روشن دلیل نہ دیکھ لیتے تو وہ بھی قصد کرتے۔ یوں ہوا کہ یوسف سے ہم برائی اور بے حیائی کو دور کریں، بیشک وہ ہمارے بندوں میں سے چن لیے گئے ہیں'' (یوسف/۲۴)

ہ۔ حضرت یونس پر شبہ:

﴿وذالنون اذذهب مغاضبا فظن ان لن نقدر عليه فنادى فى الظلمات ان......﴾ ''اور یونس کو یاد کرو جب وہ غصہ میں آکر چلے اور یہ خیا کیا کہ ہم ان پر روزی تنگ نہ کرینگے پھر تاریکیوں میں جا کر آواز دی'' (انبیاء/۸۷)

ز۔ بعض آیات قرآنی میں بھی آیا ہے اور خود انبیاءؑ وائمہؑ نے بھی درگاہ خداوندی میں اپنی کوتاہیوں اور تقصیر پر بخشش واستغفار کیلیے دست نیاز بلند کر کے اپنی زبان سے دعا کی ہے۔

عصمت سے متعلق اشکالات کے جواب

ا۔ عصمت وہ صفت ہے جس کے ہوتے ہوئے انسان مختلف خطاؤں اور لغزشوں سے محفوظ رہتا ہے یہ صفت تمام انسانوں میں کسی نہ کسی حوالے سے موجود ہوتی ہے البتہ اس کے مختلف درجے ہیں اور انبیاء اس حوالے سے اس کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں لہذا یہ کہنا کہ عصمت انسانی ساخت اور انسانی بناوٹ کے منافی ہے، ایک سطحی فکر کی غمازی کرتی ہے اس اشکال میں کسی

قسم کی تحقیق و تدقیق کی بو تک نہیں آتی، عام مشاہدہ کی بات ہے کہ جس چیز کی طرف انسان زیادہ متوجہ ہوتا ہے اس میں کبھی بھی خطا نہیں کرتا ہے چنانچہ ہم کبھی کھانا کھانا نہیں بھولتے، کبھی سونا نہیں بھولتے، کبھی دفتر جانا نہیں بھولتے، ہماری عمر گزر جاتی ہے ہم کبھی زہر نہیں کھاتے، اسی طرح سے عصمت از گناہ بھی احکام خداوندی کی طرف توجہ کرنے سے حاصل ہو سکتی ہے غرض عصمت بمعنی ترک گناہ میں صرف انبیاءؑ اور ائمہؑ شامل نہیں ہیں بلکہ دوسرے انسان بھی گناہوں سے محفوظ رہتے ہیں۔

۲۔ جن آیات میں انبیاء کرام کی طرف خطا، لغزش اور کوتاہی کی نسبت دی گئی ہے ان کے جوابات یہ ہیں:

۲۔۱ یہ اشکال کہ بہت سے انبیاء شیطان کے بہکانے میں آئے، اس آیت کی صریح خلاف ورزی ہے کہ جس میں شیطان خود کہتا ہے کہ میں تیرے تمام بندوں کو گمراہ کروں گا سوائے بندگان صالح کے آیت ۸، انبیاء کے صالح ہونے میں کسی کو شک نہیں ہے۔

۲۔۲ عصمت کا ماخذ و مصدر نہ کوئی جسمانی خلیہ ہے، نہ کوئی نفسانی صفت ہے۔ اور نہ بیرونی حصار و چار دیواری ہے بلکہ عصمت ایک دینی ضرورت ہے جس طرح تمام بندوں میں سے ایک بندہ کو خلق کی ہدایت کیلئے مقام رسالت و نبوت پر فائز کرنا ضروری ہے، اسی طرح اسی ہستی کو عصمت سے آراستہ و پیراستہ رکھنا بھی ضروری ہے یہ ایک استثنائی عمل ہے اور یہ استثنا اپنی حدود کے حصار میں رہے گا لہٰذا انبیاء وائمہ کیلئے جس عصمت کے ہم معتقد ہیں وہ عام عصمت کے تصور سے تین چوتھائی وسعت رکھتی ہے اس بات کی وضاحت آگے چل کر حدود عصمت کے ذیل میں آئے گی، گزشتہ صفحات میں ہم نے عصمت انبیاء وائمہ کے بارے میں بعض حلقوں کی جانب سے وارد اشکالات کا ذکر کیا ہے، ان میں سے بعض نے قرآن کریم کی آیات کو بنیاد بنایا گیا ہے جبکہ بعض میں روایات اور تاریخی واقعات کو سند بنانے کی کوشش کی

گئی ہے، ان تمام اشکالات کا فرداً فرداً جواب دینا یہاں ممکن نہیں تاہم اس حوالے سے ذہنوں میں موجود تشویش و الجھن کو دور کرنے کیلئے ایک اجمالی اور اصولی وضاحت پیش خدمت ہے۔

بعض اشکالات تو صرف اس وجہ سے پیدا ہوتے ہیں کہ اعتقادات پر عقیدت و جذبے کا عنصر غالب آجاتا ہے اور عقیدت کو ٹھیس پہنچا کر اعتقاد کا جواب دینا بعض افراد کیلئے مشکل ہو جاتا ہے ایسی صورت حال میں ضروری ہو جاتا ہے کہ ذہنوں میں عقیدت اور اعتقاد کے اصل فرق کی واضح حد بندی کی جائے، اس سلسلہ میں ایک مسلم اصول تو یہ ہے کہ اعتقاد کیلئے محکم سند کی ضرورت ہوتی ہے اگر سند محکم ہو تو اس پر اشکال نہیں کیا جا سکتا۔

قرآن کریم کی بعض آیات کریمہ کو بنیاد بنا کر عصمت کے بارے میں جن شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا ہے، یہ غلط فہمیاں دراصل آیات کے سیاق وسباق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہیں۔ اگر آیات میں دقیق غور و غوض کیا جائے تو تمام شبہات خود بخود رفع ہو جائیں گے۔ بعض آیات میں فقط ایک لفظ پورے جملے کی شرط قرار پاتا ہے اگر اس ایک لفظ کو نظر انداز کر کے معنی لئے جائیں تو اشکال اپنی جگہ قائم رہتا ہے لیکن اگر شرط کے لفظ کو سامنے رکھ کر سمجھا جائے تو اشکار دور ہو جاتا ہے مثلاً قصہ ابراھیم میں ﴿بل فعله كبير هم هذا فسئلو هم ان كانو ينطقون﴾ میں سے لفظ ''ان'' نکال دیں تو اشکال پیدا ہوتا ہے اسی طرح سورہ یوسف میں ﴿هم بها لا لا ان رابرهان ربه﴾ میں سے لفظ ''لو'' کو نکالنے سے اشکال پیدا ہوتا ہے بعض جگہوں پر لفظ ''ذنب'' (یعنی گناہ، ظلم) کا ذکر ہوا ہے لیکن یہ گناہ، یہ ظلم کس کے ساتھ ہے، کس کی نظر میں ہے، اشکال کرنے والے نے اس کا خیال نہیں کیا، ممکن ہے نبی یا امام کا کوئی عمل ان کے مخالفین کی نظر میں ذنب یا ظلم ہو لیکن وہی خدا کی نظر میں عین اطاعت ہو، مثلاً نبی کریمؐ مشرکین کی نظر میں (معاذ اللہ) مجرم و گنہگار تھے جبکہ خدا کے نزدیک آپؐ تمام انبیاء سے زیادہ مطیع و فرمانبردار تھے۔ یعنی جو عمل مشرکین کی نظر میں گناہ ہے، ہو

سکتا ہے وہی عمل خدا کی نظر میں عین اطاعت ہو۔

ایک عمل خدا کے نزدیک تو گناہ نہیں ہوتا، لیکن سیاسی اور اجتماعی حوالے سے دیکھا جائے تو یہی عمل دعوت کی راہ میں رکاوٹ بن سکتا ہے مثلاً ایک کافر اور ظالم کو قتل کرنا گناہ نہیں لیکن قتل میں پہل کرنا دوسروں کیلیے بہانے کا سبب بن سکتا ہے چنانچہ امیر المومنینؑ نے جنگ صفین میں اور امام حسینؑ نے کربلا میں جنگ میں پہل کرنے سے سختی سے گریز فرمایا اور جب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے حامی قبطی کو ایک مکا مارا جس سے وہ مرگیا تو آپ کو اپنی دعوت کے سلسلے میں فرعون کے دربار میں مشکل پیش آئی۔

معصوم اور غیر معصوم کی شناخت کیسے ممکن ہے؟

معصوم کے قول وفعل کو خاموشی سے اور بغیر کسی چون وچرا کے قبول کرنا اور اس پر عمل کرنا ضروری ہوتا ہے۔

انبیاء جب دعوائے نبوت کرتے ہیں اور یہ اعلان کرتے ہیں کہ وہ خدا کی طرف سے مبعوث ہوئے ہیں تو وہ اپنے دعویٰ کی حقانیت ثابت کرنے کے لئے بطور دلیل معجزہ دکھاتے ہیں تاکہ ان کے اور اس عظیم مقام ومنصب کے جھوٹے دعویداروں کے درمیان فرق واضح ہوسکے۔ انسانی معاشرہ میں کچھ افراد ایسے ہوتے ہیں جو اپنے اوپر تقدس کا ایک خول چڑھائے ہوئے ہوتے ہیں اور عملاً ایسا ظاہر کرتے ہیں کہ گویا وہ معصوم ہیں، یہ حضرات چاہے کسی پر زیادتی کریں، تعدی یا تجاوز کریں یا کوئی ایسا فعل انجام دیں جس سے پوری قوم کو نقصان پہنچے، جب لوگ ان پر اعتراض کرتے ہیں، تو یہ اپنے آپ کو بچانے کیلیے، ان کے جواب میں اسطرح سے برہمی کا اظہار کرتے ہیں گویا کہہ رہے ہوں، کیا تم معصوم پر اعتراض کرتے ہو؟

عصمت کا لبادہ اوڑھ کر یہ حضرات قوم وملت کے ساتھ جو زیادتیاں چاہیں کریں، اگر ملت کا کوئی فرد اٹھ کر ان پر اعتراض کرے تو اسی مقدس لبادہ کا سہارا لیکر یہ اس کی آواز کو بھی دبا دیتے

ہیں۔ چنانچہ عام مشاہدہ ہے کہ بہت سے موقعوں پر علماء کرام لوگوں سے کہتے نظر آتے ہیں ’’آپ علماء پر اعتراض کرتے ہیں، ان کو غلط گردانتے ہیں‘‘ وغیرہ وغیرہ، عصمت ایک ایسا حربہ ہے کہ جسے کوئی بھی شخص امت کے اور قوموں کے حملوں سے بچنے کیلئے بطور سپر استعمال کرسکتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسے حالات میں ہم اس شخص کو جو واقعاً عصمت کے درجہ پر فائز ہے، اس شخص کے مقابلہ میں کہ جو عصمت کا جھوٹا دعویدار ہے، کیسے تمیز کرسکتے ہیں؟ ان دونوں میں صحیح اور غلط کی پہچان کیسے ممکن ہے؟

اس سلسلہ میں علمائے اعتقاد نے دو طریقے وضع کیے ہیں:

۱۔ جس شخص کا قول وفعل، یا جسکی سیرت وعمل آیات قرآنی کریم اور سیرت رسول اللہ کے مطابق ہو وہ درجہ عصمت پر فائز ہوگا یا عصمت سے قریب تر ہوگا اور جس کا قول وفعل اور عمل قرآن و سنت سے مطابقت نہ رکھتا ہو، وہ اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہوگا۔

۲۔ ایسا فرد معصوم ہے جس کی عصمت کو ساری امت تسلیم کرتی ہو، وہ اگر کسی فرد کی عصمت کا اعلان کرے جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ نے زہراء مرضیہ (س) کے بارے میں فرمایا، یا یہ کہ امیر المومنین حضرت علیؑ کے بارے میں فرمایا حضرت علیؑ اور امام حسنؑ کے بارے میں یا امام حسنؑ نے امام حسینؑ کے متعلق فرمایا، تو ایسی صورت میں متعارف کنندہ شخصیت کے معصوم ہونے کا یقین حاصل ہوجاتا ہے۔

عام طور پر وقت گزرنے کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مقتداء اور پیشوا اپنے فکر ونظر اور سیرت و کردار میں کس حد تک خطا ولغزش سے محفوظ اور معصوم تھا اور وہ جو کچھ کہتا تھا، کس حد تک صحیح تھا اس طرح عام طور پر دنیا سے گزرنے کے بعد ہی انکی عصمت پر یقین آتا ہے اس کے برعکس عہد حاضر کے قائدین بھرپور طریقے سے یہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں: ’’ہم آپکو اپنی بات کی ضمانت دیتے ہیں‘‘ گویا اس طرح خود کو معصوم ظاہر کرتے ہیں لیکن جب قوم وملت گرداب میں گھر جاتی ہے تو

اظہار حقیقت نمائی کرنے والے یہ لوگ، حقیقت گو بن کر کہتے نظر آتے ہیں کہ "کیا آپ نے ہمیں معصوم سمجھا تھا؟، ہاں قوم ایسے لوگوں کو اپنے مقابلہ میں لغزشوں سے پاک سمجھ کر ہی انکے ہاتھ میں اپنے مقدارات دیتی ہے اگر انکو خود جیسا سمجھتی تو یقیناً پہلے ہی اعتماد نہ کرتی۔

عقیدہ عصمت کا تاریخی پس منظر

عقائد کی ابحاث میں سے ایک بحث عقائد کی اپنی تاریخ سے متعلق ہے یعنی اس عقیدہ پر بحث و مناظرہ اور مجادلہ کب سے شروع ہوا یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ مسلمانوں میں جو عقائد اس وقت رائج ہیں وہ "الف" "تا" "ی" ابتدائے اسلام میں موجود نہ تھے بلکہ موجودہ دور کے بعض عقائد صدر اسلام کے بعد میں شامل ہوئے، اسلام کے ابتدائی دور میں صاحبان علم وفکر مسلمان، اپنے علم وفکر کی بنیاد پر اور سطحی ذہن رکھنے والے عوام، پیغمبر اکرمؐ کے مثالی کردار سے متاثر ہوکر، ہر وہ بات جو پیغمبرؐ فرماتے، اس کو من وعن قبول وتسلیم کر لیتے تھے اگر کسی بھی آیت کے کلمہ کا مصداق معلوم نہ ہوتا تو پیغمبرؐ سے پوچھتے کہ اس سے کون یا کیا مراد ہے؟ وفات پیغمبرؐ کے بعد بیرونی فتوحات کی وجہ سے ایک طرف تو فلسفہ وغیرہ کا عربی زبان میں ترجمہ ہونے لگا اور دوسری طرف یہود ونصاری کی ایک کثیر تعداد اسلام میں داخل ہوگئی ان نومسلموں میں یہود ونصاری کے علماء بھی شامل تھے جنہوں عقائد اسلامی میں شکوک وشبہات کو داخل کیا انہوں نے ہر عقیدہ کو موضوع گفتگو بنایا مثلاً رویت خدا، صفات خدا عین ذات ہے یا زائد بر ذات ہے وغیرہ وغیرہ، لہٰذا خدا، نبوت اور آخرت پر ایمان کے علاوہ، اس وقت ہمارے یہاں رائج ہر عقیدہ کی ایک تاریخ پیدائش ہے۔ جب تک آپ اس تاریخ پیدائش اور اس کے عقائد میں شامل ہونے کے اسباب وعوامل تک نہیں پہنچیں گے، اسوقت تک اس عقیدہ کے نفی اور اثبات سے متعلق کسی قسم کی تنقید اور تجزیہ، غیر موثر اور ناقص رہے گا۔

اس سلسلہ میں ہم آپ کی خدمت میں ان چند عوامل واسباب کا ذکر کرتے ہیں جن کی بنا پر آئے دن مسلمانوں کے عقیدوں میں اضافہ ہوتا گیا، ہر نئے عقیدے نے پہلے سے موجود بنیادی عقیدے کو

پسِ پشت کیا اور نئے عقیدوں کو ایمان وکفر، دینداری و بے دینی اور نجات وہلاکت کی کسوٹی قرار دیا جانے لگا جیسے "یارسول اللہ" اور "یاعلی مدد" کا نعرہ بلند کرنا جزءِ عقیدہ اور ایمان قرار دینا۔

۱۔ پیغمبر اکرمؐ کی وفات کے بعد جانشینی پیغمبرؐ کے مسئلہ پر امت دوگروہوں میں تقسیم ہوئی۔ ان میں سے ہر گروہ، فروع اور عقائد کے بارے میں دوسرے گروہ کی نقل کردہ احادیث پیغمبر پر عدم اعتماد کا اظہار کرتا اور شکوک وشبہات کا شکار ہوتا، ہر فریق اشکال کرتا کہ یہ حدیث دوسرے فریق کی نقل کردہ ہے، اس لئے اس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

۲۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں میں راویوں کے حافظہ میں خلل کے سبب ان کی بیان کردہ احادیث قول رسول ہونے میں شکوک وشبہات پیدا ہوگئے، لوگ تذبذب میں پڑ گئے کہ آیا یہ قول جو راوی بیان کررہا ہے نص رسولؐ ہے بھی یا راوی کی اپنی رائے وتعلیق ہے۔

۳۔ پھر جب اسلامی فتوحات کا سلسلہ شروع ہوا تو بالخصوص فتح روم کے بعد مسیحی علماء، وطن اسلامی میں مسیح افکار کے ساتھ داخل ہوئے، ان کے مسیحی عقائد کا اسلامی عقائد کے ساتھ تصادم ہوا، یہ مسیحی علماء غلبہ اسلامی کے سبب بظاہر حلقہ اسلام میں داخل ہوئے تھے، لیکن صدق دل سے اسلام قبول کرنے کو تیار نہیں تھے لہٰذا انکا اسلامی عقیدہ کو قبول کرنا اور مسلمانوں کا انھیں سمجھانا ایک مشکل عمل تھا یہ بات بذات خود موضوع گفتگو قرار پائی، اسی طرح ایران کی فتح کے بعد زردشتی، مجوس بھی اپنے پرانے عقیدہ کو ساتھ لے کر داخل اسلام ہوئے انھوں نے بھی اسلامی عقائد کو خالص انداز میں قبول نہیں کیا اس طرح سے مسیحیت اور مجوسیت کے شوم عقائد اور منحرف افکار وخیالات نے مسلمانوں کے اذہان میں اثر پذیری کی جسکی وجہ سے عقائد میں گفتگو کے نئے زاویے پیدا ہوئے۔

۴۔ حضرت علیؑ اور معاویہ کی جنگ کے بعد ایک نیا سوال پیدا ہوگیا کہ آیا ایمان اور عمل دونوں الگ الگ چیزیں ہیں یا دونوں ناقابل تجزیہ وتقسیم چیز ہے دونوں ایک دوسرے سے وابستہ

ہیں غرض یہ کہ ایمان و عمل جو دین کی بنیاد و بنیادی ابجد ہیں وہی موضوع بحث و مناظرہ بن گئے چنانچہ خوارج کے حملہ کی زد سے بچنے کے لئے معاویہ نے فکر ''مرجئہ'' ایجاد کی جس کے تحت دل میں ایمان ہونا ہی کافی ہے اس فکر کے مطابق ایسی حالت میں اگر عمل کو چھوڑنا پڑے تو چھوڑا جاسکتا ہے اور ظاہری طور پر ارتکاب گناہ یا بت پرستی میں کوئی حرج نہیں، اس مذہب کی بنیاد معاویہ کے دور میں پڑی اور آج تک اس فکر کو ہمارے درمیان فروغ حاصل ہو رہا ہے اسی فکر کا نتیجہ ہی تو ہے کہ ہم آج بھی بدکردار انسانوں کے بارے میں لوگوں کو یہ کہتے سنتے ہیں کہ شاید ایمان اسکے دل میں ہو، شاید خدا کو یہی منظور ہو وغیرہ وغیرہ۔

۵۔ اسلامی ریاست پر برسر اقتدار حکام ایک جانب اپنے آپ کو منصب رسول کا جانشین گردانتے اور اسے دینی رنگ پہنانے کیلئے کہتے ہیں کہ یہ خلعت انہیں خدا نے پہنائی ہے وہ بطور دلیل اس آیت کو پیش کرتے تھے:

﴿قل اللهم ملك الملك تؤتی الملك من تشآء وتنزع الملك ممن تشآء﴾ ''کہہ دیجئے: اے اللہ! اے مملکت (ہستی) کے مالک تو جسے چاہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہے حکومت چھین لیتا ہے'' (آل عمران/۲۶)

دوسری جانب انکا کردار ہر طرح کے جرم و جنایت سے آلودہ تھا۔ یہ گندگی انکے خون میں، رگ و پے میں اس حد تک سرایت کر چکی تھی کہ اسکے اثرات کو چھپانا انکے لئے ممکن نہیں تھا یہ لوگ ہمہ وقت غیر صالح، غیر شرعی اور غیر اسلامی افعال و اعمال کے مرتکب ہوتے تھے اپنے ان عیوب کی پردہ پوشی کرنے اور لوگوں کو بے وقوف بنانے کے لئے یہ اپنے اعمال کی مختلف توجیہات پیش کرتے تھے، کبھی اس کیلئے مسئلہ جبر سے مدد لیتے تھے کہ خدا نے ہم سے خود یہ فعل انجام دلوایا ہے، اس طرح مسئلہ جبریہ کو فروغ ملا یعنی بندہ اپنے فعل میں مجبور محض ہے، جو کچھ خدا چاہتا ہے جبراً اسکو وہی عمل انجام دینا پڑتا ہے بعد میں یہی فکر ایک مدرسہ بن کر ابھری، اس فکر

کو ''توحید خالص'' یا ''تنزیہ خالص'' کا لقب دیا گیا عقیدہ ''جبریہ'' کے ردعمل کے طور پر ایک اور نظریہ وجود میں آیا جس کے تحت خدا کچھ نہیں کرتا، سب کچھ بندے کے اختیار میں ہے، اس سلسلے میں خدا کا کوئی کردار ہی نہیں جس سے نظریۂ ''تفویض'' پیدا ہو گیا ان دونوں منحرف عقیدے سے نجات کی خاطر نظریۂ ''اعتدال امر بین الامرین'' پیدا ہو گیا جسے ''عدلیہ'' بھی کہتے ہیں یہاں سے اہل تشیع نے عدالت کو اصول دین میں شامل کیا ہے اور ماہرینِ علماءِ عقائد نے احتیاط کی راہ کو اپناتے ہوئے اسے اصولِ مذہب شیعہ قرار دیا ہے جسے اب اصول میں شمار کریں یا اصول مذہب میں یا خارج رکھیں کوئی بھی خدا پرست، توحید خداوندی کے قائل خدا کو ظالم، ناقص قرار نہیں دیتے۔

اس کے علاوہ حکام نے اپنے جرم و جنایت کی ایک اور توجیہ پیش کرنے کے لئے انبیاء کرام کو قصوروار، خطاکار اور گناہوں کا مرتکب قرار دینے کی کوشش کی، اس سلسلے میں انہوں نے بعض آیات قرآنی کے ظاہری معنی کو سیاق و سباق سے کاٹ کر پیش کیا تا کہ انبیاء کو مخدوش قرار دینے کے بعد انکی اپنی غلطیوں کا جواز پیدا ہو سکے، اس طرح عصمت پر بحث عقائد کا ایک باقاعدہ موضوع قرار پایا یہاں سے علماءِ اعتقاد نے ''بابِ اعتقاد'' میں ایک مستقل باب ''عصمت انبیاء'' کے نام سے کھولا ہے۔

تعداد انبیاء عقل و نقل کی روشنی میں

۱۔ قرآن کریم میں تعداد انبیاء کے بارے میں دو نکات بیان فرمائے گئے ہیں۔

☆ خود خدا سورۂ غافر آیت ۷۸ اور سورہ نساء آیت ۱۶۴ میں فرماتے ہیں کہ انبیاء میں سے بعض کا ہم نے ذکر کیا ہے اور بعض کو ہم نے بیان نہیں کیا ہے:

﴿ولقد ارسلنا رسلاً من قبلك منهم من قصصنا عليك ومنهم من لم نقصص عليك﴾ ''اور بتحقیق ہم نے آپ سے پہلے بہت سے رسول بھیجے ہیں ان میں سے

بعض کے حالات ہم نے آپ سے بیان کیے ہی اور بعض کے حالات آپ سے بیان نہیں کیے'' (غافر/۷۸)﴿ورسلاً قد قصصنهم عليك من قبل ورسلاً لم نقصصهم عليك﴾ ''ان رسولوں پر (وحی بھیجی) جن کے حالات کا ذکر ہم پہلے آپ سے کر چکے ہیں اور ان رسولوں پر بھی جن کے حالات کا ذکر ہم نے آپ سے نہیں کیا'' (نساء/۱۶۴)اس سے بھی مذکورہ تعداد کے ضعف کی تائید ہوتی ہے جب خدا نے خود بیان نہیں کیا تو دوسروں کو کیسے پتہ چلا اور ان اسناد پر کیسے بھروسہ کیا جا سکتا ہے؟۔

☆ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جب خدا نے یہ فرمایا ہے کہ اس بعض کا ذکر کیا ہے اور بعض کا نہیں تو ذکر کئے جانے والے انبیاء کی تعداد اور ذکر نہ کئے جانے والے انبیاء کی تعداد میں عقل کی رو سے کوئی تناسب ہونا چاہئے، ظاہر ہے کہ ذکر کیا جانا، نہ ذکر کئے جانے کے مقابل میں اہمیت رکھتا ہے۔ جن بعض انبیاء کا ذکر ناموں کے ساتھ یا اشاروں کنایوں میں قرآن کریم میں ملتا ہے، ان سب کی تعداد کسی طور ۴۰ تک نہیں ہے جبکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار کا بیان تو اس تعداد کے مقابل کوئی تناسب ہی نہیں رکھتا، ان بعض نبیوں کی تعداد کو بھی کہ جنہیں خدا نے بیان نہیں کیا، ان بعض بیان کردہ نبیوں کی تعداد کے تناسب سے ہی ہونا چاہئے۔

احکام عقلی اور تقاضائے عقل، زمان و مکان کی حد بندی سے باہر ہیں اس تقاضے کے تحت علمائے اعتقاد کی بیان کردہ انبیاء کی تعداد، خدا کی جانب سے مبعوث تعداد کی نسبت کئی گنا غیر متناسب معلوم ہوتی ہے، مثلاً خدا نے حضرت یونس علیہ السلام کو ایک لاکھ یا اس سے زائد انسانوں کی طرف مبعوث کیا، تو یہ ایک مقدار بنتی ہے پھر چھ کھرب انسانوں کیلئے کتنے نبی ہونے چاہییں؟ لہذا فلسفہ اور ضرورت بعثت انبیاء سے متعلق بحثوں میں جو دلائل ذکر کئے جاتے ہیں وہ کسی تعداد کو بھی قبول نہیں کرتے کیونکہ بشر ہمیشہ اس دلیل کے تحت بعثِ انبیاء کا محتاج اور نیاز مند رہتا ہے۔

آیات قرآنی

خداوند عالم نے کثیر آیات میں بیان فرمایا کہ ہم نے ہر قوم میں ایک حجت، دلیل، نبی اور گواہ کو بھیجا ہے جیسا کہ درج ذیل آیات میں ذکر ہوا ہے:

۱۔ ''اس وقت کیا ہوگا جب ہم ہر امت کو اس کے گواہ کے ساتھ بلائیں گے اور پیغمبر کو ان سب کا گواہ بنائیں گے'' (نساء/۴۱)

۲۔ ''پھر ہم نے ان رسولوں کے بعد فرعون اور اسکی جماعت کی طرف موسیٰ اور ہارون کو اپنی نشانیاں دے کر بھیجا......'' (یونس/۷۵)

۳۔ ''اور یقیناً ہم نے ہر امت میں ایک رسول بھیجا ہے کہ تم لوگ اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت سے اجتناب کرو'' (نحل/۳۶)

۴۔ ''اس کے بعد ہم نے مسلسل رسول بھیجے اور جب کسی امت کے پاس کوئی رسول آیا تو اس نے رسول کی تکذیب کی'' (مومنون/۴۴)

۵۔ ''ہم نے آپ کو حق کے ساتھ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے اور کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی ڈرانے والا نہ گزرا ہو'' (فاطر/۲۴)

۶۔ ''ان سے پہلے بھی نوح کی قوم اور اس کے بعد والے گروہوں نے رسولوں کی تکذیب کی ہے اور ہر امت نے اپنے رسول کے بارے میں یہ ارادہ کیا ہے کہ اسے گرفتار کر لیں'' (غافر/۵)

۷۔ ''اور آپ ہر قوم کو گھٹنے کے بل بیٹھا ہوا دیکھیں گے اور سب کو ان کے نامۂ اعمال کی طرف بلایا جائیگا کہ آج تمہارے اعمال کا بدلہ دیا جائے گا'' (جاثیہ/۲۸)

۸۔ ''ہم نے تم سے پہلے والی امتوں کی طرف بھی رسول بھیجے ہیں'' (انعام/۴۲)

۹۔ ''اللہ کی اپنی قسم ہے کہ ہم نے تم سے پہلے مختلف قوموں کی طرف رسول بھیجے تو شیطان نے ان کے کاروبار کو ان کیلئے آراستہ کر دیا'' (نحل/۶۳)

۱۰۔ ''اور اگر تم تکذیب کرو گے تو تم سے پہلے بہت سی قومیں یہ کام کر چکی ہیں اور رسول کی ذمہ

داری تو صرف واضح طور پر پیغام کو پہنچا دینا ہے'' (عنکبوت/۱۸)

۱۱۔ ''اور ہم تو اس وقت تک عذاب کرنے والے نہیں ہیں جب تک کوئی رسول نہ بھیج دیں'' (اسراء/۱۵)

۱۲۔ ''قیامت کا دن وہ ہوگا جب ہم ہر گروہ انسانی کو اس کے پیشوا کے ساتھ بلائیں گے'' (اسراء/۷۱)

۱۳۔ ''کیا انہیں اس بات نے رہنمائی نہیں دی کہ ہم نے ان سے پہلے کتنی نسلوں کو ہلاک کر دیا جو اپنے علاقے میں اطمینان سے چل پھر رہے تھے۔ اس میں صاحبان عقل کیلئے بڑی نشانیاں ہیں'' (طٰہٰ/۱۲۸)

۱۴۔ ''اور اگر ایسا نہ ہوتا کہ جب ان پر گزشتہ اعمال کی بناء پر کوئی مصیبت نازل ہوتی تو یہی کہتے کہ پروردگار تو نے ہماری طرف کوئی رسول کیوں نہیں بھیجا کہ ہم تیری نشانیوں کی پیروی کرتے اور صاحبان ایمان میں شامل ہو جاتے'' (قصص/۴۷)

ان تمام آیات کے تحت خداوند متعال نے ہر زمانے میں اور ہر مکان میں موجود قوم کیلئے اپنی طرف سے حجت، نبی اور گواہ بھیجا ہے۔ یہ بات بھی تعداد انبیاء کی اس سند کو کمزور کرتی ہے۔ جسے علمائے اعتقاد بتاتے ہیں، ان آیات کریمہ سے ماخوذ نتیجہ یہ ہے کہ خداوند متعال انسان اور بشر کو بندۂ خدا ہونے اور اس کی تابع ہونے کے بارے میں دلیل و حجت دیئے بغیر انھیں عذاب و سزا میں مبتلا نہیں کرتے یہ بات اپنی جگہ منطقی ہے ورنہ اصطلاح اصولی کے تحت ''قبح عقاب بلا بیان'' لازم آئے گا جو اپنی جگہ باطل ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کر سکتے ہیں کہ وہ حجت ہمیشہ معصوم ہی ہوتا ہے، اگر ایسا فرض کریں گے تو طول زمان و مکان میں جہاں کسی نبی کی بعثت اور آمد ثابت نہیں ان کیلئے عذاب اور سزا ثابت کرنا مشکل ہوگا لہٰذا حجتِ خدا کو دو مرحلوں میں تقسیم کرنا پڑے گا ایک حجت معصوم منتخب الٰہی ہو اور دوسرا وہ حجت جو ان انبیاء کی نمائندگی کرتے ہوئے ہدایت اور رہبری

کرتے ہیں وہ خدا کی طرف سے خلق خدا کو خبر دیتے ہیں جب تک خلق خدا عقل و منطق سے ان
ہادیان ورہبران ونمایندگان انبیاء کی دعوت کو مسترد نہیں کریں گے حجت ان پر تمام ہوگا، خدا کی
طرف سے حجت کی ضرورت نزول شریعت کیلئے ہیں نزول شریعت کے بعد فروع شریعت میں انبیاء
' آئمہ' علماء خدا کے درگاہ اور مخلوق کے سامنے ہدایت اور رہبری کیلئے ذمہ دار ہیں گرچہ فضیلت
اور برتری میں وہ ذوات علماء سے بلند و برتر اور مقدم ہیں۔

حضرت آدم علیہ السلام

حضرت آدم علیہ السلام

آدم کو آدم کہنے کے بارے میں علماء اور ماہرین لغت نے چند توجیہ پیش کی ہیں:

۱۔ بعض نے کہا ہے آدم کا رنگ گندمی تھا چونکہ آپ مٹی * سے بنے تھے۔

۲۔ آدم مخلوط قسم کی مٹی سے بنے ہیں:

[ثم جمع سبحانه من حزن الارض وسهلها،وعذبها وسبخها،تربةً سنها[سناها]بالماء حتى خلصت، ولا طلها بالبلة حتى لزبت،فجبل منها صورةً ذات احناءٍ ووصولٍ، اعضاءٍ وفصولٍ،احمدها حتى استمسكت ، واصلدها حتى [فتمثلت]انساناًذااذهانٍ يجيلها،وفكرٍيتصرف بها،وجوارح يختدمها،وادواتٍ يقلبها،ومعرفةٍ يفرق بها بين الحق والباطل،والاذواق والمشام،والالوان والاجناس،معجوناًبطينة الالوان المختلفة،والاشباه المؤتلفة[المتفقة]والاضدادالمتعادية،والاخلاط المتباينة،من الحروالبرد، والبلة والجمود] ''اس کے بعد پروردگار نے زمین کے سخت و نرم اور شور و شیرین حصوں سے خاک کو جمع کیا اور اسے پانی سے اس قدر بھگویا کہ بالکل خالص ہو گئی اور پھر تری میں اس قدر گوندھا کہ لیسدار بن گئی اور اس سے ایک ایسی صورت بنائی جس میں موڑ بھی تھے اور جوڑ بھی اعضاء بھی تھے اور جوڑ بند بھی پھر اسے اس قدر سکھایا کہ مضبوط ہو گئی اور اس قدر سخت کیا کہ کھنکھنانے لگی اور یہ صورت حال ایک وقت معین اور مدت خاص تک برقرار رہی جس کے بعد اس میں مالک نے اپنی روح پھونک دی اور اسے ایسا انسان بنادیا جس میں ذہن کی جولانیاں بھی تھیں اور فکر کے تصرفات بھی کام

کرنے والے اعضاء وجوارح بھی تھے حرکت کرنے والے ادوات وآلات بھی حق وباطل میں فرق کرنے والی معرفت بھی تھی اور مختلف ذائقوں' خوشبوؤں' رنگ وروغن میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی اسے مختلف قسم کی مٹی سے بنایا گیا ہے جس میں موافق اجزاء بھی پائے جاتے تھے اور متضاد عناصر بھی اور گرمی' سردی' تری' خشکی جیسے کیفیات بھی'' (خطبہ/۱، جوادی، ص ۳۱)

۳۔ آدم ادام سے ہے اور ادام سالن کو کہتے ہیں جو روٹی کے ساتھ کھایا جاتا ہے چونکہ آدم روح اور مٹی سے مخلوط مخلوق ہے۔

۴۔ آدم کا معنی موافقت' ملائمت اور مصالحت کے ہیں جس طرح انسان ایک دوسرے سے کہتے ہیں ''ادام اللہ بینھم '' خدا ان کے درمیان اصلاح کرے یا خدا آپکی صلاح کرے۔ جس طرح انسان کیلئے کہتے ہیں کہ انسان ''انس'' سے ہیں ۔لفظ آدم قرآن میں پچیس (۲۵) بار تکرار ہوا ہے۔

اکثر و بیشتر علماء لغت اور مفسرین کرام نے کلمہ آدم کو ایک فرد سے مختص کیا ہے علوم عربیہ میں جسے ''علم شخصی'' کہا جاتا ہے اس کے بالمقابل بعض علماء نے اسے ایک نوع مخلوق قرار دیا ہے یعنی یہ تمام انسانوں کا نام ہے اس نظریہ کے حامی افراد اپنے مدعا کی دلیل میں سورۂ بقرہ کی آیت ۳۰ کا حوالہ دیتے ہیں، جس میں اللہ تبارک وتعالی نے فرمایا ہے، میں زمین میں اپنا خلیفہ بنانے والا ہوں اس آیت میں خداوند عالم نے تمام انسانوں کو خلیفہ قرار دیا ہے گویا یہاں خلیفہ سے مراد پوری نوع انسانی ہے کیونکہ ملائکہ نے اس خبر سے نوع ہی مراد لیتے ہوئے کہا تھا: اے باری تعالی! کیا تو انھیں خلیفہ بنائے گا جو زمین میں فساد اور خونریزی کرتے پھریں گے کیونکہ فساد اور خونریزی فرد واحد سے عمل میں نہیں آتی بلکہ یہ ہمیشہ گروہ سے پیدا ہوتی ہے اس لئے اس نظریہ کے حامی علماء نے آدم سے مراد نوع انسانی کو لیا ہے اگر ہم اس خلافت آدم ''علم شخصی'' سے مختص کریں تو اسکے ثبوت کیلئے خداوند

متعال نے سورۂ بقرہ آیت ۳۵ میں آدم سے فرمایا کہ تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو جہاں چاہیں جائیں لیکن اس درخت کے قریب نہ جائیں:

﴿وقلنایاادم اسکن انت وزوجك الجنة و کلامنهارغدًاحیث شئتماولاتقرباهٰذه الشجرة﴾ ''اور ہم نے کہا: اے آدم! تم اور تمہاری زوجہ جنت میں قیام کرو اور اس میں امن وسکون کے ساتھ جہاں چاہو کھاؤ اور اس درخت کے قریب نہ جانا''

اور پھر اللہ تبارک نے سورۂ طٰہٰ کی آیت ۱۲۱ میں فرمایا آدم نے شیطان کی بات میں آ کر خدا کی عصیان ونافرمانی کی:

﴿وعصٰی ادم ربه فغوٰی﴾ ''اور آدم نے اپنے رب کے حکم میں کوتاہی کی تو غلطی میں رہ گئے'' خدا نے آدم کو مٹی سے خلق کیا جیسا قرآنِ کریم کے ان آیات میں آیا ہے:

﴿اناخلقنٰهم من طین لازبٍ﴾

''ہم نے انھیں لیس دار گارے سے پیدا کیا'' (صافات/۱۱) ﴿انی خالق بشرًامن طینٍ﴾ ''میں مٹی سے ایک بشر بنانے والا ہوں'' (ص/۷۱) سجدہ آیت ۷ تا ۹۔

اللہ نے مٹی سے حضرت آدم کے جسمانی ڈھانچے کی شکل وصورت بنانے کے بعد اس میں نفخ روح کیا حسب آیات قرآن آدم کی خلقت کے بعد حوا کو بھی خلق کیا گیا:

﴿الذی خلقکم نفس واحدةٍوخلق منهازوجهاوبث منها﴾ ''جس نے تمھیں ایک ذات سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا'' (آل عمران/۱) ﴿وهوالذی انشاکم من نفسٍ واحدةٍ﴾ ''اور وہی ہے جس نے تم سب کو ایک ہی ذات سے پیدا کیا'' (انعام/۹۹)

پھر خدا نے ان دونوں کی ازدواجی زندگی سے نسل انسانی کو پھیلایا جیسا کہ سورۂ حجرات آیت ۱۳ میں اسکا ذکر موجود ہے:

﴿انا خلقنکم من ذکر وانثیٰ﴾ ''ہم نے تمھیں ایک مرد اور عورت سے پیدا کیا''

ان دو نظریات میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا سر دست ہماری توانائی وقدرت سے باہر ہے ہم اس تفصیلی بحث میں وارد ہوئے بغیر حضرت آدمؑ سے متعلق چند مسائل پر بحث کرنے پر اکتفاء کریں گے، کیا آدم مقام نبوت پر فائز تھے، علماء و مفسرین اس سلسلے میں اختلاف نظر رکھتے ہیں۔

حضرت آدم صفی اللہ آیاتِ قرآنِ کریم میں:

سورہ	سورہ نمبر	آیت نمبر
بقرہ	۲	۳۱،۳۳،۳۴،۳۵،۳۷
آل عمران	۳	۳۳،۵۹
مائدہ	۵	۲۷
اعراف	۷	۱۱،۱۹،۲۶،۲۷،۳۱،۳۵،۱۷۲
اسراء	۱۷	۶۱،۷۰
کہف	۱۸	۵۰
مریم	۱۹	۵۸
طٰہٰ	۲۰	۱۱۵،۱۱۶،۱۱۷،۱۲۰،۱۲۱
یٰسین	۳۶	۶۰

آدم علیہ السلام اور نبوت

ارباب تاریخ ماہرین و محققین مذاہب و ادیان اور محققین قصصِ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے درمیان حضرت آدم علیہ السلام کے مقام و منصب کے بارے میں اختلاف نظر پایا جاتا ہے حضرت آدمؑ منصب نبوت پر فائز تھے یا نہیں اس اضطراب و اختلافِ فکری کی برگشت قرآن میں موجود تین قسم کی آیات کریمہ کی طرف ہوتی ہے:

(۱) **خلیفہ:** اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی خلقت سے پہلے ان کے مقام ومنصب کو خلافت سے یاد فرمایا ہے اور اسی خلافت ہی کی بنیاد پر وہ مسجودِ ملائکہ قرار پائے، خلافت ایک ایسا بلند و بالا مقام ہے جو اگر نبوت سے بالاتر نہ ہو تو شاید کم بھی نہیں ہوگا قرآنِ کریم کی آیات کی رُو سے خداوندِ متعال نے سلسلہ انبیاء میں سب سے پہلے حضرت آدمؑ کو منتخب کیا، اسی طرح انکے طلب استغفار کے بعد انکے مصطفیٰ ہونے کا ذکر ہے یہ آیت انسان کو اس یقین کی منزل سے قریب کرتی ہے کہ آدمؑ نبوت کے درجے پر فائز تھے ورنہ وہ ان القابات سے یاد نہ فرمائے جاتے، لیکن ان آیات میں آدمؑ کے مقام ومرتبہ کا تو ذکر ہے لیکن ان کی نبوت کے بارے میں صریح احکامات موجود نہیں ہیں۔

(۲) حضرت آدم علیہ السلام کو قرآنِ کریم کی متعدد آیات میں یاد کرنے کے باوجود کسی بھی جگہ انھیں بحیثیت نبی یاد نہیں کیا گیا وہ ذاتِ باری تعالیٰ جو ہر قسم کی بھول ونسیان سے پاک ومنزہ ہے وہ تکرار سے اپنے کسی بندے کا ذکر کرے لیکن ایک دفعہ بھی نبوت کے حوالے سے یاد نہ کرے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ شاید آدمؑ کو یہ مقام نہ ملا ہو اس کی تائید میں وہ آیت کریمہ بھی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ سلسلہ بعثتِ انبیاءؑ کا آغاز حضرت نوحؑ سے کیا گیا ہے ۔جس سے یہ تصور اخذ کیا جاتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام نہ تو مقام ومرتبہ نبوت پر فائز تھے اور نہ ہی شریعت جیسے آئین ودستور کے حامل تھے۔

(۳) نبی کی تعریف میں بیان کیا جاتا ہے، نبی خداوندِ عالم سے بغیر کسی واسطہ بشر کے ہدایت ورہنمائی لیتا ہے حضرت آدمؑ نے اللہ تعالیٰ سے امر بھی لئے اور نواہی بھی ۔انھیں میں کوتاہی کی وجہ سے انھیں بہشت سے نکلنا پڑا، آدم علیہ السلام نے یہ اوامر ونواہی کسی انسان کے توسط سے نہیں لئے ،یہ یا تو خدا نے ان کے دل پر القا کیے یا کسی فرشتہ کے ذریعے ان تک پہنچے کیونکہ وہاں کوئی بشر نہیں تھا جو واسطہ بن جاتا اس حوالے سے ان پر نبی کی تعریف صادق آتی ہے لہٰذا حضرت آدم علیہ السلام

یقیناً نبوت کے مقام پر فائز تھے گرچہ رسالت و شریعت کے حامل نہ تھے۔ قارئین کرام یہ تھے حضرت آدم علیہ السلام کی نبوت و رسالت کے بارے میں علماء کرام کے آراء و نظریات۔

ہماری علمی و فکری حیثیت اتنی نہیں کہ ان میں سے کسی ایک رائے کو ترجیح دیں اور نہ ہمیں قرآن سے ایسی کوئی آیت ملی ہے کہ جس کے ذریعے ہم ان میں سے کسی ایک نظریے پر ایمان کو ضروری قرار دے دیں جبکہ یہاں کسی ایک نظریے پر رائے قائم کرنا دین و شریعت کے حوالے سے ناگزیر ہے ہم اتنا مانتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے مصطفیٰ و منتخب بندے تھے۔ جن شرائط کا حامل ہونا ایک نبی کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے، آیا آدمؑ کیلئے بھی ان شرائط کا حامل ہونا ضروری ہے یا نہیں یہ نکتہ بھی اپنی جگہ حالتِ تردد میں باقی ہے نہ تو اس سے کوئی مثبت نتیجہ اخذ ہوتا ہے اور نہ ہی منفی۔

جن علماء و مفسرین نے حضرت آدمؑ کو خدا کا ایک منتخب بندہ قرار دیا لیکن ان کے دوش کو بار نبوت سے خالی دکھایا ہے ان کا کہنا ہے کہ ابتدائی دور میں خدا نے بشر کو اکی فطرت سلیم پر چھوڑا تا کہ وہ انتہائی سادہ زندگی گزارے اس نظریے کے حامی افراد سورۂ بقرہ کی آیت نمبر ۲۱۳ اور سورۂ یونس ۱۹ سے استدلال کرتے ہیں۔ اس مدعا کی تائید میں انھوں نے امام محمد باقر علیہ السلام سے ایک روایت نقل کی ہے جسے صاحبِ مجمع البیان نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے اس روایت کے تحت امامؑ فرماتے ہیں حضرت نوحؑ سے پہلے لوگ فطرت کے راستے پر گامزن تھے انہیں نہ تو ہدایت یافتہ کہا جا سکتا تھا اور نہ ہی گمراہ اس کے بعد خدا نے بعثت انبیاء کا سلسلہ شروع کیا اسی طرح نہج البلاغہ کے پہلے خطبہ میں حضرت امیرؑ فرماتے ہیں خدا نے آدم کے فرزندوں سے انبیاء کا انتخاب کیا اسی طرح سورۂ شوریٰ کی آیت ۱۳ سے اس موقف کو تقویت ملتی ہے:

﴿شرع لکم من الدین ما وصّی به نوحًا﴾ ''اس نے تمہارے لئے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا''

اس موقف کو اپنانے سے آدم سے متعلق بہت سے اشکالات خود بخود رفع ہو جائیں گے جیسے

آدم کے شجرۂ ممنوعہ سے تناول کے نتیجہ میں عصمت آدم کے بارے میں پیدا ہونے والے اشکال ،بصورت دیگر ہمیں عصمت آدم کو متزلزل کرنے والی صریح آیات کے بارے میں کوئی ایسا راستہ تلاش کرنا پڑے گا جس سے باب اعتقاد میں ضرورت انبیاء کے بارے میں عقائد مخدوش نہ ہونے پائیں اور آیات میں وارد صریح کلمات سے بغیر کسی قرینہ لفظی وعقلی کے ایک معنی اخذ کیے جا سکیں دوسری بحث جو یہاں زیادہ مناسب ہے وہ بحث ابلیس ہے آدم کو متعین کردہ حدود وقیود سے خارج کرنے والی اور انھیں بہت سے مسائل اور پریشانیوں میں گرفتار کرنے والی اس قدرت کا کبھی تو خدا نے ابلیس کے نام سے ذکر کیا ہے اور کبھی شیطان کے نام سے ۔اس طاقت وقدرت کا مختلف شکل و صورت اور ناموں سے دیگر انبیاء کو بھی سامنا کرنا پڑا ہے۔

قصہ حضرت آدمؑ چند عناصر سے مرکب ہے:

۱۔ خداوند متعال جس نے حضرت آدم کی تخلیق کا اعلان فرمایا۔

۲۔ مخلوق ترابی۔

۳۔ ملائکہ جنھوں نے اس نئی مخلوق کے بارے میں خدا سے خدشات کا اظہار کیا۔

۴۔ ابلیس جو کہ حسب قرآن کریم جنات سے تھا اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔

۱۔ **مَلَک** :علماء لغت کہتے ہیں ملک مادۂ الوک سے ہے الوک یعنی صاحب رسالت بعد میں اسے جزء کلمہ قرار دیا اور بعض نے زائد۔بہر حال ملک ''فرشتہ'' کو کہتے ہیں ملک کا ذکر قرآن کریم میں ۸۰ بار آیا ہے ملک کے معنی رسالت کے ہیں یعنی وہ خدا کی طرف سے خاص احکامات وپیغامات کا حامل ہے چنانچہ سورۂ حج/۷۵ میں خدا نے فرمایا کہ خدا اپنے پیغام رسائی کیلئے ملائکہ اور انسانوں دونوں سے نمائندے انتخاب کیے ہیں:

﴿اللہ یصطفی من الملئکۃ رسلاً و من الناس﴾ ''اللہ فرشتوں اور انسانوں میں سے

پیغام پہنچانے والے منتخب کرتا ہے"

حقیقت ملائکہ

اکثر علماء کا عقیدہ ہے ملائکہ جسم نورانی کے حامل ہیں، اس کے علاوہ یہ مختلف شکلوں میں تبدیل ہونے کی صلاحیت رکھتے ہیں جیسا کہ قصہ حضرت ابراہیم ہود/ ۶۹

ملائکہ کی صفات:

۱۔ ملائکہ اللہ تعالیٰ کے پیغام رساں ہیں:

﴿جاعل الملئکۃ رسلاً﴾ "نیز فرشتوں کو پیغام رساں بنانے والا ہے" (فاطر/۱)

۲۔ ملائکہ خداوند عالم کے مطیع و فرمانبردار ہیں:

﴿ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك﴾ "جبکہ ہم تیری حمد و ثنا کی تسبیح اور تیری پاکیزگی کا ورد کرتے رہتے ہیں" (بقرہ/۳۰) صافات ۱۶۵، ۱۶۶۔

۳۔ اللہ تبارک تعالیٰ کے قریب ہیں:

﴿وله من فی السمٰوٰت والارض ومن عنده لایستکبرون﴾

"اور آسمانوں اور زمین میں موجود مخلوقات اسی کی ہیں اور جو اس کے پاس ہیں وہ اللہ کی عبادت سے نہ تو تکبر کرتے ہیں" (انبیاء/۱۹)

۴۔ امر خدا کے علاوہ کوئی کام نہیں کرتے:

﴿وما نتنزل الا بامر ربك﴾ "اور ہم (فرشتے) آپ کے پروردگار کے حکم کے بغیر نہیں اتر سکتے" (مریم/۶۴) انبیاء/۲۷۔

۵۔ صاحبان قدرت و سلطنت ہیں:

﴿والملك علیٰ ارجائها ویحمل عرش ربك فوقهم یومئذ ثمٰنیة﴾ "اور فرشتے اس کے کناروں پر ہونگے اور اس دن آٹھ فرشتے آپ کے رب کا عرش ان سب کے

اوپر اٹھائے ہوں گے'' (حاقہ/۱۷) بقرہ ۲۵۵۔

۶۔ اللہ تبارک تعالیٰ سے خوف کھاتے ہیں اور لغزشوں سے ڈرتے ہیں:

﴿یخافون ربهم من فوقهم﴾ ''اور اپنے رب سے جو ان پر بالادستی رکھتا ہے ڈرتے ہیں'' (نحل/۵۰) انبیاء ۲۸، سباء ۲۳۔

ملائکہ انبیاء کو پیغام دیتے ہیں اور انبیاء لوگوں تک پہنچاتے ہیں انکی خلقت کس چیز سے ہے اس کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا ہے قرآن کریم میں ملائکہ کے جن وظائف و ذمہ داریوں کا ذکر آیا ہے وہ ان آیات میں آیا ہے:

عصمت ملائکہ

﴿ملائکة غلاظ شدادلا یعصون الله ماامرهم ویفعلون مایؤمرون﴾ ''اس پر تندخو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انھیں ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں'' (تحریم/۶)

ملائکہ الٰہی خداوند متعال کی عبادت و بندگی میں معصوم ہیں:

﴿وقالوا اتخذوا الرحمٰن ولدًا سبحنه بل عباد مکرمون۔ لا یسبقونه بالقول وهم بامره یعملون﴾ ''اور وہ کہتے ہیں: اللہ نے بیٹا بنایا ہے وہ پاک ہے (ایسی باتوں سے) بلکہ یہ تو اللہ کے محترم بندے ہیں۔ وہ تو اللہ (کے حکم) سے پہلے بات (بھی) نہیں کرتے اور اسی کے حکم کی تعمیل کرتے ہیں'' (انبیاء/۲۶، ۲۷) ﴿علیها ملٰئکة غلاظ شدادلا یعصون الله ماامرهم ویفعلون مایؤمرون﴾ ''اس پر تندخو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں جو اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے اور جو حکم انھیں ملتا ہے اسے بجالاتے ہیں'' (تحریم/۶)

[ثم فتق ما بین السمٰوات العلا، فملاهن اطوارًا من ملائکة، منهم

سجود لا یرکعون، ورکوع لا ینتصبون، وصافون لا یتزایلون ،ومسبحون لا یسئامون، لا یغشاھم نوم العیون، ولا سھو العقول، ولا فترۃ الابدان، ولا غفلۃ النسیان۔ ومنھم امناء علی وحیہ، والسنۃ الی رسلہ ،ومختلفون [مترددون] بقائیہ وامرہ، ومنھم الحفظۃ لعبادہ، والسدنۃ [السندۃ] لابواب جنانہ۔ ومنھم الثابتہ فی الارضین السفلی اقدامھم ،والمارقۃ من السمآء العلیا اعناقھم ، والخارجۃ من الاقطار ارکانھم ، والمناسبۃ لقوائم العرش اکتافھم ۔ ناکسۃ دونہ ابصارھم ، متلفعون تحیہ باجنحتھم ، مضروبۃٌ بینھم وبین من دونھم حجب العزۃ، واستار القدرۃ۔ لا یتوھمون ربھم بالتصویر، ولا یجرون علیہ صفات المصنوعین [المخلوقین] ولا یحدونہ بالاماکین، ولا یشیرون الیہ بالنظائر] ''پھر اس نے بلند ترین آسمانوں کے درمیان شگاف پیدا کیے اور انھیں طرح طرح کے فرشتوں سے بھر دیا جن میں سے بعض سجدہ میں ہیں تو رکوع کی نوبت نہیں آتی ہے اور بعض رکوع میں ہیں تو سر اٹھاتے ہیں اور بعض صف باندھے ہوئے ہیں تو اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتے ہیں بعض مشغول تسبیح ہیں تو خستہ حال نہیں ہوتے ہیں سب کے سب وہ ہیں کہ نہ ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ ہوتا ہے اور نہ عقلوں پر سہو و نسیان کا۔ نہ بدن میں سستی پیدا ہوتی ہے اور نہ دماغ میں نسیان کی غفلت۔

ان مین سے بعض کو وحی کا امین اور رسولوں کی طرف قدرت کی زبان بنایا گیا ہے جو اس کے فیصلوں اور احکام کو برابر لاتے رہتے ہیں اور کچھ اس کے بندوں کے محافظ اور جنت کے دروازوں کے دربان ہیں اور بعض وہ بھی ہیں جن کے قدم زمین کے آخری طبقہ میں ثابت ہیں اور گردنیں بلند ترین آسمانوں سے بھی باہر نکلی ہوئی ہیں ان کے اطراف بدن اقطار عالم سے وسیع تر ہیں اور ان کے کاندھے پایہ ہائے عرش کے

اٹھانے کے قابل ہیں ان کی نگاہیں عرش الٰہی کے سامنے جھکی ہوئی ہیں اور وہ اس کے نیچے پروں کو سمیٹے ہوئے ہیں ان کے اوپر دیگر مخلوقات کے درمیان عزت کے حجاب اور قدرت کے پردے حائل ہیں وہ اپنے پروردگار کے بارے میں شکل وصورت کا تصور بھی نہیں کرتے ہیں اور نہ اس کے حق میں مخلوقات کے صفات کو جاری کرتے ہیں وہ نہ اسے مکان میں محدود کرتے ہیں اور نہ اس کی طرف اشباہ ونظائر سے اشارہ کرتے ہیں"(خطبہ/۱)

ملائکہ مام کسی قسم کی سستی ونافرمانی سے محفوظ ہیں۔انسان کے عصیان ونافرمانی کی طرف مائل ہونے کی وجہ اس کی خواہشات جسمانی ونفسانی ہیں جبکہ ملائکہ اس سے محفوظ ہیں۔یہاں سے فطروس کے بارے میں جو کہا جاتا ہے کہ اس نے خدا کی نافرمانی کی تو خدا نے اس پر عذاب نازل کیا اس کے پر جل گئے وہ ایک جزیرے میں گر گیا اور امام حسینؑ کی ولادت باسعادت کے موقع پر جبرئیل امین خدا کی طرف سے تہنیت دینے آرہے تھے تو جبرئیل کا گزر اس جزیرے سے ہوا تو جبرئیل اسے پیغمبرؐ کی خدمت میں لے گئے اور اس کے پروں کو حضرت امام حسینؑ کے گھوارے سے مس کیا تو وہ صحت یاب ہو گئے اور جبرئیل امین کے ساتھ ملاء اعلیٰ کی طرف پرواز کر گئے۔یہ خود ساختہ واقعہ جعل کرنے والوں نے داستانوں اور کہانیوں کو بنیاد بناتے ہوئے قرآن وسنت سے دوری اختیار کی ہے۔

ہمارے ہاں فضائل آئمہ کے نام سے نقائص آئمہؑ اور توہین آئمہ کا ارتکاب کرنے کیلئے ایسی بہت سی احادیث اور واقعات فراوانی سے ملتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ مذہب ہر آئے دن عقلیت سے گر رہا ہے کیا یہ ممکن ہے جو ملائکہ حاملان عرش پر فائز ہوں وہ ایسی نافرمانی کریں اسی طرح ملائکہ کے پروں کا جو ذکر ہے وہ ان کے آسمان سے نیچے اترنے کے معنوں کے حوالے سے ہے نہ کہ وہ پرندوں جیسے پر رکھتے ہیں

اقسام ملائکہ:

ملائکہ اپنی ذمہ داریوں کے حوالے سے مختلف درجات اور مراتب کے حامل ہیں ہم ان کی چند اقسام ذیل میں پیش کرتے ہیں:

۱۔ بلند ترین درجے پر فائز ملائکہ جبرئیل امین ہے جبرائیلؑ تمام ملائکہ سے بلند مقام ومرتبہ کے حامل ہیں:

﴿نزل به الروح الامین۔علیٰ قلبك لتكون من المنذرین﴾ ''جسے روح الامین نے اتارا۔آپ کے قلب پر تاکہ آپ تنبیہ کرنے والوں میں سے ہوجائیں'' (شعراء/۱۹۳،۱۹۴)﴿انه لقول رسولٍ كريم﴾ ''کہ یقیناً یہ (قرآن) معزز فرستادہ کا قول ہے'' (تکویر/۱۹) بقرہ۹۸،تحریم۴،مائدہ۱۱۰،آل عمران۱۲۳پ

انہیں اکابروزعماملائکہ میں حضرت جبرائیل امین شامل ہیں

۲۔ اسرافیل اور میکائیل بڑے ملائکہ میں سے ہیں:

﴿ونفخ فی الصور فصعق من فی السمٰوٰت ومن فی الارض الامن شاء الله ثم نفخ فیه اخریٰ فاذاهم قیام ینظرون﴾ ''اور (جب) صور پھونکا جائے گا تو جو آسمانوں اور زمین میں ہیں سب بیہوش ہوجائیں گے مگر جنہیں اللہ چاہے پھر دوبارہ پھونکا جائے گا تو اتنے میں وہ سب کھڑے ہوکر دیکھنے لگیں گے'' (زمر/۶۸)﴿ویوم ینفخ فی الصور ففزع من فی السمٰوٰت ومن فی الارض الامن شاء الله و كل اتوه داخرین﴾ ''اور جس روز صور پھونکا جائے گا آسمانوں اور زمین کی تمام موجودات خوفزدہ ہوجائیں گے سوائے ان لوگوں کے جنہیں اللہ چاہے اور سب نہایت عاجزی کے ساتھ اس کے حضور میں پیش ہونگے'' (نمل/۸۷)

۳۔ عرش الٰہی کو اٹھانے والے ملائکہ سب سے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں:

﴿ویحمل عرش ربك فوقهم یومئذٍ ثمٰنیة﴾ ''اور اس دن آٹھ فرشتے آپ کے رب کا عرش ان سب کے اوپر اٹھائے ہونگے'' (حاقہ/۱۷) ﴿الذین یحملون العرش﴾ ''جو فرشتے عرش کو اٹھائے ہوئے ہیں'' (غافر/۷)

۴۔ ان کے بعد وہ فرشتے ہیں جو عرش کے گرد طواف کرتے ہیں:

﴿وتری الملٰئکة حآفین من حول العرش یسبحون بحمد ربهم﴾ ''اور آپ فرشتوں کو عرش کے گرد حلقہ باندھے ہوئے اپنے رب کی ثناء کے ساتھ تسبیح کرتے دیکھیں گے'' (زمر/۷۵)

۵۔ قرآن کریم میں جن ملائکہ کا چوتھے درجے پر ذکر ہوا ہے وہ خازن جنت ہیں، خازن جنت کا ذکر سورۂ رعد کی آیت ۲۳، ۲۴ میں ہے:

﴿جنٰت عدنٍ یدخلونها ومن صلح من اٰبآئهم وازواجهم وذریٰتهم والملٰئکة یدخلون علیهم من کل بابٍ۔ سلٰم علیکم بما صبرتم فنعم عقبی الدار﴾ ''ایسی دائمی جنتیں ہیں جن میں وہ خود بھی داخل ہونگے اور ان کے آباء اور بیویوں اور اولادمیں سے جو نیک ہونگے وہ بھی اور فرشتے ہر دروازے سے ان کے پاس آئیں گے (اور کہیں گے) تم پر سلامتی ہو یہ تمہارے صبر کا صلہ ہے پس عاقبت کا گھر کیا ہی عمدہ گھر ہے''

۶۔ خازن جہنم کا ذکر سورۂ تحریم کی آیت ۶ میں ہے:

﴿یاایها الذین اٰمنوا قوا انفسکم واهلیکم ناراً وقودها الناس والحجارة علیها ملٰئکة غلاظ شداد﴾ ''اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہونگے اس پر تندخو اور سخت مزاج فرشتے مقرر ہیں''

۷۔ انسانوں پر موکل فرشتے:

﴿له معقبت من بين يديه ومن خلفه يحفظونه من امر الله﴾ ''ہر شخص کے آگے اور پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے (پہرے دار) مقرر ہیں جو بحکم خدا اس کی حفاظت کرتے ہیں'' (رعد/۱۱) ق ۱۷،

۸۔ وہ ملائکہ جو اطراف عالم کے موکل ہیں:

﴿والصٰفٰت صفا۔فالزٰجرٰت زجرا۔فالتٰليٰت ذكرا﴾ ''قسم ہے قطار میں صف باندھنے والوں کی۔ پھر بطور کامل جھڑکی دینے والوں کی۔ پھر ذکر کی تلاوت کرنے والوں کی'' (صافات/۱تا۳)

۹۔ محافظین انسان:

﴿ويرسل عليكم حفظة﴾ ''اور تم پر نگہبانی کرنے والے بھیجتا ہے'' (انعام/۶۱)

﴿له معقبٰت من بين يديه ومن خلفه يحفظونه﴾ ''ہر شخص کے آگے پیچھے یکے بعد دیگرے آنے والے فرشتے (پہرے دار) مقرر ہیں'' (رعد/۱۱)

۱۰۔ وحی لانے والے:

﴿فنادته الملئكة وهو قائم يصلي في المحراب ان الله يبشرك بيحيى﴾

''چنانچہ جب وہ حجرہ عبادت میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے تو فرشتوں نے آواز دی :اللہ تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے'' (آل عمران/۳۹) ج/۵ے

۱۱۔ انسانوں کے اعمال نامہ لکھنے والے:

﴿اذ يتلقى المتلقيان عن اليمين وعن الشمال قعيد۔مايلفظ من قول الا لديه رقيب عتيد﴾ ''(انہیں وہ وقت یاد دلا دیں) جس وقت (اعمال کو) وصول کرنے والے دو (فرشتے) اس کی دائیں اور بائیں طرف بیٹھے وصول کرتے رہتے ہیں۔ (انسان) کوئی بات زبان سے نہیں نکالتا مگر یہ کہ اس کے پاس ایک نگران

تیار ہوتا ہے'' (ق/ ۱۷، ۱۸) ﴿قل اللہ اسرع مکراًان رسلنا یکتبون ماتمکرون﴾ '' کہہ دیجئے: اللہ کا حیلہ تم سے زیادہ تیز ہے بے شک ہمارے فرشتے تمہاری حیلہ بازیاں لکھ رہے ہیں'' (یونس/ ۲۱)

۱۲۔ انسانوں کو موت کا پیغام دینے کی ذمہ داری ملائکہ کے سپرد ہے:

﴿قل یتوفکم ملك الموت الذی وکل بکم﴾ '' کہہ دیجئے: موت کا فرشتہ جو تم پر مقرر کیا گیا ہے تمہاری روحیں قبض کرتا ہے'' (سجدہ/ ۱۱) نحل/ ۲۸

قصۂ حضرت آدم علیہ السلام میں تیسرا فریق ابلیس ہے چونکہ ابلیس حسب سورۂ کہف آیت ۵۰ مخلوق جن سے تعلق رکھتا تھا لہٰذا ہمیں یہاں ''جن'' سے متعلق بھی کچھ گفتگو کرنا ہوگی۔

جن:

''جن'' جسے فارسی میں پری کہتے ہیں اس کے بارے میں علماء کا کہنا ہے جن بھی ارواحِ مجرد کے مالک ہیں یہ عنصریات میں تصرف رکھتے ہیں۔ بعض فلاسفہ کا خیال ہے کہ جن ایک تصوراتی چیز ہے اور حقیقت میں ان کا کوئی وجود نہیں چنانچہ ابو علی سینا کی طرف نسبت دی گئی ہے کہ جن ایک حیوانِ ہوائی ہے اور یہ مختلف شکل اختیار کرتا ہے یہ شرحِ اسم ہے یعنی جن کی کوئی حقیقت نہیں ہے جبکہ اربابِ مذاہب اور ادیان کا عقیدہ ہے کہ جن ایک مخلوق ہے جو اس دنیا میں موجود ہیں انہیں ارواح ''سفلیہ'' کہتے ہیں جن بھی موجوداتِ ذی العقول ہیں اور خود کو مختلف شکلوں میں تبدیل کر سکتے ہیں، جن مادۂ جَن سے ہے جس کے معنی پوشیدہ کے ہیں یعنی جن آنکھوں سے نہیں دیکھے جا سکتے لہٰذا بعض افراد جن چیزوں کا سبب معلوم نہیں کر سکتے۔ یا معلوم نہیں ہو سکتا انہیں وہ جن کی طرف نسبت دے دیتے ہیں:

﴿وجعلوا اللہ شرکاء الجن وخلقھم﴾ ''اور ان لوگوں نے جنات کو اللہ کا شریک

بنایا حالانکہ اس نے انھیں پیدا کیا ہے“ (انعام/۱۰۰)

یہ جو کہا جاتا ہے جن وسوسہ ڈالتے ہیں، یہ بات صحیح نہیں کیونکہ اس کے صحیح ماننے سے دور لازم آئے گا کیونکہ انسانوں کو ورغلانے کے لئے شیطان کو پہلے خود معصیت کار ہونا چاہیے جس کیلیے خود شیطان کے لئے بھی وسوسہ درکار ہے تا کہ بعد میں وہ معصیت کا ارتکاب کرے۔ جب تک شیطان کے پاس معصیت نہ ہو، اس وقت تک وہ انسان کے اندر وسوسہ پیدا نہیں کر سکتا لہٰذا ماننا پڑے گا کہ کوئی گروہ ہے کہ جو خدا کی بندگی اور عبادت سے پہلے خود نکل چکا ہوگا جو بندگانِ خدا کو گمراہ کرتا ہے۔

کلمہ ”جن“ قرآنِ کریم میں بائیس بار تکرار ہوا ہے۔ قرآنِ کریم میں ”جن“ سے متعلق آیات سے علماءِ کرام نے مندرجہ ذیل نکات اخذ کیے ہیں:

۱۔ جن آگ سے بنے ہیں جیسا کہ سورہ حجر آیت ۲۷ اور سورہ رحمٰن کی آیت ۱۵ میں آیا ہے:

﴿والجآن خلقنٰه من قبل من نار السموم﴾ ”اور اس سے پہلے ہم لو (گرم ہوا) سے جنوں کو پیدا کر چکے تھے“ (حجر/۲۷) ﴿وخلق الجآن من مارجٍ من نارٍ﴾ ”اور جنات کو آگ کے شعلے سے پیدا کیا“ (رحمٰن/۱۵)

۲۔ جن اور انسان دونوں اس روئے زمین پر حسبِ تعبیر سورہ رحمٰن دو مخلوقات ہیں اور دونوں موردِ خطاب الٰہی ہیں۔

۳۔ جن انسانوں کی طرح خداوند عالم کی طرف سے مکلف بہ عبادت و بندگی ہیں:

﴿وما خلقت الجن والانس الالیعبدون﴾ ”اور میں نے جن وانس کو خلق نہیں کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں“ (ذاریات/۵۶)

۴۔ جنات میں بھی انسانوں کی طرح گناہگار اور کافر و مشرک ہیں ان میں بھی اہل جہنم ہیں:

﴿ولقد ذرانا لجهنم كثيراً من الجن والانس﴾ ”اور بتحقیق ہم نے جن وانس کی ایک

کثیر تعداد کو (گویا) جہنم ہی کیلئے پیدا کیا ہے" (اعراف/۱۷۹) ہود ۱۱۹، سجدہ ۱۳،

۵۔ جن بھی انسانوں کی طرح مرتے ہیں اور مرنے والوں کی جگہ نئے گروہ آتے رہتے ہیں:

﴿قال ادخلوا فی امم قد خلت من قبلکم من الجن والانس﴾

"اللہ فرمائے گا: تم لوگ جن وانس کی ان قوموں کے ہمراہ جہنم میں داخل ہو جاؤ جو تم سے پہلے جا چکی ہے" (اعراف/۳۸) فصلت ۲۵، احقاف ۱۸،

۶۔ جن انسانوں کو دیکھ سکتے ہیں لیکن انسان اُن کو نہیں دیکھتے:

﴿انه یرٰکم هو وقبیله من حیث لا ترونهم﴾

"بے شک شیطان اور ان کے رفیق کار تمہیں ایسی جگہ سے دیکھ رہے ہوتے ہیں جہاں سے انھیں تم نہیں دیکھ سکتے" (اعراف/۲۷)

۷۔ جن انسانوں کی طرح کام کرتے ہیں اور قدرت کے حامل ہیں:

﴿ومن الجن من یعمل بین یدیه باذن ربه﴾

"اور جنوں میں سے بعض ایسے تھے جو اپنے رب کی اجازت سے سلیمان کے آگے کام کرتے تھے" (سبا/۱۲) سبا ۱۳، نمل ۱۷ تا ۳۹۔

۸۔ جن شادی کرتے ہیں اور اسی طرح ان کی نسل پھیلتی ہے:

﴿کان من الجن ففسق عن امر ربه افتتخذونه وذریته اولیآء﴾ "وہ جنات میں سے تھا پس وہ اپنے رب کی اطاعت سے خارج ہو گیا تو کیا تم لوگ میرے سوا اسے اور اسکی نسل کو اپنا سرپرست بناؤ گے" (کہف/۵۰)

۹۔ جن پیغمبر اکرمؐ پر ایمان لائے:

﴿واذ صرفنا الیك نفراً من الجن یستمعون القرآن فلما حضروه قالوا انصتوا فلما قضی ولوا الیٰ قومهم منذرین......﴾

''اور (یاد کیجئے) جب ہم نے جنات کے ایک گروہ کو آپ کی طرف متوجہ کیا تاکہ قرآن سنیں، پس جب وہ رسول کے پاس حاضر ہوگئے تو (آپس میں) کہنے لگے: خاموش ہو جاؤ! جب تلاوت ختم ہوگئی تو وہ تنبیہ (ہدایت) کرنے اپنی قوم کی طرف واپس لوٹ گئے'' (احقاف/۲۹ تا ۳۱) جن ۱ تا ۵۔

۱۰۔ سورۂ رحمٰن میں اللہ تعالیٰ نے اکتیس بار جن وانس سے مشترکہ خطاب فرمایا ہے۔

۱۱۔ جنوں میں بھی مذکر و مونث ہوتے ہیں:

﴿سبحٰن الذی خلق الازواج کلها﴾ ''پاک ہے وہ ذات جس نے تمام جوڑے بنائے'' (یٰسین/۳۶) ﴿وانه کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوهم رهقا﴾ ''اور یہ کہ بعض انسان بعض جنات سے پناہ طلب کیا کرتے تھے جس سے جنات کی سرکشی مزید بڑھ گئی'' (جن/۶) ذاریات/۴۹۔

۱۲۔ جن جب چاہیں ایسی جسمانی شکل میں آسکتے ہیں کہ انسان انھیں دیکھ سکے:

﴿قال عفریت من الجن انا اٰتیك به قبل ان تقوم من مقامك وانی علیه لقوی امین﴾ ''جنوں میں سے ایک عیار نے کہا: میں اسے آپ کے پاس حاضر کردیتا ہوں قبل اس کے کہ آپ اپنی جگہ سے اٹھیں اور میں یہ کام انجام دینے کی طاقت رکھتا ہوں امین بھی ہوں'' (نمل/۳۹)

ابلیس: مادۂ بلس سے ہے یہ ابلاس سے لیا ہے اور ابلاس مایوس ہونے کو کہتے ہیں جیسا کہ سورۂ روم کی آیت ۱۲ میں آیا ہے کہ بروز قیامت جب گناہ گار اپنے گناہوں کے اسباب و وجوہات پیش کرنے سے قاصر ہو جائیں گے تو وہ مایوس ہو جائیں گے:

﴿ویوم تقوم الساعة یبلس المجرمون﴾ ''جس روز قیامت برپا ہوگی مجرمین ناامید ہوں گے''

راغب اصفہانی ابلاس کے معنوں میں لکھتے ہیں ان پریشان کن اور تکلیف دہ حالات کو ابلاس کہتے ہیں جو انسان کو سختی اور مشکلات و پریشانی کی صورت میں لاحق ہوتی ہے دکھی انسان اکثر و بیشتر خاموش رہتا ہے کیونکہ اسے کامیابی نظر نہیں آتی وہ ہمیشہ حیرت و پریشانی میں سرگرداں رہتا ہے:

﴿او تو االحذنهم بغتةً فاذاهم مبلسون﴾ ''تو ہم نے اچانک انھیں اپنی گرفت میں لے لیا پھر وہ مایوس ہو گئے'' (انعام/۴۴)

جو ابلیس حضرت آدم کے مقابلے میں آیا وہ ایک موجود زندہ اور باشعور لیکن نامرئی اور فریب کار تھا قرآن میں گیارہ جگہوں پر اسے ابلیس کے نام سے پکارا گیا ہے جبکہ باقی جگہوں پر اسے شیطان کہا گیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے ابلیس کسی فرد کا مخصوص نام ہے یا یہ اس کی صفت ہے جو اسکے نام گزاری کی وجہ بنی ہے بعض افراد کا کہنا ہے ابلیس اسکی صفت ہے جو اس کے نام پر غالب آئی ہے اور اسکا اصلی نام ازازیل ہے امام رضاؑ سے ایک روایت نقل ہوئی ہے جس کے تحت اس کا نام حارث تھا سورۂ کہف کی آیت ۵۰ کے مطابق ابلیس مخلوق جن سے تعلق رکھتا تھا: ﴿فسجدوا الاابلیس کان منالجن﴾ ''سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے وہ جنات میں سے تھا''

اور یہ موجود نامرئی اور خفیف ہونے میں ملائکہ سے قریب ہے اللہ تبارک تعالی نے جب آدم کو سجدہ کرنے کا حکم دیا تو یہ حکم عدولی کرنے کی وجہ سے خدا کی طرف سے فاسق اور راندہ درگاہ قرار پایا یہ تھیں شیطان کی شخصی صفات آیئے دیکھتے ہیں اس کی نوعی صفات کیا ہیں۔

شیاطین جن وانس مومن کے مقابل ضعیف ہیں:

شیطان انسان سے زیادہ طاقت ور نہیں بعض انسان اپنے نفس امارہ و خواہشات کی پیروی، ضلالت و گمراہی اور جرم و جنایت میں خود کو شیطان کے سامنے بے بس پیش کرتے ہیں جبکہ خداوند متعال نے شیطان کو ارادہ انسان کے مقابلے میں ضعیف و ناتوں کہا ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات

سے واضح ہوتا ہے:

﴿وما کان لی علیکم من سلطٰنٍ الا دعوتکم﴾ ''میرا تم پر کوئی زور نہیں چلتا تھا مگر یہ کہ میں نے تمہیں صرف دعوت دی اور تم نے میرا کہنا مان لیا'' (ابراہیم/۲۲)

حجر ۴۲، نحل ۹۹ اور ۱۰۰، اسرا ۶۵، سبا ۲۱، صافات ۳۰، حاقہ ۲۹، نساء ۷۶۔

آدم نمونہ کامل انسان:

یہ مخلوق تعدد کی مظہر ہے اس میں برائیوں، خرابیوں اور فساد کا عنصر پوشیدہ ہے جیسا کہ ملائکہ نے پیش گوئی کی تھی اس میں بے شمار مصالح، حکمتیں اور راز پوشیدہ ہیں حق سبحانہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے اگر ہم اس تناظر میں حضرت آدم کی حیات کا مطالعہ کریں تو شاید ہمیں کوئی مشکل پیش نہ آئے بصورت دیگر ہر گھڑی اشکال در اشکال کا سامنا کرنا پڑے گا حق سبحانہ تعالیٰ نے ایک دفعہ آدم کے بارے میں فرمایا:

﴿انی خالق بشر من طین﴾ ''میں کیچڑ سے ایک بشر بنانے والا ہوں''

لہٰذا بشر ہونے کے ناطے اس کے اپنے تقاضے اور ضروریات ہیں جیسا کہ اللہ رب العزت ایک جگہ فرماتا ہے ہم نے کوئی جسد اور ڈھانچہ نہیں بنایا جو کھانا نہ کھاتا ہو بشر ہونے کا مطلب یہ ایک ایسی مخلوق ہے جس کی اپنی ضروریات ہیں ان ضروریات میں مکان کھانا پینا اور شادی وغیرہ شامل ہیں اللہ تبارک تعالیٰ نے آدم صفی اللہ کے بشر ہونے کے ناطے ان کی ان تینوں ضروریات کو پورا کیا:

اہداف خلقت آدم:

حضرت آدم صفی اللہ کی تخلیق سے پہلے خداوند متعال نے ملائکہ الٰہی کو خبر دی ہے کہ ہم زمین میں خلیفہ قرار دے رہے ہیں اس سے پتہ چلتا ہے کہ خلقت آدم کی غرض وغایت پہلے ہی سے خلافت ارضی کیلئے تھی لیکن خلافت سے مراد کیا ہے اور حضرت آدم صفی اللہ پہلے مراحلے پر اس خلافت کے

کس درجے پر فائز تھے اس سلسلہ میں یہ کلمہ جہاں استعمال ہوا ہے وہاں سے مدد لینے کی ضرورت ہے خداوند عالم نے خلافت کی کیا تشریح وتفسیر کی ہے، اس کی حدود کیا ہے، اس طرح اسکی کیا ذمہ داریاں ہیں یہ تمام نکات بحث طلب ہیں۔

خلافت: خلافت مادۂ خلف سے ماخوذ ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں:

﴿وما خلفهم﴾ ''جو کچھ ان کے پیچھے ہے'' (بقرہ/۲۵۵) ﴿فخلف من بعدهم﴾ ''پھر ان کے بعد'' (اعراف/۱۶۹) فرقان/۶۲، مائدہ/۳۳۔

خلافت کی انواع ہیں:

۲۔ خلافت قوم کے پیچھے:

﴿واذكروا اذ جعلكم خلفاء من بعد قوم نوح﴾ ''اور یاد کرو جب اس نے قوم نوح کے بعد تمھیں جانشین بنایا'' (اعراف/۶۹) ﴿واذكروا اذ جعلكم خلفآء من بعد عاد بواكم فى الارض﴾ ''اور (وہ وقت) یاد کرو جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمھیں جانشین بنایا اور تمھیں زمین آباد کیا'' (اعراف/۷۴) ﴿ويجعلكم خلفآء الارض﴾ ''اور تمھیں زمین میں جانشین بناتا ہے؟'' (نمل/۶۲) ان آیات کریمہ سے پتہ چلتا ہے اسراء ۷۶، توبہ ۸۱۔

۳۔ خلافت مومنین:

﴿وعد الله الذين امنوا منكم وعملوا الصٰلحٰت ليستخلفنهم فى الارض كما استخلف الذين من قبلهم وليمكنن لهم دينهم الذى ارضى لهم وليبدلنهم من بعد خوفهم امنًا يعبدوننى لا يشركون بى شيئًا﴾ ''تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور نیک اعمال بجالائے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ انھیں زمین میں اسی طرح جانشین ضرور بنائے گا جس طرح ان سے پہلوں کو جانشین

بنایا اور جس دین کو اللہ نے پسندیدہ بنایا ہے اسے پائیدار ضرور بنائے گا اور انھیں خوف کے بعد امن ضرور فراہم کریگا وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھرائیں'' (نور/۵۵) انعام ۷۵ بقرہ ۳۰

۴۔ خلافت خاص جیسے حضرت داؤد کی خلافت:

﴿انی جاعل فی الارض خلیفة﴾ ''میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں'' (بقرہ/۳۰)

اھداف ومقاصد خلافت:۔

۱۔ تعمیر وآبادی زمین:

﴿ھوانشاکم من الارض واستعمرکم﴾ ''اسی نے تمہیں زمین سے پیدا کیا اور اس میں آباد کیا'' (ھود/۶۱) (سورۂ اعراف ۶۹،۷۴)

۲۔ تسبیح وتقدیس:

﴿ونحن نسبح بحمدك ونقدس لك﴾ ''جبکہ ہم تیری حمد وثنا کی تسبیح اور تیری پاکیزگی کا ورد کرتے رہتے ہیں'' (بقرہ/۳۰)

۳۔ نفاذ اجراء شریعت الٰہی: یہاں خلافت سے مراد خلافت الٰہی اور قیادت ورہبری ہے جس کے اپنے تقاضے ہیں جن میں علم اور حقیقت شناسی شامل ہے اس لئے خداوند عالم نے فرمایا: خدا نے حضرت دؤاد سے فرمایا ہم نے آپ کو زمین پر خلیفہ بنایا۔ ہے آپ لوگوں میں حق پر فیصلہ کریں:

﴿یداود انا جعلناك خلیفةً فی الارض فاحکم بین الناس بالحق ولاتتبع الھوی فیضلك عن سبیل الله﴾ ''اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا لہذا لوگوں میں حق کے ساتھ فیصلہ کریں اور خواہش کی پیروی نہ کریں وہ آپ کو اللہ کی راہ

بھٹکادے گی'' (ص ۲۶)

یہاں سے پتہ چلتا ہے کہ خلافت کا دوسرا مقصد حق وانصاف کو رواج دینا ہے۔

۳۔ خداوند عالم نے سورہ نور ۵۵ میں فرمایا ہے کہ خلافت کی اعلیٰ وارفع ذمہ داریوں میں زمین پر ہر قسم کے شرک وکفر اور بت پرستی کا خاتمہ اور ایمان' توحید اور عمل صالح اور خدا پرستی کا بول بالا کرنا قرار دیا ہے:

﴿وعداللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم دینھم الذی ارضی لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امناً یعبدوننی لایشرکون بی شیئاً﴾ ''تم میں سے جولوگ ایمان لے آئے ہیں اور نیک اعمال بجالائے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کررکھا ہے کہ انھیں زمین میں اسی طرح جانشین ضرور بنائے گا جس طرح ان سے پہلوں کو جانشین بنایا اور جس دین کو اللہ نے پسندیدہ بنایا ہے اسے پائیدار ضرور بنائے گا اور انھیں خوف کے بعد امن ضرور فراہم کریگا وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھرائیں''

حضرت آدم صفی اللہ کے پاس دوقسم کی خلافت کی نمائندگی ہے۔ ایک خالق کی خلافت کی نمائندگی ہے اور دوسرا خلافت عدل وانصاف کی نمائندگی ہے خلافت نوعیت میں فتنہ وفساد خون ریزی ہے جیسے خداوند متعال نے ملائکہ کو مسترد نہیں کیا۔ لیکن وہ خلافت انبیاء ومومنین کی خلافت ہے اس حوالے سے آدم کو اپنا صفی قرار دیا ہے:

شجرہ ممنوعہ:

دین ودیانت داروں کے دل پر بننے والے کفر کے جال کی ایک علت غیر مفید حکمتوں اور غیر ضروری معلومات کی تلاش کا آوری ہے انسان اس دنیا میں جن بتوں کے سامنے سرنگوں ہوا ہے ان

میں سے ایک بت، بت معلومات ہے جمع معلومات کو اچھا اور مقدس کام گردانا گیا ہے یہیں سے انسان بے راہ روی اور گمراہی وضلالت کی طرف گیا، بت معلومات کے سامنے سرنگوں ہو کر ہر طرح کی معلومات اکٹھی کرنے کا راستہ کفر وشرک کی طرف جاتا ہے۔ اس کی مثال وہ شجرِ ممنوعہ ہے جسے آدم صفی اللہ نے چکھا چنانچہ لوگ ہاتھ دھو کر اس شجرہ ممنوعہ کی حقیقت جاننے میں سرگرداں ہو گئے کہ آخر یہ شجر کون سا شجر تھا اور یوں اس شجرہ ممنوعہ کے بارے میں اکیس سے زائد اقوال ہماری کتابوں کی زیب وزینت بنے ہیں حالانکہ اس سلسلے کی تمام کوشش وکاوش ہمیں اپنی منزل تک پہنچنے کے حقیقی راستے سے ہٹانے کی خاطر تھی یہ کار ابلیس ہے کہ جس نے حضرت آدمؑ کو اس شجر کے نزدیک کر کے گمراہ کیا ہے اور اب وہی ابلیس ہمیں اس شجر کی حقیقت سے دور کر کے گمراہ کر رہا ہے حقیقت میں اس شجرہ ممنوعہ کی مثال فوجی مشقوں میں استعمال ہونے والے نشان کی مانند ہے جسے مارنے کی مشق کی جاتی ہے، یہاں پر نشانہ باندھنے والے فوجیوں کیلئے یہ بحث بالکل بے ہودہ و بے معنی ہوگی کہ یہ نشان وہدف گتے کا بنا ہوا ہے لکڑی کا، اینٹوں اور پتھروں کا یا یہ لوہے کا بنا ہوا ہے۔ جس شجر کے قریب جانے سے آدم کو منع کیا گیا تھا ہمیں بھی اسے اسی طرح کا ایک علامتی نشان ہی سمجھنا چاہیے کیونکہ حضرت آدم صفی اللہ کو عملی زندگی گزارنے کی مشق کرواتے وقت خداوند متعال نے آدم کو وہ درخت ایک نشانی یا ہدف کے طور پر دکھایا تھا۔ جب انسانی اجتماع میں ضروریات زندگی کا حصول اگر کسی اصول وضوابط سے باہر ہو تو ایک کشمکش کی صورت حال پیدا ہوتی ہے، لہٰذا ضروریات زندگی تک رسائی کیلئے ضروری ہے کہ انسان کسی نظام اور قانون کی پاسداری کرے اور اس کی حدود کا احترام کرے۔ اللہ تبارک تعالیٰ نے آدم سے کہا کہ آپ دونوں یہاں پر آرام وسکون کی زندگی گزاریں لیکن آپ کی سرحد یہ ہے کہ آپ اس درخت کے نزدیک نہ جائیں گویا اللہ تبارک تعالیٰ نے آدم پر واضح کر دیا کہ آرام راحت اور آسائشوں کا مسلسل حصول صرف قانون کے احترام میں ہی مضمر و پوشیدہ ہے اور انسان صرف اسی وقت دکھ، وتکلیف اور پریشانیوں اور مصیبتوں میں مبتلا

ہوتا ہے جب وہ نظام وقانون کی حدوں کو پامال کرتا ہے پہلے مفروضے کے تحت ایک سادہ انسان ہونے کے حوالے سے آدم نے نظام وقانون یعنی مقرر کردہ حدود کا احترام نہیں کیا جس کے نتیجے میں آدم خداوند عالم کی عصیان ونافرمانی کرنے والوں میں قرار پائے۔ عصیان ونافرمانی پر اسرار وتکرار انسان کو کفر کی طرف لے جاتا ہے لیکن پشمانی وندامت انسان کو توحید وایمان سے نزدیک کرتی ہے۔ اور صحیح معنوں میں پشمان ہونے والا بالآخر اعلیٰ درجے پر فائز ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ اسے اپنے منتخب بندوں میں بھی قرار دے سکتا ہے۔

آدم صفی اللہ بیک وقت تین صفات کے حامل ہیں:

۱۔ بے عیب وبے رنگ انسان۔

۲۔ انسان عاصی وخطار کار۔

۳۔ مجتبیٰ ومصطفیٰ

آدم سے دھوکہ ہوا: انسان کا دشمن اس کے باہر ہے، وہ اس کے اندر سے اسے گمراہی کی طرف نہیں دھکیلتا گویا انسان اس پتھر کی مانند نہیں جو کسی اونچائی وبلندی سے نیچے گرے تو جب تک کوئی چیز اس کے راستے میں مزاحم ہوکر اسے نہ روکے تو وہ نیچے ہی گرتا جاتا ہے بلکہ انسان اس پتھر کی مانند ہے جو ہموار زمین پر پڑا ہو اور جب تک اس کے آگے پیچھے یا اطراف سے کوئی بیرونی طاقت اسے دھکا دیکر اس کی جگہ سے نہ ہٹائے وہ اپنی جگہ پر قائم رہتا ہے ان حقائق کو مدنظر رکھتے ہوئے ہمیں حیات آدم صفی اللہ کو پڑھنے کی ضرورت ہے ممکن ہے ہمیں اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کو سنوانے میں دیگر انبیاء کرام کی نسبت آدم صفی اللہ کی سیرت میں زیادہ عبرت ورہنمائی ملے کیونکہ حضرت آدمؑ پہلے مرحلے میں ایک انسان مافوق نہیں بلکہ ایک عادی انسان تھے۔

تربیت گاہ سے اخراج:

اکثر و بیشتر افراد کلمۂ "جنت" سے وہ "جنت" مراد لیتے ہیں جو قیامت برپا ہونے کے بعد خدا پرستوں کو عطا کی جائے گی۔

حضرت آدم صفی اللہ کو خداوند عالم نے جنت میں بسایا اسی طرح یہ بھی واضح ہے آپ نے شجرۂ ممنوعہ سے تناول فرمایا جس کے نتیجہ میں آپ کو وہاں سے نکل جانے کا حکم ہوا۔ وہاں سے نکل جانے کا یہ تصور ایک معمہ ہے جو بظاہر آیات اور روایاتِ اسلامی کے مخالف نظر آتا ہے کیونکہ جنتِ الخلد سے نہ تو کسی کو نکالے جانے کا تصور موجود ہے اور نہ ہی وہاں شیطان کے داخلے کا تصور پایا جاتا ہے لیکن کلمہ جنت اور مفہوم میں استعمال ہوا ہے جیسے جنت اس باغ کو کہتے ہیں جس کی چھت درختوں کے تنوں اور ان کے پتوں سے مل کر بنی ہو اللہ نے جنت الخلد کے علاوہ اس دنیا میں بھی چندین جنتیں بنائی ہیں اور پھر انہیں ویران و برباد بھی کیا ہے اس ضمن میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ کریں:

﴿ایو داحد کم ان تکون له جنة من نخیل واعناب﴾ "کیا تم میں سے کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کیلئے کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو" (بقرہ/۲۶۶)

﴿کلتا الجنتین اتت اکلها﴾ "اور (اے محمد) ان سے دو آدمیوں کی ایک مثال بیان کریں جن میں سے ایک کو ہم نے انگور دو کے عطا کئے" (کہف/۳۲) سبا ۱۵، قلم ۱۷۔

ان آیات سے پتہ چلتا ہے، جنت بروز قیامت حساب و کتاب کے بعد مومنین کو عطا کئے جانے والا گھر ہی نہیں بلکہ خدا نے دنیا میں بھی کئی جنتیں بنائی ہیں لہٰذا حضرت آدمؑ کو خدا دنیاوی زندگی کی آزمائش و امتحان سے گزارے بغیر جنت الخلد میں نہیں بھیج سکتے کیونکہ یہ حکمت اور مشیت کے خلاف ہے، اس نے اپنی کتاب میں کہا ہے وہ اپنے صالح و فرمانبردار بندوں کو دنیاوی زندگی گزارنے اور امتحان و آزمائش سے کامیابی کے بعد جنت الخلد میں داخل کرے گا جہاں وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے بعض افراد کا یہ کہنا درست نہیں کہ آدم شیطان کے بہکاوے میں نہ آتے تو آج ہم بھی جنت الخلد میں ہوتے کیونکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۳۰ میں خدا نے ارشاد فرماتا ہے کہ ہم نے

آدم کو اسی روئے زمین کے لئے خلق کیا ہے:

﴿انی جاعل فی الارض خلیفۃ﴾ ''میں زمین میں ایک خلیفہ (نائب) بنانے والا ہوں''

خلقت آدمؑ کے بعد آدمؑ کو جنت الخلد میں نہ بھیجے جانے کی ایک واضح دلیل یہ بھی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدم کو جنت میں بسایا تو وہاں انہیں محدود سے اوامر و نواحی کی طرف بھی متوجہ کیا اور ان کی مخالفت کی صورت میں انہیں وہاں سے نکالنے کی وعید بھی سنائی جبکہ جنت الخلد میں جانے والوں پر نہ تو تکالیفِ شرعی عائد ہوتی ہیں اور نہ ہی وہاں داخلہ کے بعد وہاں سے نکالے جانے کا کوئی تصور ہو سکتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس جگہ کو جنت الخلد کا نام دیا گیا ہے یعنی وہاں داخل ہونے کی سعادت پانے والے ہمیشہ کے لئے وہیں رہیں گے اور انہیں داخلہ کے بعد اس لطف و کرم سے محروم نہ کیا جائے گا۔ قرآن کریم میں آدم کا جنت سے نکالے جانے اور اس روئے زمین کے لئے تخلیق ہونے کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ انہیں جس جنت سے نکالا گیا وہ جنت الخلد نہ تھی بلکہ وہ ایک ایسا باغ اور ایک ایسی جگہ تھی جو آدم و حوا کے لئے آسائشوں اور نعمتوں سے پُر تھی تاکہ وہ انہیں آخرت میں ملنے والی جنت الخلد کی یاد دلائے یہ جنت درحقیقت آدم کے لئے ایک تربیت گاہ تھی یہاں بسانے کے بعد خداوند عالم نے آدم کو ایک امر ایک نہی اور ایک حقیقت سے متعارف کروایا اور یہی انسان کی زندگی کے لئے خداوند متعال کی طرف سے عائد احکام و ہدایت کا خلاصہ و نچوڑ ہے یہاں پر خدا نے حکم دیا اے آدم! آپ اور آپ کی زوجہ یہاں جس قدر عیش و عشرت و لذت اٹھانا چاہیں اٹھالیں اور آپ دونوں پر صرف ایک پابندی ہے کہ اس درخت کے قریب نہ جائیں گویا اللہ کی طرف سے اس دنیا میں انسان کو جو آزادی ملی ہے اس کے مقابلے میں جو پابندی ہے وہ سو میں سے ایک ہے یہ بات اس دنیا میں انسان کی آزادی کے جھوٹے علمبرداروں کے منہ پر ایک طمانچہ ہے اسی طرح یہاں جو دوسرا نکتہ بیان ہوا وہ یہ ہے کہ انسان کے لئے حرام سے بچنے کا سب سے بہتر

طریقہ یہ ہے وہ حرام سے دور ہی رہے اور کبھی بھی اس کے قریب نہ جائے اب آتے ہیں اس حقیقت کی طرف کہ جس سے خدا نے آدم کو متعارف کروایا اور آدم وحوا کو جنت میں بسا کر اور اس حقیقت سے آشنا کر کے رہتی دنیا تک کے تمام انسانوں پر واضح کر دیا کہ انہوں نے کس چیز سے بچ کے رہنا ہے وہ یہ ہے کہ ہر انسان اپنے دشمن شیطان سے بچ کے رہے کیونکہ وہ کبھی بھی آپ کا دوست اور خیر خواہ نہیں ہو سکتا چاہے وہ دوست کے چہرے میں ہی کیوں نہ آئے اور نصیحت کی زبان کھولے:

﴿ان ھذا عدو لك ولزوجك فلا یخرجنكما من الجنة فتشقی﴾ ''ہم نے آدم سے کہا اے آدم! یہ آپ اور آپ کی زوجہ کا دشمن ہے کہیں یہ آپ دونوں کو جنت سے نکال نہ دے پھر آپ مشقت میں پڑ جائیں گے'' (طٰہٰ/۱۱۷)

حضرت ادریسؑ

حضرت ادریسؑ کا ذکر قرآن کریم میں دو بار سورہ مریم ۵۶ اور سورہ انبیاء ۸۵ میں آیا ہے:

﴿واذکر فی الکتب ادریس انه کان صدیقاً نبیاً﴾ ''اور اس کتاب میں ادریس کا ذکر کیجئے: وہ یقیناً راستگو نبی تھے'' ﴿واسمٰعیل وادریس وذالکفل کل من الصٰبرین﴾ ''اور اسماعیل و ادریس اور ذوالکفل کو بھی (اپنی رحمت سے نوازا) یہ سب صبر کرنے والے تھے''

ان دونوں آیات میں ان کے لئے دو صفات کا ذکر آیا ہے ایک صفت عام ہے جس سے خداوند متعال نے ہمیشہ اپنے ہر نبی کو یاد کیا وہ صفت صدیق ہے دوسری صفت مخصوص نظر آتی ہے فرمایا انہیں ہم نے بلند مقام پر اٹھایا ہے علماء میں مشہور یہ ہے کہ بلند مقام سے مراد ان کو آسمان کی طرف اٹھایا ہے اس سے کہتے ہیں حضرت ادریس ان انبیاء میں سے ہیں جو ابھی تک زندہ ہے ہمیں اس آیت کریمہ کے اس جملے کے بارے میں کوئی وضاحت نظر نہیں آتی بلند مرتبے سے مراد مقام مادی ہے یا مقام معنوی یہ بھی ثابت نہیں ہے بلکہ عدم ثبوت یقینی ہے کہ وہ ابھی تک زندہ ہیں جو بھی ہو ہم گزشتہ انبیاء کے بارے میں کتب عہدین پر اعتماد نہیں کرسکتے اور ہماری روایات پر ابھی تک ہمارے علماء نے تحقیق شروع نہیں کی ہے لہٰذا ہماری رسائی آیات قرآنی تک محدود ہے ہم صرف حضرت ادریس کی نبوت اور صداقت اور بلند درجے پر فائز ایمان لانے پر اکتفا کرتے ہیں اس کے علاوہ حضرت ادریس کے بارے میں علماء کے نزدیک یہ بھی مشہور ہے کہ آپ حضرت ادریس ابن برت بن شیث بن آدم کے فرزند ہیں لہٰذا آپ کی نبوت کا دور حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیان میں ہے اس

حوالے سے آپ سب سے پہلے نبی ہیں لیکن اس آیت کی وجہ سے آپ کی بنوت حضرت نوح سے پہلے ہونے میں شکوک شبہات پیدا ہوتے ہے جہاں خدا نے آغاز نبوت کو حضرت نوحؑ سے متعارف کروایا ہے علماء مفکرین اس سلسلے میں از بھی زحمت فرمائیں۔

حضرت نوح علیہ السلام

حضرت نوح علیہ السلام

نوح بن لامک بن متوشالح بن اخنوخ بن یارد بن مھلائیل بن قنان بن انوش بن شیث بن آدم:

نوح: بعض افراد کا کہنا ہے کہ یہ کلمہ عجمی عبری ہے جبکہ بعض نے کہا "نوح" ناح یا نوح سے مصدر ہے جسکے معنی پریشانی کے عالم میں رونے اور چیخنے کے ہیں اور بعض نے کہا نوح کسی چیز کے دوسری چیز سے مقابلہ کرنے کو کہتے ہیں، حضرت نوح علیہ السلام کو اس لئے نوح کہتے ہیں کہ آپ تقرب خدا کی خاطر اپنے نفس پر بہت زیادہ روتے تھے، نوحؑ کے القاب میں ایک لقب آدم ثانی ہے اور اس لقب کی وجہ یہ ہے کہ طوفانِ نوح سے تمام لوگوں کے غرق ہونے کے بعد دنیا تمام انسانوں کی نسل آپؑ ہی سے پھیلی، اہل تاریخ لکھتے ہیں روئے زمین پر بسنے والے تمام انسان نسل نوح سے ہیں حضرت نوح علیہ السلام کے چار فرزند تھے ان میں سے ایک کا نام "سام" تھا جس سے عرب، فارس اور اہل روم پھیلے ہیں۔ دوسرے کا نام "حام" تھا جس سے سوڈانی پھیلے اور تیسرے کا نام "یافث" تھا جس سے ترک پھیلے ان کے علاوہ یاجوج و ماجوج، فرنچ اور قبط ھود بن ہام سے پھیلے ہیں کشتی نوح میں آپؑ کے تین فرزندوں کی بیویاں بھی تھیں اس میں چالیس مرد اور چالیس عورتیں سوار تھیں کل اسی (۸۰) تھیں اسی وجہ سے جہاں کشتی رکی اس اس جگہ کا نام ثمانین بن گیا

جن سور و آیات میں حضرت نوح علیہ السلام کا ذکر آیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

حضرت نوح آیاتِ قرآنی میں:

سورہ	سورہ نمبر	آیت نمبر
آل عمران	۳	۳۳

النساء	۴	۱۶۳
الانعام	۶	۸۴
الاعراف	۷	۵۹،۶۹
التوبة	۹	۷۰
یونس	۱۰	۷۱
ھود	۱۱	۲۵،۳۲،۳۶،۴۲،۴۵،۴۶،۴۸،۴۹
ابراھیم	۱۴	۹
الاسراء	۱۷	۳،۱۷
مریم	۱۹	۵۸
الانبیاء	۲۱	۷۶
الحج	۲۲	۴۲
المؤمنون	۲۳	۲۳
الفرقان	۲۵	۳۷
الشعراء	۲۶	۱۰۵،۱۰۶،۱۱۶
العنکبوت	۲۹	۱۴
الاحزاب	۳۳	۷
الصافات	۳۷	۷۵،۷۹
صٓ	۳۸	۱۲
غافر	۴۰	۵،۳۱
الشوری	۴۲	۱۳

قٓ	۵۰	۱۲
الذاریات	۵۱	۴۶
النجم	۵۳	۵۲
القمر	۵۴	۹
الحدید	۵۷	۲۶
التحریم	۶۶	۱۰
نوح	۷۱	۲۶،۲۱،۱

حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کی دعوت

حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں وارد آیاتِ کریمہ سے پتہ چلتا ہے آپؑ کی دعوت دیگر انبیاءِ کرام کی دعوت سے مختلف تھی گرچہ حضرت نوح علیہ السلام حسب تصریح قرآنِ کریم سب سے پہلے نبی تھے جو انسان کی ہدایت ورہنمائی کیلئے مبعوث ہوئے۔

حضرت نوح علیہ السلام پہلے اولی العزم پیغمبر ہے حسب ترتیب قرآنِ کریم، حضرت آدم صفی اللہ کے بعد آپ ہی ہیں آپکا اسم تتالیس (۴۳) بار قرآن کریم میں آیا ہے۔آپؑ کی اولادوں کے نام جو تورات میں تحریر ہیں: حام، سام، یافث اور وہ بیٹا جو آپؑ کی اطاعت سے نکل گیا اسکا نام کنعان تھا آپ کی دعوت نبوت کا دور حسب قرآن نوسو پچاس (۹۵۰) سال ہے، عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ ہم سے پہلے والے انسان صاف ستھری اور سادہ فکر کے حامل تھے، وہ جلدی مطمئن ہونے والے تھے، ان میں انحرافات کی شرح اس دور کی بہ نسبت بہت کم تھی لیکن حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں وارد آیاتِ کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ نوح نبیؑ کو جس قوم کا سامنا کرنا پڑا وہ انتہائی لجاجت اور عناد کی صورت میں بت پرستی میں مستغرق تھی، کسی بھی حوالے سے انھیں ان کی روش سے

ہٹانا ممکن نہیں تھا انھیں دعوت دیتے وقت وہ طریقہ کار اور ایسے جملے استعمال نہیں کیے جا سکتے تھے
جیسا اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے نرم
زبان میں گفتگو کرو یا خاتم الانبیاءؐ سے فرمایا ہم نے آپ کو نرم مزاج بنایا اگر آپ تند مزاج ہوتے
تو لوگ آپؐ سے دور ہو جاتے لیکن جس قوم کا حضرت نوحؑ کو سامنا تھا اس کے بارے میں ابتداء ہی
میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے نوح کو یہ کہہ کر اس قوم کی طرف بھیجا کہ انھیں ڈرائیں اس سے
پہلے کہ ان پر دردناک عذاب نازل ہو جائے۔

اس آیۂ کریمہ سے پتہ چلتا ہے کہ قوم نوحؑ بت پرستی میں غرق تھی اور اس فعل کے خلاف کسی قسم کی
بات سننے کے لئے آمادہ نہ تھی گرچہ ان سے ہر قسم کے بہانے اور عذر کو چھیننے کیلئے اللہ تعالیٰ نے
حضرت نوح علیہ السلام کو حکم دیا پہلے آپ انھیں ڈرائیں، دوسرے مرحلہ میں آپ انھیں یہ طمع دیں
کہ بت پرستی چھوڑنے کے نتیجے میں ان کی گذشتہ غلطیاں بخش دی جائیں گی، تیسرے مرحلہ میں ان
سے کہیں اگر فوراً اور بیک وقت نہیں چھوڑ سکتے تو ہم تمہیں کچھ مہلت بھی دے دیں گے اور بت پرستی
چھوڑنے پر خداوند متعال تمہیں نعمتوں سے بھی نوازے گا۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنی دعوت میں تمام تر نرمی اور عفو درگذر کے مراحل سے گزرے لیکن قوم
نوحؑ پر کسی قسم کا اثر نہ ہوا یہاں تک حضرت نوحؑ نے درگاہِ رب العزت میں ان کی سرکشی کی شکایت
کی اور کہا کہ اے باری تعالیٰ! میں نے انھیں جتنی بھی دعوت دی اور عفو و بخشش کیلئے بھی کہا لیکن یہ
لوگ اتنا ہی میری بات سننے سے انکاری ہو گئے، یہ لوگ میری دعوت کو نہ سننے کیلئے اپنے کانوں میں
انگلیاں ڈال لیتے ہیں اور کبھی لباس میں چھپ جاتے ہیں۔ یہ غرور و تکبر اور استکبار کرنے والے ہیں
پھر فرمایا میں نے انھیں دن رات دعوت دی مگر ان پر کچھ اثر نہ ہوا حضرت نوح علیہ السلام کی حیات
طیبہ سے پتہ چلتا ہے قوم نوحؑ بت پرستی اور بتوں سے لگاؤ میں اس مرحلے تک پہنچ چکی تھی کہ ایک
آدمی نے اٹھ کر کہا کہ اپنے خداؤں کو مت چھوڑو پھر اس نے ایک ایک بت کا نام لیکر کہا ان کی

محافظت و پاسداری کرو۔

حضرت نوح علیہ السلام کے صفات والقابات:

صافات کی آیت ۷۹ میں خدا نے آپؑ پر سلام بھیجا ہے:

﴿سلٰم علی نوح فی العلمین﴾ ''تمام عالمین میں نوح پر سلام ہو''

خدا نے آپؑ کو عبدِ شکور کہا ہے:

﴿ انه کان عبدًاشکورًا﴾ ''نوح یقیناً بڑے شکر گزار بندے تھے'' (اسراء/۳)

آپؑ سورہ آل عمران آیت ۳۳ کے تحت حضرت آدمؑ کے بعد خدا کا دوسرا برگزیدہ بندہ ہے:

﴿ان الله اصطفیٰ ادم و نوحًا وال ابرٰهیم وال عمران علی لعلمین﴾ ''بے اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو تمام عالمین سے برگزیدہ فرمایا ہے''

اور سورہ نساء کی آیت ۱۶۳ کے تحت آپ سب سے پہلا نبی ہے:

﴿انااوحینا الیك کمااوحینا الیٰ نوح والنبین من بعده﴾ ''(اے رسول) ہم نے آپ کی طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے جس طرح نوح اور ان کے بعد کے نبیوں کی طرف بھیجی''

سورہ عنکبوت کی آیت ۱۴ کی رُو سے آپ اپنے قوم میں ایک ہزار سال سے کچھ کم عرصہ کی عمر کی ہے:

﴿ولقدارسلنانوحًاالیٰ قومه فلبث فیهم الف سنۃ الاخمسین عامًا﴾ ''اور بتحقیق ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تو وہ ان کے درمیان پچاس سال کم ایک ہزار سال رہے''

اور روایات میں دو ہزار تین سو (۲۳۰۰) یا دو ہزار پانچ سو (۲۵۰۰) سال تک بھی نقل ہوا ہے شاید طول عمر نوح ہی حضرت نوحؑ کے معجزات میں سے ہو۔ آیات مبارکہ قرآن کریم میں حضرت

نوح علیہ السلام کے دو معجزوں کا ذکر ہے ان دو معجزوں میں سے ایک تو آپ کی طولِ عمر ہے اتنی طویل عمر نہ تو آپ سے پہلے کسی کو ملی اور نہ ہی بعد میں آنے والوں میں سے کسی کو ملی۔

قصہ حضرت نوح علیہ السلام

سورہ مبارکہ ہود کی آیت نمبر ۲۵ میں خداوند عالم نے فرمایا ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف بھیجا تاکہ قوم کو ڈرائیں:

﴿ولقد ارسلنا نوحاً الیٰ قومہ انی لکم نذیر مبین﴾ ''اور ہم نے نوح کو ان کی قوم کی طرف اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ میں تمہارے لئے کھلے ہوئے عذاب الٰہی سے ڈرانے والا ہوں''

یہاں ایک بحث کلمہ قوم کے بارے میں ہے یہاں بھی اور دیگر مقامات پر خداوند عالم نے انبیاء ومرسلین کے بارے میں فرمایا فلاں نبی کو اپنی قوم کی طرف بھیجا یا وہ اپنی قوم میں رہے یہاں قوم سے مراد کیا ہے بعضوں کا خیال ہے قوم قبیلے کو کہتے ہیں یا اس شہر کے رہنے والوں کو جبکہ حقیقت میں قوم سے مراد مرد ہیں وہ اس لئے کہ ہمیشہ دعوت انبیاء ومرسلین کا مقابلہ ہمیشہ مردوں نے ہی کیا کیونکہ عورتیں حجاب میں رہتی تھیں عورتیں ہمیشہ آسمانی پیغام باپ، بھائی، شوہر سے سنتی تھیں لہذا اسی وجہ سے پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں خواتین نے احتجاج کیا کہ مرد دینی معلومات میں ہم سے آگے ہیں آپ اپنی خدمت میں ہماری حاضری کے لیے ایک دن معین فرمائیں تاکہ عورتیں بھی دین اسلام کے بارے میں دریافت کریں چنانچہ پیغمبر اکرمؐ نے ایک دن معین فرمایا۔ انبیاء کے سامنے آنے والے قوم تھے اسکی کیا دلیل ہے، قوم مادہ قائم یا قیوم سے ہے یہ دونوں صفات مردوں کی ہیں لہذا سورۂ مبارکہ حجرات آیت نمبر ۱۱ میں فرماتے ہیں:

﴿یاایھا الذین امنوا لایسخر قوم من قوم عسیٰ ان یکونوا خیراً منھم﴾ ''اے ایمان

والوں کوئی قوم کسی قوم کا تمسخر نہ کرے ہوسکتا ہے کہ وہ لوگ ان سے بہتر ہوں"

مردہی دعوت انبیاء کا مقابلہ کرتے تھے انکار کرتے تھے سورہ اعراف آیت نمبر ۵۹ میں حضرت نوح کے بارے میں ہے حضرت نوح نے قوم کو چند چیزوں کی دعوت دی۔ دعوت عقیدہ توحید یعنی خد ایک ہے دوسرا اسکے علاوہ کسی کی عبادت و پرستش نہ کریں عبادت سے مراد اطاعت خدا ہے۔ ایک دن خدا کے حضور حاضری دینا ہے گناہ گار عذاب کا مزہ چکھیں گے اور قیامت سے پہلے اس دنیا میں بھی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ حضرت نوح نے اپنی قوم کو ڈرایا کہ تم پر عذاب نازل ہوگا اور تم اسکے رفع کرنے پر قادر بھی نہیں ہوگے۔ اس حوالے سے حضرت نوح پریشان تھے لوگ عذاب سے نجات پائیں، یہ اسی صورت ممکن ہے کہ وہ اطاعت گزار بن جائیں لہٰذا اس سورہ مبارکہ اعراف کے مطابق حضرت نوح کی دعوت تبلیغ تین نکات پر مشتمل ہے اللہ کے علاوہ کوئی خدا نہیں اس کی عبادت کرو ورنہ ایک عذاب تمہاری طرف آنے والا ہے ان احکام سے جو فرار کرتے ہیں اور فرار کی دعوت دیتے ہیں وہ طاغی، جبار، رئیس اور قوم کے سربراہ ہوتے ہیں کیونکہ قیادت و سیادت انکے ہاتھ میں ہوتی ہے باقی تمام لوگ انکی رعیت اور انکی اطاعت میں ہوتے ہیں اگر یہ دین خدا کی واحدانیت کے بارے میں متحد ہو جائیں۔ ایک خدا کی اطاعت و بندگی میں آجائیں تو اس وقت کیا ہوگا۔ ان قائدین و سربراہان کی بود و باش کرسی کو لوگ ان سے کھینچ لیں گے کیونکہ حکومت صرف اللہ کی ہے انسان کسی انسان کے سامنے خاضع نہیں ہے لہٰذا انہی لوگوں کی طرف سے دعوت انبیاء کی مخالفت ہوئی چنانچہ فرماتے ہیں قوم کی ایک جماعت نے حضرت نوح سے آکر کہا ہم تمہیں کھلی ہوئی گمراہی میں دیکھتے ہیں وہ قوم کے روسا و صاحبان حشمت و ہیبت تھے انہوں نے دیکھا دعوت نوح نے انھیں تہہ و بالا کر دیا اس سے جان چھڑاؤ حضرت نوح نے فرمایا میں گمراہ نہیں ہوں:

﴿یاقوم لیس بی ضلالة ولکنی رسول من رب العلمین۔ ابلغکم رسلٰت ربی وانصح لکم﴾ "کہا: اے میری قوم! میں گمراہ نہیں ہوں بلکہ عالمین کے پروردگار کی

طرف سے ایک رسول ہوں میں تمہیں اپنے رب کے پیغامات پہنچاتا ہوں اور تمہیں نصیحت کرتا ہوں" (اعراف/۶۱،۶۲)

انکی حیثیت مبلغ کی ہے حضرت نوح عظیم حاکم یا سردار نہیں بلکہ اللہ کی طرف سے نجات انسانیت کے پیغام رساں تھے انبیاء و مرسلین کو، حاکم یا حکمران کہنا غلط ہے بلکہ وہ مخلوقات کے لیے خالق کی طرف سے نمائندہ ہیں تمام انعامات چاہے وہ روئے زمین پر ظاہر ہوں جیسے پانی، ہوا، سورج، چاند یا زمین کے اندر چھپے ہوئے خزانے سب خدا کی طرف سے ہیں اور یہ تمام مخلوقات کے لیے ہیں اس میں کوئی امتیاز مومن یا کافر نہیں ہے سورج کی کرن سب کے لیے ہے حضرت نوحؑ نے بھی فرمایا یہ سب خدا کی طرف سے ہے میں صرف مبلغ ہوں یہ میری طرف سے نہیں بلاغ کے معنی پیغام کو سائل تک پہنچا دینا ہے۔ دیگر انبیاء و مرسلین نے بھی یہی دعوت لیکر لوگوں کو ایک خدا کی طرف بلایا کوئی نبی دوسرے نبی کے خلاف پیغام نہیں لایا جو پیغام حضرت آدم صفی اللہ لائے وہی بعد میں آنے والے انبیاء لاتے رہے:

﴿شرع لكم من الدين ماوصى به نوحًا والذى اوحينا اليك وما وصينا به ابرٰهيم وموسىٰ وعيسىٰ ان اقيموا الدين ولا تتفرقوا فيه﴾ "اس نے تمہارے لئے دین کا وہی دستور معین کیا جس کا اس نے نوح کو حکم دیا تھا اور جس کی ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی ہے اور جسکا ہم نے ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا تھا کہ اس دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہ ڈالنا" (شوریٰ/۱۳)

سب ایک ہی دین کے مبلغ تھے یہ احکام ناقابل تغیر ہیں سب نے رسالت خدا کا پیغام خدا سے لیا ضلالت و گمراہی میں گھرے ہوئے انسانوں تک پہنچایا اور لوگوں کو عذاب خدا سے بچنے کے لیے نصیحت کرتے رہے انبیاء ہمیشہ قوم کو رغبت دلاتے اور خدا کے احکام کی پیروی کی دعوت دیتے تھے نصیحت بلاغت سے باہر ہے بلاغت پہنچانے کو کہتے ہیں اور نصیحت اس کو کہتے ہیں جس میں فائدہ ہو

فرماتے ہیں میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں خدا نے فرمایا ہے میری نصیحتوں کا فائدہ تمہارے لیے ہی ہے۔

معجزات حضرت نوح علیہ السلام

طول عمر: انسان کی عمر قلیل وطول کے بارے میں قدیم زمانے سے عصر حاضر تک علماء وماہرین کے مختلف نظریات پائے جاتے ہیں بعض کا کہنا ہے ابتداء میں انسان کی عمر طویل ہوتی تھی رفتہ رفتہ زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان کی عمر میں بھی کمی آتی گئی یہاں تک کہ عصر حاضر میں سو (۱۰۰) سے ساٹھ (۶۰) سال کے درمیان عادی عمر رہ گئی ہے بعض کا کہنا ہے انسان کو مناسب غذا اور فضاء ملے تو وہ ہمیشہ زندہ رہنے کی صلاحیت رکھ سکتا ہے یعنی انسان کی عمر میں کبھی اس کی غذا و فضا میں کمی کی وجہ سے ہوتی ہے۔

یہ تمام نظریات رجم بالغیب تفرس اور تخرص گوئی ہے خداوند متعال قرآن کریم کے سورۂ فاطر کی آیت ۱۱ میں فرماتے ہیں کہ ہر ایک کی عمر پہلے سے متعین ہے:

﴿وما یعمر من معمر ولا ینقص من عمرہ الا فی کتٰب﴾ "اور نہ کسی زیادہ عمر والے کو عمر دی جاتی ہے اور نہ ہی اس کی عمر میں کمی کی جاتی ہے مگر یہ کہ کتاب میں (ثبت) ہے"

اسی طرح ان آیات میں بعض کو عمر طویل دینے کا ذکر آیا ہے:

﴿ولکنا انشانا قرونا فتطاول علیھم العمر﴾ "لیکن ہم نے کئی امتوں کو پیدا کیا پھر ان پر طویل مدت گزر گئی" (قصص/۴۵) انبیاء/۴۴

جبکہ سورۂ بقرہ کی آیت ۹۶ میں خداوند متعال نے یہود کی اس خواہش کو ناممکن قرار دیا ہے کہ جس میں وہ اپنی عمر ایک ہزار سال سے بھی زندگی مل جائے تو پھر بھی ان پر موت آئے گی:

﴿یود احدھم لو یعمر الف سنۃ وماھو بمزحزحہ من العذاب﴾ ''ان میں سے ہرایک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ کاش اسے ہزار سال عمر ملے حالانکہ اگر اسے یہ عمر مل بھی جائے تو یہ بات اس کے عذاب کو ہٹانہیں سکتی''

قرآنِ کریم میں کسی بھی نبی کی عمر کا ذکر نہیں آیا، انبیاء کی عمر کی استناد صرف کتب عہدین تورات وانجیل ہے ہاں چونکہ ہم تورات وانجیل میں موجود تمام مطالب کو مسترد نہیں کرتے اس لئے یہاں سے ہم ایک جامع نقطہ نظر اخذ کرتے ہیں وہ یہ کہ ان کتب میں اکثر وبیشتر انبیاء کی عمریں سو (۱۰۰) ایک سو بیس (۱۲۰) ایک سو پچاس (۱۵۰) اور دو سو (۲۰۰) سال تک ملتی ہیں۔ یہ کہنا کہ مناسب غذا وفضا سے انسان کو لمبی عمر ملتی ہے اور چونکہ اس وقت انسان کو نصیب غذائیں ہر قسم کی مصنوعی اور ملاوٹ شدہ ہیں جس میں دوام وبقاء کی گنجائش کم ہے یا سابق زمانے میں عمر طویل ہوتی تھی اور عصر حاضر میں عمر کم ہے یہ تجربے کے خلاف ہے کیونکہ آج سے تقریباً ڈیڑھ ہزار سال قبل مثلاً جہاں خاتم الانبیاءؐ اور امیر المومنینؑ جنہوں نے ایک محدود اور سادہ غذا سے زندگی گزاری ہے ان کی عمر ۶۳، ۶۵ سال سے زیادہ نہیں گزری اور ان کے بعد آئمہؑ کی عمریں آٹھائیس (۲۸) سے تیس (۳۰) سال تک رہی ہے۔ ان قدیم وجدید اعداد وشمار کو ایک طرف جمع کرتے ہیں اور دوسری طرف خدا نے صرف حضرت نوح علیہ السلام کی عمر کا ذکر قرآن میں کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے خدا نے جو عمر حضرت نوح علیہ السلام کو دی ہے وہ ایک غیر عادی عمر ہے ایسی عمر تاریخ بشریت میں کسی کی نہیں تھی یہاں سے یہ نتیجہ آسانی سے اخذ کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں کہ یہ عمر نوح بذات خود ایک معجزہ ہے خداوند متعال نے اس کائنات کو حضرت نوح علیہ السلام کے توسط سے دکھایا ہے اگر خدا چاہے تو کسی بشر کو اتنی طویل عمر بھی دے سکتا ہے جس کی تاریخ بشریت میں کوئی مثال نہیں ملتی ہے۔

دوسرا معجزہ طوفانِ نوح ہے:

عذاب الٰہی میں تاخیر: بعض مومنین کو ظالمین پر نزول عذاب کی جلدی ہے اس سلسلہ میں کسی مومن نے کسی عالم دین سے پوچھا کہ خداوند متعال ان ظالمین پر کیوں عذاب نازل نہیں کرتا ہے جبکہ اس نے خود وعدہ دیا ہے تو اس عالم نے بہت اچھا جواب دیا فرمایا تا کہ نزول عذاب کے موقع پر ان پر رحم کیلئے دعا کرنے والے باقی نہ رہے ہمارے ملک میں کتنے ظالمین گزرے بعض ان پر نزول عذاب کیلئے دعا کر رہے تھے اور بعض ان کے طول عمر کیلئے۔ قوم نوحؑ پر بھی عذاب نازل کرنے میں خدا نے دو طرح کی مہلت دی:

۱۔ طول عمر حضرت نوحؑ۔

۲۔ کشتی بنانے میں طویل عرصہ گزرا یہاں تک کہ صدیاں گزر گئی پھر ان پر عذاب نازل ہوا:

''نوح'' کشتی بنے رہے تھے اور اس کے قوم کے سرداروں میں سے جو کوئی اس کے پاس سے گزرتا تھا وہ اسکا مذاق اڑاتا تھا اس نے کہا: اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ہم بھی تم پر ہنس رہے ہیں عنقریب تمہیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کس پر وہ عذاب آتا ہے جو اُسے رسوا کر دے گا اور کس پر وہ بلا ٹوٹ پڑتی ہے جو ٹالے نہ ٹلے گی۔ یہاں تک کہ جب ہمارا حکم آ گیا اور وہ تنور اُبل پڑا تو ہم نے کہا: ہر قسم کے جانور کا ایک ایک جوڑا کشتی میں رکھ لو اپنے گھر والوں کو بھی سوائے اُن اشخاص کے جنکی نشاندہی پہلے کی جا چکی ہے اس میں سوار کرا دو اور ان لوگوں کو بھی بٹھا لو جو ایمان لائے ہیں اور تھوڑے ہی لوگ تھے جو نوحؑ کے ساتھ ایمان لائے تھے نوحؑ نے کہا: سوار ہو جاؤ اس میں اللہ ہی کے نام سے ہے اس کا چلنا بھی اور اسکا ٹھیرنا بھی' میرا رب غفور و رحیم ہے'' (ہود/ ۳۸، ۴۰، ۴۱) صافات ۲۷، مومنون ۲۷، ۳۸، قمر ۱۲، ۱۳، طوفانِ نوحؑ کو سمجھنے کیلئے پہلے اس کے مفردات کو سمجھنا ہوگا:

۲۔ نوح اور غرقِ عالم:

پہلا عنصر پانی کا ذکر ان آیات میں آیا ہے:

﴿ففتحنا ابواب السمآء بمآءٍ منهمرٍ۔ وفجرنا الارض عيونًا فالتقى المآء علىٰ امرٍ قد قدر﴾ ''پھر ہم نے زوردار بارش سے آسمان کے دھانے کھول دیئے۔ اور زمین کو شگافتہ کر کے ہم نے چشمے جاری کر دیئے تو (دونوں) پانی اس امر پر مل گئے جو مقدر ہو چکا تھا'' (قمر/۱۱،۱۲)

ھود ۴۴ کے تحت آسمان و زمین نے اپنا پانی باہر پھینکا:

﴿وقيل يٰارض ابلعى مآئك وٰسمآء اقلعى وغيض المآء وقضى الامر﴾ ''اور کہا گیا: اے زمین! اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان! تھم جا اور پانی خشک کر دیا گیا اور کام تمام کر دیا گیا''۔

وہ ذات جس نے ہر چیز کو پانی سے خلق کیا اور ہر چیز کی حیات و بقاء کو پانی سے جوڑ کر رکھا اُسی ذاتِ باری تعالی نے چندین بار انسانِ ناسپاس کو یہ سمجھایا جس چیز سے تمہاری تخلیق ہوئی ہے اور جس چیز سے تمہاری دوام و بقاء ہے، اگر ہم چاہیں تو اُسی چیز کو تمہاری نابودی و بربادی اور فنا و زوال کا سبب بنا سکتے ہیں۔

قوم حضرت نوح علیہ السلام پر خدا نے پانی ہی کے ذریعے عذاب نازل کیا یہ وہی پانی ہے کہ جس کے بارے میں اللہ تبارک وتعالی ارشاد فرماتا ہے ہم نے زمین سے پانی نکالا اور آسمان سے پانی برسایا۔ جب یہ پانی گودیوں کو پُر کر کے سطحِ زمین سے بلند ہو گیا یہاں تک کہ پہاڑوں کی چوٹیاں بھی اُس میں ڈوبنے لگیں تو خداوند عالم نے ہوا جاری کر دی اور اس پانی سے پہاڑ کی شکل کی موجیں بنائیں:

﴿وهى تجرى بهم فى موجٍ كالجبال﴾ ''اور کشتی انھیں لے کر پہاڑ جیسی موجوں

میں چلنے لگی" (ھود/۴۲)

دوسرا عنصر فلک: فلک یعنی کشتی، سورۂ ھود کی آیت ۳۷ میں اللہ تعالیٰ نے نوح کو اپنی نگرانی میں اوراور ہدایت کے مطابق کشتی بنانے کا حکم دیا:

﴿واصنع الفلك باعيننا و حينا﴾ "اور ہماری نگرانی میں اور ہمارے حکم سے ایک کشتی بنائیں" سورۂ نحل کی آیت ۱۴ میں بھی اس کا ذکر ہے، سورۂ شعراء ۱۱۸، یٰسین ۴۱ میں بھی فلک کا ذکر ہے۔

تیسرا عنصر طوفان: ہر اس حادثے کو طوفان کہتے ہیں جو انسان کو گھیر لے لیکن یہاں اس پانی کو طوفان کہا گیا ہے جس میں طغیانی تھی جس نے قوم نوحؑ کو گھیر لیا تھا، ہر چیز پر غالب آ گیا تھا، زمین کو چھپا لیا اور کشتی کے علاوہ باہر رہنے والی ہر جاندار چیز کو ہلاک کر دیا تھا جیسا کہ سورۂ عنکبوت کی آیت ۱۴ میں آیا ہے:

﴿فاخذهم الطوفان وهم ظلمون﴾ "پھر طوفان نے انھیں اس حال میں اپنی گرفت میں لیا کہ وہ ظلم کا ارتکاب کر رہے تھے"

چوتھا عنصر دسر: دسر جمع دسار ہے دسار میخ کو کہتے ہیں:

﴿وحملنه على ذات الواح ودسر﴾ "اور تختوں اور کیلوں والی (کشتی) پر ہم نے نوح کو سوار کیا" (قمر/۱۳)

یعنی حضرت نوح کو ایک ایسی کشتی پر سوار کیا جو تختوں اور میخوں سے بنی ہوئی تھی یہ کلمہ قرآن کریم میں ایک دفعہ آیا ہے۔

نوح علیہ السلام اور دعوت قوم

(۱) قوم نوح نے حضرت نوح سے کہا ہم تم کو کھلی گمراہی پر دیکھتے ہیں:

﴿قال الملامن قومه انالنرٰك فی ضلٰلٍ مبینٍ﴾ ''ان کی قوم کے سرداروں نے کہا: ہم تو تمہیں صریح گمراہی میں مبتلا دیکھتے ہیں'' (اعراف/۶۰)

(۲) جن لوگوں نے تمہاری پیروی کی ہے وہ ہماری نظر میں پست ہیں:

﴿ومانرٰك اتبعك الاالذین هم اراذلنابادی الرای﴾ ''اور ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ ہم میں سے صرف ادنیٰ درجے کے لوگ سطحی سوچ سے تمہاری پیروی کر رہے ہیں'' (ھود/۲۷)

(۳) ہم تم میں کوئی برتری نہیں دیکھتے:

﴿قالوا ان انتم الابشر مثلنا﴾ ''وہ کہنے لگے: تم تو ہم جیسے بشر ہو'' (ابراہیم/۱۰)

(۴) ہم تم کو جھوٹے لوگوں میں سمجھتے ہیں:

﴿بل نظنکم کٰذبین﴾ ''بلکہ ہم تو تمہیں کاذب خیال کرتے ہیں'' (ھود/۲۷)

(۵) ہم تمہیں اپنے جیسا بشر دیکھتے ہیں:

﴿فقال الملاالذین کفروامن قومه مانرٰك الابشرًامثلنا﴾ ''تو ان کے قوم کے کافر سرداروں نے کہا: ہماری نظر میں تو تم صرف ہم جیسے بشر ہو'' (ھود/۲۷)

قوم کو نوحؑ کا جواب:

(۱) میں نہیں کہتا کہ میرے پاس خدا کے خزانے ہیں:

﴿ولااقول لکم عندی خزآئن الله﴾ ''اور میں تم سے نہ تو یہ کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں'' (ھود/۳۱)

(۲) نہ میرے پاس علم غیب ہے:

﴿ولااعلم الغیب﴾ ''اور نہ میں علم غیب جانتا ہوں'' (ھود/۳۱)

(۳) میں ملک بھی نہیں ہوں:

﴿ولا اقول انی ملک﴾ ''اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں'' (ھود/۳۱)

(۴) میں نہیں سمجھتا کہ جنھیں تم حقارت سے دیکھتے ہو وہ خدا کی نظر میں اچھا نہیں ہے:

﴿ولا اقول للذین تزدری اعینکم لن یؤتیھم اللہ خیرًا﴾ ''اور جنھیں تمہاری نگاہیں حقیر سمجھتی ہیں ان کے بارے میں بھی یہ نہیں کہتا کہ اللہ کی انھیں بھلائی سے نہیں نوازے گا'' (ھود/۳۱)

ان سب باتوں کے جواب میں قوم کے رؤسا نے اپنے قوم سے کہا کہ اپنے خداؤں کو مت چھوڑو ''ود'' اور ''عزیٰ'' کو مت چھوڑو:

﴿وقالوا لاتذرن الھتکم ولا تذرن ودًا ولا سواعًا ولا یغوث ویعوق ونسرًا﴾ ''اور کہنے لگے: اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ود' سواع' یغوث' یعوق اور نسر کو نہ چھوڑنا'' (نوح/۲۳)

قوم:

حضرت نوحؑ وہ پہلے نبی تھے جنہیں بت پرستوں کا سامنا کا ہوا جن بتوں کی پوجا قومِ نوحؑ کرتے تھے ان کا نام سورۂ نوح کی آیت ۲۱ تا ۲۳ میں بیان ہوا ہے وہ درج ذیل ہیں' قومِ نوحؑ میں بت پرستی کیسے آئی اس سلسلہ میں علماء و ماہرینِ مذاہب و ادیان نے لکھا ہے:

یہ تمام بت ان صالح بندوں کے نام سے تھے جب یہ صالح افراد مر گئے تو شیطان نے اس قوم سے کہا کہ اپنی مجالس میں ان صالح بندوں کے مجسمے رکھیں اور ان (مجسموں) کو ان کے نام سے پکاریں انھوں نے ایسا ہی کیا انکے بعد دوسری نئی نسل آئی تو شیطان نے اس نئی نسل سے کہا کہ تمہاری آباؤ اجداد انہی بتوں کی پرستش کرتے تھے اور انھیں سے اپنے آرزوئیں مانگتے تھے لہٰذا تم بھی ایسا ہی کرو۔ لیکن عرب جاہلیت کے نزدیک ان بتوں کے علاوہ اور بھی بت تھے جنکے نام یہ ہیں:

(۱) ود: ود بنی کلب

(۲) سواع: سواع بنی ھذیل

(۳) یغوث: یغوثِ غطفان

(۴) یعوق: یعوقِ ھمدان

(۵) نسر: نسرِ حمیر آل ذی الکلاع

لیکن بعثتِ اسلام سے پہلے سرزمین حجاز کے مشرکین ان کے علاوہ مندرجہ ذیل بتوں کی بھی پوجا کرتے تھے:

(۱) لات: یہ طائف میں قوم ثقیف کا بت تھا۔

(۲) عزیٰ: یہ قوم سلیم، غطفان اور جشن کے بت تھے۔

(۳) منات: یہ قوم خزاعہ کے بت تھے۔

(۴) اساف، نائلۃ، ہبل: یہ اہل مکہ کے بت تھے۔

لیکن ہبل سب سے بڑے بت کا نام ہے، جو کعبہ کی چھت پر نصب تھا۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام

قصہ ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام

ابراھیم بن تارخ یا تسارخ بن باحور بن ساروغ بن راعو بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفشد بن سام بن نوح۔ قرآنِ کریم میں حضرت ابراہیمؑ کو ان صفات کے ساتھ یاد کیا ہے:

۱۔ صدیق: ﴿انه كان صديقًا نبيًا﴾ ''وہ یقیناً راستگو نبی تھے'' (مریم/۵۰)

۲۔ خلیل: ﴿واتخذ الله ابرٰهيم خليلًا﴾ ''اور ابراہیم کو تو اللہ نے اپنا دوست بنایا ہے'' (نساء/۱۲۵)

۳۔ حنیف و مسلم: ﴿ما كان ابراهيم يهوديًا ولا نصرانيًا ولكن كان حنيفًا مسلمًا﴾ ''ابراہیم نہ یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ وہ یکسوئی کے ساتھ مسلم تھے'' (آل عمران/۶۷)

۴۔ شاکرِ نعمت:

﴿شاكرًا لانعمه﴾ ''(وہ) اللہ کی نعمتوں کے شکر گزار تھے'' (نحل/۱۲۱)

۵۔ قانتا: ﴿قانتًا لله﴾ ''اللہ کے فرمانبردار'' (نحل/۱۲۰)

۶۔ امام: ﴿قال انى جاعلك للناس امامًا﴾ ''ارشاد ہوا: میں تمہیں لوگوں کا امام بنانے والا ہوں'' (بقرہ/۱۲۴)

قرآنِ کریم کی جن سوروں میں ابراہیمؑ کا ذکر آیا ہے:

البقرة	۲	۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۳۰، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۴۰، ۲۵۸، ۲۶۰			
آل عمران	۳	۳۳، ۶۵، ۶۷، ۶۸، ۸۴، ۹۵، ۹۷			
النساء	۴	۵۴، ۱۲۵، ۱۶۳	الانعام	۶	۷۴، ۷۵، ۸۳، ۱۶۱
التوبة	۹	۷۰، ۱۱۴	هود	۱۱	۶۹، ۷۴، ۷۵، ۷۶

سورہ	سورہ نمبر	آیت نمبر
یوسف	۱۲	۶،۳۸
ابراھیم	۱۴	۳۵
الحجر	۱۵	۵۱
النحل	۱۶	۱۲۰،۱۲۳
مریم	۱۹	۴۱،۴۶،۵۸
الانبیاء	۲۱	۵۱،۶۰،۶۲،۶۹
الحج	۲۲	۲۶،۳۳،۷۸
الشعراء	۲۶	۶۹
العنکبوت	۲۹	۱۶،۳۱
الاحزاب	۳۳	۷
الصافات	۳۷	۸۳،۱۰۴،۱۰۹
ص	۳۸	۴۵
الشوریٰ	۴۲	۱۳
الزخرف	۴۳	۲۶
الذاریات	۵۱	۲۴
النجم	۵۳	۳۸
الحدید	۵۷	۲۶
الممتحنة	۶۰	۴
الاعلیٰ	۸۷	۱۹

حضرت ابراہیم علیہ السلام

حضرت ابراہیمؑ کی سیرت طیبہ میں چند امور ایسے ملتے ہیں جن کی وجہ سے قصہ ابراہیمؑ کے بیان میں تسلسل کے ساتھ بحث کرنے میں دو قسم کی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے اگر اس موضوع سے اجمال اور خلاصہ سے گزریں گے تو اس موضوع کا حق ادا نہیں ہوگا اور قاری کے لیے موضوع تشنہ طلب رہے گا۔ اگر ان امور کو تفصیل اور وضاحت سے بیان کریں گے تو آگے چل کر تسلسل ٹوٹ جائے گا آنے والے قصے کا حصہ پہلے سے بے ربط اور اجنبی ہو جائے گا اور قاری کے لیے اس میں ربط قائم رکھنا مشکل ہو جائے گا لہذا ہم نے مناسب سمجھا ان امور سے متعلق گفتگو کو قصہ سے پہلے بیان کریں تاکہ بحث کا صحیح معنوں میں حق ادا ہو جائے اور قصہ بھی اپنے تسلسل کو باقی رکھ سکے لہذا مناسب سمجھا کہ جن نکات پر بحث ہونی چاہیے ان پر پہلے بحث کریں اور قصہ کو اپنے تسلسل کے ساتھ آخر میں لائیں۔ جن امور میں پہلے بحث ہونا ضروری ہے وہ امور مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ **والد ابراہیمؑ:** حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد موحّد وخدا پرست تھے یا مشرک کیونکہ جس شخص کو ابراہیمؑ نے "یا ابت" کہا ہے وہ مشرک تھا آیا وہی ابراہیم کے والد تھے یا کوئی اور؟۔

۲۔ **حضرت ابراہیمؑ اور بت پرستی کے خلاف جنگ:** حضرت ابراہیمؑ دیگر انبیاء کی بنسبت بتوں کے ساتھ وسیع پیمانے پر نبرد آزما ہوئے، بُتِ انسان، بُتِ نجوم وسیارات بت شمسی وقمری اور بت ساز و بت فروشی سب کے ساتھ بیک وقت مقابلہ ہو گیا اس حوالے سے دین و دیانت میں بُت، بُت پرستی، بُت فروشی اور بُت فروغ کرنے والوں کے ساتھ دین داروں کی ذمہ داری بھی ایک اہم موضوع ہے۔

۳۔ **حضرت ابراہیمؑ اور ذبحِ ولد:** حضرت ابراہیمؑ نے حکمِ خدا کے تحت منیٰ میں قربانی

کی خاطر اپنے فرزند کی گردن پر چھری چلائی لیکن خدا نے اس کے بدلے میں فدیہ دیا اس مناسبت سے ہم ایک انسان کا دوسرے انسان کو خدا کی درگاہ میں پیش کرنے یا ذبح کرنے کی حیثیت کے بارے میں گفتگو کریں گے۔

ا۔ حضرت ابراہیمؑ اور مشرک باپ آزر

انبیاء کرام علیہم السلام کے والدین کا خدا پرست اور موحد ہونا ضروری ہے یا نہیں ،اس پر بحث وگفتگو کا مناسب مقام حیاتِ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی ہے کیونکہ آپؑ نے اپنی دعوت کے آغاز کے موقع پر ایک بت پرست اور بت فروش جسکا نام ''آزر'' تھا، اس سے یوں خطاب کیا:

﴿اذقال ابراھیم لابیہ آزر اتتخذ اصناما آلھۃ﴾ ''اور جب ابراہیم نے اپنے باپ (چچا) آزر سے کہا: کیا تم بتوں کو معبود بناتے ہو؟'' (انعام/۷۴)

اور اس سے بت پرستی چھوڑنے کی دعوت دی اس سلسلے میں پانچ زاویوں سے گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔ مفسرین ومورخین نے حضرت ابراہیمؑ کی باپ کو مشرک قرار دیا ہے وہ ان آیات سے استفادہ کرتے ہیں:

جن مفسرین نے ''آزر'' کو حضرت ابراہیمؑ کا والد قرار دیا ہے انھوں نے اسکے ثبوت میں قرآن کی سورۂ مبارکہ مریم کی آیت ۴۳، ۴۴، ۴۵ سے استدلال کیا ہے۔ ان آیات میں حضرت ابراھیم علیہ السلام نے اس بت ساز کو اے میرے باپ کہہ کر خطاب کیا ہے:

﴿یابت انی قد جاء نی من العلم﴾ ''اے ابا: بتحقیق میرے پاس وہ علم آیا ہے'' (مریم/۴۳) ﴿یابت لا تعبد الشیطن﴾ ''اے ابا: شیطان کی پوجا نہ کریں'' (مریم/۴۴) ﴿یابت انی اخاف ان یمسک عذاب من الرحمن﴾ ''اے ابا: مجھے خوف ہے کہ خدائے رحمٰن کا عذاب آپ کو گرفت میں لے لے''

اس نظریے کے مقابل میں اکثر وبیشتر مورخین اور مولفین قصص انبیاء نے حضرت ابراہیمؑ کے

باپ کو موحد قرار دیا ہے وہ حضرات یہ کہتے ہیں کہ ہم پہلے آزر اور معنی اب کے بارے میں تحقیق کریں گے:

ا۔ آزر: آزر قوت، شدت کے معنوں میں آیا ہے اس کے علاوہ ازار شلوار کو بھی کہتے ہیں اس کے آخر میں ت بھی آتا ہے اس طرح آزار مدد کرنے کو بھی کہتے ہیں سورہ مبارکہ طٰہٰ آیت ۳۱ میں آزر بامعنی قوت وقدرت کے آیا ہے:

﴿اشدد بہ ازری﴾ ''اس کے ذریعے میرا ہاتھ مضبوط کر''

بعض نے کہا ہے کہ ''آزر'' کمر کو باندھنے کو کہتے ہیں۔

تفسیر طبری میں آزر کے بارے میں چار نظریے پیش کیے گئے ہیں:

ا۔ یہ اسم علم ہے۔

۲۔ یہ اسم منادی ہے جہاں حرف معروف ہے۔

۳۔ آزر بت کا نام ہے یعنی ابراہیم نے اپنے باپ سے کہا بت کو چھوڑے۔

۴۔ آزر ایک صفت ہے آزر کے معنی منحرف اور خطا کار اور فرسودہ، بوڑھا، بازو، قوت، توانائی کے ہیں۔

جس شخص کو ابراہیمؑ نے باپ کہا ہے، اس کا نام ''آزر'' تھا آیا آزر اُس کا اسم علم تھا یا اُس کی صفات و القابات میں شمار ہوتا تھا۔

علماء و مورخین کا انساب اور محققین قصص انبیاء کے نزدیک آزر حضرت ابراہیمؑ کے حقیقی باپ نہیں تھے بلکہ ان کے باپ کا نام بعض نے تارح بعض نے تارخ بعض نے تسارخ کہا ہے حضرت ابراہیم کا آزر سے کیا رشتہ تھا اس سلسلے میں چند نظریئے پائے جاتے ہیں:

ا۔ آزر اسم اصلی ہے ابی کے بدل میں آیا ہے۔

۲۔ آزر منادا (ندا) ہے آزر۔

۳۔ آزر ایک بت ہے ابراھیم نے آزر سے کہا اس بت کی پرستش مت کرو۔

۴۔ آزر صفت ہے اس انسان کی جس کی طبیعت منحرف ہو منحرف طبیعت غلط کرنے والے نا سمجھ بوڑھے کا معنی ہے۔

۵۔ آزر با معنی بازو قوت وطاقت کے ہیں یعنی بت کو مایۂ طاقت وقدرت سمجھ میں لیا ہے۔

۶۔ آزر مادہ وزر سے بنایا ہے جس کا معنی گناہ ہے۔

آزر کا ذکر سورۂ انعام آیت نمبر ۷۵ میں آیا ہے:

﴿واذقال ابرٰهیم لابیه ازراتتخذاصناماً الهة﴾ ''اور جب ابراہیم نے اپنے باپ (چچا) آزر سے کہا: کیا تم بتوں کو معبود بناتے ہو؟'' آزر یہ اسم بابلی یا آریائی زبان ہے۔

۷۔ بعض نے کہا ہے آزر عبرانی زبان کے آزر اس ''ز'' سے بنا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کے باپ کے بارے میں وارد آیتوں کو ایک دوسرے سے جوڑنے کے بعد واضح ہو جاتا ہے آزر حضرت ابراھیم کا باپ نہیں تھا جس کی چند دلیل پیش کرتے ہیں۔

۱۔ ''اب'': حضرت ابراہیمؑ نے آزر سے ''اب'' کہہ کر پکارا:

﴿یابت انی اخاف﴾ ''اے ابا! مجھے خوف ہے'' (مریم/۴۵)

ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ لغتِ عرب اور قرآن کریم میں یہ کلمہ کن کن رشتوں کے بارے میں استعمال ہوا ہے اسی طرح کہاں پر یہ کلمہ مجازی معنوں میں اور کہاں پر اپنے حقیقی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

''اب'': اس کی اصل ''ابوٌ'' ہے اور اس کا مصدر ''ابوۃ'' ہے کسی چیز کے بنانے میں یا اس کی اصلاح کرنے میں یا اس کے ظاہر ہونے میں جس کا کردار ہوا سے ''اب'' کہتے ہیں جیسا کہ پیغمبر اکرمؐ

کو "اب المومنین" کہتے ہیں لیکن سورۂ احزاب کی آیت ۴۰ میں میں پیغمبر اکرم کی ابوت کی جو نفی کی گئی ہے اس سے مراد بنوت تبنی کی نفی کی ہے:

﴿ما کان محمد ابا احد من رجالکم﴾ "محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں ہیں"

ابِ اصلاح: خاتم المرسلین حضرت محمدؐ نے امام المتقین علیؑ سے فرمایا: "میں اور آپ اس امت کے باپ ہیں"

اب الحرب: جو جنگ کی آگ کو روشن کرے اُسے "اب الحرب" کہتے ہیں۔

اب الضیوف: مہمان نوازی کرنے والے کو "اب الضیوف" کہتے ہیں۔

لغتِ عرب میں باپ دادا' پردادا' چچا' ماں اور خالہ ان سب کیلئے لفظِ "اب" استعمال ہوا ہے قرآنِ کریم میں بھی یہ کلمہ انھیں رشتوں کے لئے استعمال ہوا ہے۔ سورۂ یوسف کی آیت ۱۰۰ میں ماں باپ دونوں کے لئے کلمہ "ابویہ" استعمال ہوا:

﴿ورفع ابویه علی العرش﴾ "اور یوسف نے والدین کو تخت پر بٹھایا"

سورۂ بقرہ کی آیت ۱۳۳ میں حضرت یعقوب علیہ السلام کے فرزندوں نے اپنے دادا اسحاقؑ ابراہیمؑ اور چچا اسماعیلؑ کے لئے لفظِ "آبائک" استعمال کیا ہے:

﴿قالوا نعبد الٰهك واله ابائك ابراهيم واسمٰعيل واسحٰق الٰهاً واحداً﴾ "سب نے کہا: ہم اس خدائے واحد کی بندگی کریں گے جو آپ کا اور آپ کے آباء و اجداد ابراہیم' اسماعیل اور اسحاق کا معبود ہے"

جب ہم کلمہ "اب" کے مصادیق کو کتب لغت اور قرآن میں تلاش کرتے ہیں تو یہ کلمہ بطور مفرد اور جمع دونوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورہ یوسف آیت ۳۸ میں یہ کلمہ بطور جمع استعمال ہوا ہے:

﴿واتبعت ملة اباءی ابراهیم و اسحق و یعقوب﴾ "اور میں نے تو اپنے اجداد

ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کے مذہب کو اپنایا ہے"

یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے آباء میں حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحاقؑ، حضرت یعقوب علیہ السلام تینوں کو شامل ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے جہاں کلمہ "اب" صلبی باپ کیلیے استعمال ہوا ہے وہاں ہی دادا اور پردادا کیلیے بھی استعمال ہوتا ہے کیونکہ اسحاقؑ اور ابراہیمؑ یوسفؑ کے دادا اور پردادا ہیں۔ سورۂ بقرہ آیت ۱۳۳ میں فرزندان یعقوبؑ نے اپنے باپ یعقوبؑ کے سوال کے جواب میں کہ تم میرے بعد کس کی پرستش کروگے کہا آپ کے خدا اور آپ کے آباء کے خدا کی یہاں ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاق کا ذکر ہے اسحاقؑ، یعقوبؑ کے باپ ہیں ابراہیمؑ دادا اور اسماعیلؑ چچا ہیں اور ان سب کیلیے "اب" استعمال ہوا ہے۔

کلمہ "اب" کے استعمال کے موارد واضح اور روشن ہونے کے بعد یہ کلمہ صرف حقیقی باپ سے ہی مخصوص نہیں بلکہ باپ کے ساتھ دادا، پردادا، اور چچا کیلیے بھی قرآن اور عربی زبان میں استعمال ہوا ہے اس کے بعد ان آیات سے یہ نتیجہ نکالنا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انھیں اپنا حقیقی باپ ہی کہا ہے صحیح نہیں رہتا لہٰذا ہمیں انکے حقیقی باپ کی تلاش و جستجو کیلیے قرآن کی دیگر آیات جو انکی زندگی سے متعلق ہیں رجوع کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۔ برائت ابراہیم از آزر:

حضرت ابراہیمؑ جب آزر کے ایمان لانے سے مایوس ہوگئے تو آپؑ نے ان سے جدائی اور دوری کا اعلان کیا۔

۳۔ حرمت استغفار مشرک

خداوند متعال نے انبیاءِ کرامؑ اور مومنین کو مشرکین کے لئے استغفار طلب کرنے سے منع فرمایا ہے۔

مردہ مشرکین کیلئے مغفرت طلب نہیں کی جاسکتی:

ایک اصول جو قرآن میں بطور واضح پیش ہوا ہے۔ وہ انبیاء و مومنین کو یہ حق حاصل نہیں وہ شرک پر مرنے والوں کیلئے طلب مغفرت کریں۔ سورۃ توبہ آیت ۱۱۳ میں ابراھیمؑ بت شکن تو درکنار یہ حق عام مومنین کو بھی نہیں کہ وہ مردہ مشرکین کیلئے طلب استغفار کریں:

﴿ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفرو للمشرکین﴾ ''نبی اور ایمان والوں کو یہ حق نہیں پہنچتا کو وہ مشرکوں کے لیے مغفرت طلب کریں'' (توبہ/۱۱۳)

لیکن جب ہم ابراھیم علیہ السلام کی زندگی سے متعلق آیات کی طرف رخ کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ حضرت ابراھیم علیہ السلام اپنے والدین کی مغفرت کیلئے دعا گو ہیں:

﴿ربنا اغفرلی ولوالدی وللمومنین یوم یقوم الحساب﴾ ''ہمارے رب مجھے اور میرے والدین اور ایمان والوں کو بروز حساب مغفرت سے نواز'' (ابراھیم/۴۱)

اس آیت سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے آزر ابراھیم علیہ سلام کا باپ نہیں کیونکہ ابراھیم علیہ السلام نے اپنے والدین کیلئے طلب مغفرت کی لہٰذا وہ آپؑ کے حقیقی باپ یقیناً مشرکین میں سے نہیں ہو سکتے بلکہ وہ مواحد اور خدا پرست تھے۔ اگر کوئی سورۃ مریم ۴۷ اور ممتحنہ ۴ سے استدلال کرے کہ ابراھیمؑ نے آزر کیلئے طلب مغفرت کی ہے تو اسکا جواب خود ان آیات میں ہے کہ یہاں طلب مغفرت مشروط ہے کہ آزر بت پرستی چھوڑ دیں تو ابراھیم علیہ السلام طلب استغفار کریں گے۔

والد حضرت ابراھیمؑ کا تعین:

قرآن کریم میں جس سے حضرت ابراھیمؑ نے ''یا آبا'' کہہ کر خطاب کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپؑ کے والد'' آزر'' نہیں تھے جو آپ کی دعوت توحید کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہوئے بت پرستی میں مرے آیا یہی آپؑ کے چچا یا کوئی اور رشتہ دار تھے یا آپؑ کے والد حقیقی وہ ہیں جنکا نام ماہر

ین وانساب اور محققین سیر وتاریخ نے ''تارخ'' بتایا ہے جن کے حق میں تعمیر بیت کے موقع پر طلب مغفرت کی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ موحد تھے کیونکہ کسی مسلمان انسان یا نبی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کسی شرک پر مرنے والے کے لیے طلب مغفرت کرے۔

۴۔ ابراہیمؑ کی اپنے والدین کے لئے مغفرت:

تعمیر کعبہ کے اختتام پر حضرت ابراہیمؑ نے اپنے والدین کے لئے دعائے مغفرت کی ہے۔

ذبح عظیم کا فدیہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب بابل سے ہجرت کر کے فلسطین کی طرف گئے تو وہاں درگاہ خداوندی سے اپنے لئے اولاد صالح کی دعا کی تو خداوند متعال نے ان کی دعا کو قبول فرمایا:

''پروردگار! مجھے صالحین میں سے (اولاد) عطا کر چنانچہ ہم نے انھیں ایک بردبار بیٹے کی بشارت دی پھر جب وہ ان کے ساتھ کام کاج کی عمر کو پہنچا تو کہا: اے بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس دیکھ لو تمہاری کیا رائے ہے اس نے کہا: اے ابا جان! آپ کو جو حکم ملا ہے اسے انجام دیں اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے پس جب دونوں نے (حکم خدا کو) تسلیم کیا اور اسے ماتھے کے بل لٹا دیا تو ہم نے ندا دی: اے ابراہیم! تو نے خواب سچ کر دکھایا بے شک ہم نیکوکاروں کو ایسے جزا دیتے ہیں یقیناً یہ ایک نمایاں امتحان تھا اور ہم نے ایک عظیم قربانی سے اس کا فدیہ دیا اور ہم نے آنے والوں میں ان کیلئے (ذکر جمیل) باقی رکھا'' (صافات/۱۰۰تا۱۰۸)

یہاں سے ہر شخص کی ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے آیا انسان کشی سے بھی خدا سے قرب حاصل کیا جا سکتا ہے اگر ایسا ہے تو اس سے دین اسلام دشمنوں کے نقد و تنقید کا نشانہ بنے گا اور بعض گمراہ اور لادین ادیان بھی اس کو اپنے غلط عمل کیلئے سند بنائیں گے لہٰذا ضروری سمجھتے ہیں انسان کی

قربانی کے مسئلہ پر بحث کی جائے:

ارمان وآرزوں کی خاطر انسانی قربانی:

اپنی حاجتوں آرزوؤں تک رسائی یا خدا کی خوشنودی کی خاطر کسی اور انسان کو یا اپنی عزیز اولاد کو ذبح کرنے کی داستانوں کو دینی رنگ پہنایا گیا ہے جس میں سے چند کا ہم تذکرہ کریں گے۔

۱۔ حضرت اسماعیل کی قربانی جو سورہ صافات آیت نمبر ۱۰۰ سے ثابت ہے۔

۲۔ حضرت عیسیٰ روح اللہ کی قربانی جسے یہودیوں اور مسیحیوں کی کتب میں گھڑا گیا ہے۔

۳۔ حضرت عبداللہ کی قربانی کی داستان جسے یہودیوں نے گھڑ کر مسلمانوں کی کتب میں شامل کیا ہے۔

نذر عبدالمطلب سے متعلق تاریخ طبری جلد اول میں بیان کیا گیا ہے راوی کہتا ہے ہم ایک دن معاویہ ابن ابی سفیان کے دربار میں بیٹھے ہوئے تھے کہ ذبح حضرت اسماعیلؑ یا اسحاق ہونے کا سوال اٹھا تو معاویہ نے کہا تم حقیقت سے تم دور ہو گئے ہو ایک دن ہم رسول اکرمؐ کے پاس بیٹھے تھے تو ایک شخص رسول اللہؐ کے پاس آکر مخاطب ہوا یا رسول اللہ خدا نے جن نعمتوں سے آپ کو نوازا ہے وہ مجھے ایک ایک کرکے بیان کریں۔ جن میں سے ایک ذبیحین بھی ہے پیغمبر مسکرائے تو کسی نے پوچھا یا رسول اللہؐ ذبیحین کون ہیں تو آپؐ نے فرمایا عبدالمطلب کو جب حکم ہوا وہ چاہ زم زم کھودے تو انھوں نے خدا سے نذر کی اگر اس میں مجھے آسانی ہو جاتے تو میں ایک بیٹے کو ذبح کروں گا جب نوبت آئی تو قرعہ عبداللہ کے نام پر نکلا تو عبداللہ کے ماموں نے منع کیا اور اپنے بیٹے کا سو اونٹ فدیہ دیا یہی قصہ کامل فی التاریخ ابن اثیر میں بھی بغیر کسی سند کے درج ہے۔

دوسری روایت جب حضرت عبدالمطلب نے دیکھا کہ پورے قریش ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہیں تو خدا سے نذر کی اگر خدا نے انہیں دس بیٹے دیے اور وہ بڑے ہو گئے اور ان سے دفاع کرنے لگے اور قریش کے مقابلے کیلئے اٹھے تو تقرب خدا کی خاطر ایک کو ذبح کروں گا یہ قصہ اور

جگہ پر بھی ذکر ہوا ہے۔

تیسری روایت عبدالمطلب نے جب چاہ زم زم کھودنا چاہا تو قریش نے انکی مخالفت کی توانھوں نے نذر کی کہ اگر خدا نے ان کو دس فرزند عطا کیے اور وہ اس عمر کو پہنچے کہ قریش کے مقابلے میں ان کے ساتھ اٹھ کھڑے ہوں اور ان سے دفاع کریں تو ان میں سے ایک کو کعبہ لے جا کر قربان کروں گا جب ان کی تعداد دس ہوگئی اور وہ اس مرحلے پر پہنچے ان کا دفاع کرسکیں تو عبدالمطلب نے اپنے بچوں کو اس نذر سے آگاہ کیا انھوں نے اطاعت کی اور کہا اس سلسلے میں ہم کیا کرسکتے ہیں تو عبد المطلب نے کہا تم میں سے ہر شخص ایک ایک برتن اٹھائے اس میں اپنا اپنا نام لکھے اور ان کو کعبہ کے اندر سب سے بڑے بت ہبل کے سامنے رکھ دے۔ عبدالمطلب نے قرعہ نکالنے والے سے کہا یہ برتن ہمارے بیٹوں کے ہیں میں نے ان میں سے ایک کو ذبح کرنے کی نذر کی ہے آپ ان میں سے ایک کے نام قرعہ نکالیں ان فرزندوں میں سب سے چھوٹے اور عزیز عبداللہ تھے۔ قرعہ نکالنے والے جب قرعہ نکالنے کیلیے اٹھے تو عبدالمطلب دعا کرنے لگے، قرعہ نکالنے والے نے عبداللہ کے نام پر قرعہ نکالا تو عبدالمطلب اس کے ہاتھ کو پکڑ کر بت اساف اور نائلہ کے پاس لائے تا کہ وہاں ذبح کریں تو قریش بے ساختہ اٹھ کھڑے ہوئے اور عبدالمطلب سے کہا تم کیا چاہتے ہو۔ خدا کی قسم اس کو ذبح نہ کریں ہم اس کے متبادل کی چارہ جوئی کریں گے اگر یہ سلسلہ چل پڑا تو یہ ایک سنت بن جائے گی اور ہمارے سارے بیٹے ذبح ہوں گے تو مغیرہ بن عبداللہ بن عمرو بن مخزوم نے کہا اگر کاہن مال فدیہ دینے کیلیے کہے تو تمہارے لئے آسان ہوگا وہ سب اس کے پاس گئے تو اس نے اونٹ کے فدیہ کے بارے میں حکم دیا تو عبداللہ اور اونٹ میں قرعہ اندازی ہوئی جب اونٹوں کی تعداد سو کو پہنچی تو عبداللہ کی جگہ اونٹوں کے نام قرعہ نکلا اس طرح عبداللہ ذبح ہونے سے بچ گئے یہاں سے عبداللہ کا لقب ذبیح ہوا۔

تیسرا واقعہ جسے عام طور پر ذاکرین اور مقررین مصیبت امام حسین علیہ السلام میں ذکر کرتے

ہیں کہ امام حسینؑ نے علی اکبرؑ اور علی اصغرؑ کو خدا کی رضائیت حاصل کرنے کیلئے انھیں ذبح ہونے کیلئے پیش کیا۔

یہاں دنیائے کفر و شرک کی طرف سے یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ اسلام کیسا مذہب ہے جہاں انسانوں کی قربانی کی سنت رائج ہے اس مذہب کی کیا منطق ہو سکتی ہے اسکے علاوہ اس عمل میں کونسی خوبی وحسن ہے جبکہ انکا دین خود کہتا ہے کوئی انسان کسی انسان کا بندہ نہیں بلکہ انسان پیدا ہوتے ہی آزاد پیدا ہوتا ہے۔ اگر والد دادا یا کسی ولایت کو تصرف حاصل ہے تو وہ صرف خیر خواہی تک محدود ہے چنانچہ نہج البلاغہ کلام نمبر ۳۱ پیراگراف نمبر ۸۷ میں ہے:

''تم کسی کے بندے نہیں خدا نے تمہیں آزاد قرار دیا ہے''۔ تو یہ کیسے ممکن ہے کہ ابراہیم خلیل اللہ اپنے بیٹے کو اپنے محبوب کی خاطر قربان کریں اور اسی طرح حضرت عبد المطلب اپنی خواہش وارمان کی خاطر اپنے بیٹے کو قربان کریں۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کام کرنے سے انکی خواہش و ارمان تو چلیں پوری ہوئیں وہ تو خدا سے نزدیک ہوئے لیکن مقتول بے چارے کا کیا قصور تھا اس منطق سے خود مذہب کے اصول وقوانین میں ہی نظر آتی ہے اس کے علاوہ تمام اقوام وملل خصوصی طور پر کتب آسمانی خاص طور پر قرآن کریم کی کثیر آیات میں انسان کشی کو ایک بڑا جرم قرار دیا ہے ممکن ہے غیر مسلم یہ سوال اٹھائیں ہم مانتے ہیں پورا قرآن ٹھیک ہے لیکن آپ ہمیں اس سوال کا جواب دیں، لہٰذا یہ سوال ان افراد کیلئے تو کوئی مسئلہ نہیں جو ذاکر اور خطیب سے تمام ضد و نقیض سننے کے عادی ہیں انکا کام تو بس سننا اور جاتے ہوئے تبرک لے کر جانا ہے یہ اپنے اوپر کسی ذمہ داری کا احساس نہیں کرتے اور کہتے ہیں تحقیق کرنا ہماری ذمہ داری نہیں اور خاص کر ایسی جگہ جہاں تحقیق کرنے والے کو ''مفسد فی الارض'' کا لقب دیا جاتا ہو وہاں وہ افراد جو اسلامی آئیڈیالوجی کا دفاع کرنا چاہیں وہ کہاں جائیں وہ ان مخالفین کے پھیلائے جانے والے اشکال واعتراضات کا کیا جواب دیں۔ یہ سوال ایک چیلنج ہے قارئین کرام کے سامنے کتاب میں اس سوال کا جواب پڑھنے

سے پہلے ان افراد سے درخواست کریں جو نقد و اعتراض کرنے کے عادی ہیں وہ اس سوال کا جواب ازخود پیش کریں اور ہمیں اپنے خیالات سے نوازیں۔

قتل نفس

۱۔ کسی انسان کو تکلیف وضرر پہچانے یا قتل کرنے کا حق صرف اس کے مالک حقیقی کو ہی حاصل ہے۔اس کائنات میں ملکیت حقیقی صرف خدا کو حاصل ہے۔مِلک، مُلک، مالِک سب کا مادہ ایک ہی ہے ان تمام کے مفہوم کی برگشت کسی چیز پر تسلط اور غلبہ حاصل ہونے کی طرف ہے یہ تسلط اور غلبہ ذات اور فرع دونوں سے متعلق ہو سکتا ہے۔

۲۔ **اعتباری ملکیت:** یعنی شریعت نے ایک چیز کو کسی انسان کی ملکیت کی طرف نسبت دی ہے جیسے غلام، کنیز اور دیگر متاع دنیا وغیرہ۔

۳۔ **ملکیت منافع:** کسی چیز کی منفعت پر تسلط حاصل ہوتا ہے۔جیسے کرایہ اور نکاح وغیرہ۔

۴۔ **ملکیت حکومتی:** اجتماع کے نفع ونقصان کا اختیار ہونا۔

۵۔ **ملکیت نفس:** ایک مہذب انسان اپنے نفس پر تسلط حاصل کرتا ہے۔

مندرجہ بالا ملکیت میں انسان کا دوسرے انسان پر حق تصرف ایک محدود حد تک ہی ہے اور اسکی حدود قرآن وسنت میں بیان ہوئی ہیں لیکن تسلط کامل صرف مالک حقیقی کو ہی حاصل ہے وہ خالق محی و ممیت و مربی ہے اور وہ ذات باری تعالیٰ ہی ہے مندرجہ ذیل آیات کریمہ ملاحظہ فرمائیں:

﴿قل اللهم مالك الملك تؤتي الملك من تشاء وتنزع الملك ممن تشاء وتعز من تشاء وتذل من تشاء بيدك الخير﴾ ''کہہ دیجئے: اے اللہ! اے مملکت (ہستی) کے مالک تو جسے چاہے حکومت دیتا ہے اور جس سے چاہے حکومت چھین لیتا ہے اور تو جسے چاہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہے ذلیل کر دیتا ہے بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے'' (آل عمران ۲۶) آل عمران ۱۸۹، توبہ ۱۱۶، مائدہ ۱۲۰، اسراء ۱۱۱۔

لہذا جسکی ملکیت محدود ہے اسکا ان حدود سے زائد تصرف کرنا ظلم کہلائے گا کسی انسان کو دوسرے انسان کو مارنے یا قتل کرنے کا حق حاصل نہیں مگر جہاں خدا کا حکم موجود ہو چنانچہ قرآن کریم کی کثیر آیات میں قتل نفس کی ممانعت آئی ہے سوائے وہاں جہاں مالک حقیقی کی طرف سے حکم ہو۔

موجودہ تمام ادیان میں قتل نفس امہات محرمات جیسے شراب، جھوٹ، فساد فی الارض سے بھی زیادہ بڑا گناہ ہے۔

۱۔ خود اپنے نفس کو قتل کرنے کی ممانعت:

﴿ولا تقتلوا انفسکم﴾ ''اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو'' (نساء/۲۹)

۲۔ کسی کو ناحق قتل کرنے کا کسی کو حق نہیں اور غلطی پر کفارے کا ذکر:

﴿ومن قتل مؤمنا خطأ فتحریر رقبۃ مؤمنۃ ودیۃ مسلمۃ الی اھلہ الا ان یصدقوا﴾ ''اور جو شخص کسی مومن کو غلطی سے قتل کردے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ ایک مومن کو غلامی سے آزاد کرے اور مقتول کے وارثوں کو خون بہا دے یا پھر یہ کہ وہ خون بہا معاف کردیں'' (نساء/۹۲)

۳۔ جو کسی مومن کو قتل کرے گا اسکا ٹھکانہ جہنم ہے اور اس پر خدا کا عذاب:

﴿ومن یقتل مؤمنا متعمدا فجزاء جھنم﴾ ''جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرے تو اس کی جزا جہنم ہے'' (نساء/۹۳)

۴۔ خود کو قتل کرنے والے سے کہنا میں یہ عمل تمہارے ساتھ نہیں کرونگا:

﴿لئن بسطت الی یدک لتقتلنی ما انا بباسط یدی الیک لاقتلک﴾
''اگر تو مجھے قتل کرنے کیلیے ہاتھ بڑھائے گا تو میں تجھے قتل کرنے کیلیے ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا'' (مائدہ/۲۸)

۵۔ بھائی نے بھائی کو قتل کیا اور خسارے میں رہا:

﴿فطوعت له نفسه قتل اخيه فقتله فاصبح من الخاسرين﴾ ''آخر کار اس کے نفس نے اپنے بھائی کا قتل اس کیلئے آسان کر دیا اور وہ اسے مار کر ان لوگوں میں شامل ہو گیا جو نقصان اٹھانے والے ہیں'' (مائدہ/۳۰)

۶۔ جس نے کسی ایک شخص کو قتل کیا اس نے پوری انسانیت کو قتل کیا:

﴿من قتل نفسًا بغير نفسٍ او فسادٍ في الارض فكانما قتل الناس جميعًا﴾ ''جس نے کسی انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا'' (مائدہ/۳۲)

۷۔ قتل روئے زمین میں سرکشی کے برابر ہے:

﴿كما قتلت نفسًا بالامس ان تريد الا ان تكون جبارًا في الارض﴾ ''جس طرح کل ایک شخص کو قتل کر چکا ہے؟ تو اس ملک میں جبار بن کر رہنا چاہتا ہے'' (قصص/۱۹)

۸۔ قتل اولاد کی مذمت:

﴿قد خسر الذين قتلوا اولادهم سفهًا بغير علم﴾ ''یقیناً خسارے میں پڑ گئے وہ لوگ جنھوں اپنی اولاد کو جہالت و نادانی کی بنا پر قتل کیا'' (انعام/۱۴۰)

۹۔ بغیر حق کسی کو قتل نہیں کر سکتے:

﴿ولا تقتلوا النفس التي حرم الله الا بالحق﴾ ''اور کسی جان کو جسے اللہ نے محترم ٹھیرایا ہے ہلاک نہ کرو مگر حق کے ساتھ'' (انعام/۱۵۱)

۱۰۔ اولاد کو فاقہ کے خوف سے قتل نہ کرو:

﴿ولا تقتلوا اولادكم خشية املاق﴾ ''اپنی اولاد کو افلاس کے اندیشے سے قتل نہ کرو'' (اسراء/۳۱)

۱۱۔ مقتول کے ولی کو قصاص کا حق:

﴿ومن قتل مظلومًا فقد جعلنا لولیه سلطانًا﴾ ''اور جو شخص مظلومانہ قتل کیا گیا ہو اس کے ولی کو ہم قصاص کے مطالبے کا حق عطا کیا ہے'' (اسراء/۳۳)

۱۲۔ اولاد کو قتل کرنے والے سے بیعت نہ لینا:

﴿یآ ایھا النبی اذا جآءك المؤمنٰت یبایعنك علیٰٓ ان لا یشرکن باللہ شیئًا ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلوا اولادھن﴾ ''اے نبی، جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کیلئے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی، زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کریں گی'' (ممتحنہ/۱۲)

۱۳۔ انسان کا خلیفہ بننے کے موقعہ پر فرشتوں کی گفتگو:

﴿واذ قال ربك للملٰٓئکة انی جاعل فی الارض خلیفةً قالوا اتجعل فیھا من یفسد فیھا ......﴾ ''پھر ذرا اس وقت کا تصور کرو جب تمہارے رب نے فرشتوں سے کہا تھا کہ میں زمین میں ایک خلیفہ بنانے والا ہوں انھوں نے عرض کیا: کیا آپ زمین میں کسی ایسے کو مقرر کرنے والے ہیں جو اس کے انتظام کو بگاڑ دے گا اور خونریزیاں کرے گا؟'' (بقرہ/۳۰)

۱۴۔ ایک دوسرے کو قتل نہ کرنے کا عہد لینا:

﴿واذ اخذنا میثاقکم لا تسفکون دمائکم﴾ ''پھر ذرا یاد کرو، ہم نے تم سے مضبوط عہد لیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا'' (بقرہ/۸۴)

مندرجہ بالا آیات میں قتل نفس کو شریعت میں امہات محرمات میں شامل کیا گیا ہے یہ فعل شریعت آسمانی میں ابتداء سے ہی قبیح و مردود چلا آ رہا ہے مذہب تشیع کی اساس و بنیاد میں سے ہے تمام احکام شریعت تابع حسن و قبح عقلی ہیں اسی اصول کے تحت حضرت آدم صفی اللہ کی تخلیق کے موقع پر اور خلافت کی خلعت عطا ہونے کے موقعہ پر ملائکہ نے درگاہ خداوندی میں فرمایا یہ گروہ خون بہائے

گا اور قتل نفس کرے گا لہذا محرمات اصلی کو تقرب خدا کی خاطر نذر نہیں کر سکتے۔ جسطرح خدا کی خوشنودی کی خاطر شراب نہیں پی جا سکتی، مال حرام کھایا نہیں جا سکتا، اس طرح قتل نفس بھی تقرب کا ذریعہ نہیں بن سکتا چاہے یہ اپنے عزیز یا اولاد کا ہی کیوں نہ ہو۔ قتل نفس وہاں ہی صحیح ہے جہاں حکم شریعت موجود ہو۔ اس اصول کے تحت کوئی بھی انسان اپنی امنگوں اور ارمانوں کی خاطر اپنی اولاد کو قتل کرنے کی نذر نہیں کر سکتا اس طرح یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوتی ہے کہ حضرت عبدالمطلب کا پیغمبر اکرمؐ کے والد کو ذبح کرنے کی نذر کرنے کا واقعہ عقل اور روایات قرآنی سے متصادم ومتعارض ہے۔

عبدالمطلب اور نذر، ذبح فرزند:

تاریخ طبری اور کامل ابن اثیر میں اس روایت کا راوی معاویہ بن ابوسفیان ہے۔ اور بعض اسے سند بخشنے کیلئے ابن عباس اور اہل بیت علیہ سلام کی طرف نسبت دیتے ہیں اسکی سند پر کسی بھی حوالے سے اعتماد و اطمینان نہیں کر سکتے، اگلا مرحلہ اس روایت کے مضمون کا ہے اس نذر کو ہم چند حوالوں سے نقد و انتقاد کا موضوع بنائیں گے:

۱۔ یہ ایسی نذر ہے جس پر عمل کرنے کی کافر و مشرک اور کاہن بھی مخالفت کر رہے ہیں چنانچہ قریش اور ان کے فرزندان اور کاہن نے بھی اس نذر پر عمل کرنے سے منع کیا یہاں اس روایت کا کھوکھلا ہونا واضح ہو جاتا ہے۔

۲۔ آیا تاریخ بشریت میں حضرت آدم علیہ السلام سے لیکر خاتم انبیاء تک اور کتب آسمانی میں یا کسی امام سے کوئی ایسی روایت ملتی ہے کہ انسان نذر کیلئے اپنی اولاد کو ذبح کر سکتا ہے تاکہ اسے نمونہ بنا کر اسے حضرت مطلب کے حوالے سے تطبیق کر سکیں۔

۳۔ کتاب بحار انوار جلد ۱۵ صفحہ ۱۲۷ حدیث نمبر ۶۷ میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہے آپ نے حضرت

علیؑ سے خطاب کر کے فرمایا عبدالمطلب کبھی بھی کوئی حکم فیصلہ یا راز و نیاز بتوں سے نہیں کرتے تھے اور نہ بتوں پر ذبح ہونے والا گوشت کھاتے تھے بلکہ فرماتے تھے کہ میں اپنے باپ ابراھیمؑ کے دین پر ہوں اسی طرح اصبغ ابن نباتہ نے حضرت امیر المومنین علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا واللہ میرے باپ عبدالمطلب اور نہ ہاشم نہ عبدالمناف بت پرستی کرتے تھے بلکہ وہ خدا کی عبادت کرتے تھے وہ کعبہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، ان روایات کو سامنے رکھنے کے بعد آپ اس سابق روایت کے بارے میں فیصلہ کر سکتے ہیں جہاں عبدالمطلب نے اپنے بیٹے عبداللہ کو ہبل کے سامنے قرعہ نکالنے اور اسحاق و نائلہ کے سامنے ذبح کرنے کے لئے لے گئے۔ حالانکہ وہ بت پرست نہیں تھے۔

۴۔ تاریخ طبری جلد دوم میں ہے کہ ایک عورت نے اپنے بیٹے کو کسی مشکل کے وقت کعبہ کے سامنے ذبح کرنے کی نذر کی، جب اسکی حاجت برآئی تو یہ عبداللہ بن عمر کے پاس گئی اور پوچھا آیا اس پر عمل کرنا واجب ہے یا نہیں، تو انھوں نے کہا مجھے معلوم نہیں خدا کا حکم نذر کے بارے میں وفا کے علاوہ کوئی نہیں تو عورت نے پوچھا اس کا مطلب ہے کہ میں اپنے بیٹے کو ذبح کروں تو ابن عمر نے کہا خدا نے تمھیں قتل کرنے سے منع کیا ہے جواب متضاد ہونے کی وجہ سے عورت عبداللہ بن عباس کے پاس آئی تو عبداللہ بن عباس نے کہا اپنے بیٹے کے بدلے میں سو اونٹ ذبح کرے جسطرح عبدالمطلب نے کیا اس وقت حاکم مدینہ مروان بن حکم تھا اس نے یہ حکم سننے کے بعد کہا ابن عمر اور ابن عباس نے غلط فتویٰ دیا ہے کیونکہ معصیت خدا پر نذر ہوتی ہی نہیں لہٰذا تم استغفار کرو مروان کے اس فتویٰ پر سب اہل مدینہ خوش ہوئے۔

نذر عبدالمطلب کے قصے میں یہودیوں کا کردار:

مختلف تاریخی واقعات میں آیا ہے علماء نصاریٰ نے جب حضرت محمدؐ کو بچپن میں دیکھا تو حضرت

عبدالمطلب و ابوطالب سے اس بچے کو یہود سے بچانے کیلئے کہا۔ چنانچہ راہب نے حضرت ابوطالب سے کہا اس بچے کو یہود سے بچا کر رکھیں۔ اگر انھیں پتا چلا تو وہ اسے قتل کردینگے کیونکہ یہود نے حضرت مسیح کو قتل کرنے کی سازش بھی کی ہے لیکن انھوں (یہود) نے حضرت عبداللہ کو مدینے میں زہر سے قتل کیا اور اس راز کے فاش ہونے سے بچنے کی خاطر نذر عبدالمطلب کی ایک من گھڑت کہانی بنائی، ان تمام کوششوں کے باوجود یہ روایات اپنے ضعف وتضاد کے ساتھ کثیر آیات قرآنی کے بھی خلاف ہیں لہٰذا اس روایت نذر عبدالمطلب کی تصحیح کرنے اور اسکا دفاع کرنیکی ہر کوشش غلط ہے جسطرح شراب پینے، گناہ کبیرہ کرنے مال حرام کھانیکی نذر کرنا صحیح نہیں اسی طرح اولا کو ذبح کرنا بھی نص قرآنی کے تحت حرام ہے اور حرام حرام ہی رہتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی قربانی

عیسائی اپنے عقیدے کے مطابق حضرت مسیح کو کافر سمجھتے تھے اور انھیں قتل کرنا چاہتے تھے اس خوف سے حضرت عیسیٰ ان کی نظروں سے چھپے حضرت مسیح کے ایک پیروکار جس کا نام یہوزائے اسخر یوتی تھا اس نے مال کے لالچ میں آکر حضرت مسیح کی نشاندہی کرائی چنانچہ یہودیوں نے جمعہ کی رات کو نماز کے بعد حضرت مسیح کو گرفتار کیا اور انھیں کہانت کے گھر لے گئے جہاں انھیں قتل کا مستحق قرار دیا پھر والی رمان کے گھر لے گئے جس نے سولی پر چڑھانے کا حکم دیا۔ جمعہ کی صبح کو مسیح کو دار پر چڑھایا اور انھیں اس وقت موت آئی جب وہ چیخ چیخ کر پکار رہے تھے کہ الہی الہی مجھے کیوں چھوڑا عصر کے وقت انھیں تختہ دار سے اتار کر قبر میں دفن کیا ہفتہ کا دن گذر گیا اتوار کی رات بھی گذر گئی جب اتوار کی صبح کو قبر میں دیکھا تو قبر خالی تھی۔

مسیحیوں کا عقیدہ ہے مسیح کی موت درحقیقت حضرت آدم صفی اللہ کی ان غلطیوں کا کفارہ تھی جو ان کی اولاد میں سرایت کر چکی تھیں لہٰذا ان کا قتل اولاد آدم کے گناہوں کا کفارہ واقع ہوا ہے وہ

اس سلسلہ میں یہ سند پیش کرتے ہیں انجیلِ یوحنا میں آیا ہے کہ حضرت مسیح کہتے ہیں میں وہ صالح رائی ہوں جو اپنے نفس کو غلطیوں کے خلاف بدل کے طور پر دے گا تا کہ مجھ پر ایمان لانے والے سب ہلاک نہ ہوں بلکہ انھیں ابدی زندگی نصیب ہو فرزند انسان اس لئے نہیں تا کہ وہ آقا بنے اور لوگوں سے خدمت لے لے، وہ اس کی خدمت کرے اور اپنے نفس کو بہت سے لوگوں کے بدلے میں فدیہ کے طور پر پیش کرے، انجیل یوحنا میں مذکور ہے اس طرح مسیح نے اپنے نفس کو ہمارے لئے پیش کیا ہے وہ ہماری خاطر قربان ہوا ہے وہ خدا کا ذبح ہے طیب وخوشبو کا حامل ہے۔قارئینِ کرام آپ سب جانتے ہیں ان کی یہ فکر اپنی سند ونسبت میں بے ہودہ وغلط ہونے کے علاوہ عقل وشرع اور ادیانِ عالم کے تحت بھی بے بنیاد ہے کیونکہ بنی آدم کے وہ گناہ جو گذر گئے ہیں وہ توبہ سے قابلِ بخشش تھے ان کیلئے مسیح جیسی ہستی کی قربانی دینے کی ضرورت نہیں اگر آنے والے گناہوں کی بخشش ہے تو اس کا مطلب یہ ہے حضرت مسیح آئندہ آنے والے مسیحیوں کے گناہ کو بخشوانا ہی نہیں بلکہ حلال کرنا چاہتے تھے گویا حضرت مسیح شریعت کے خاتمے کیلئے آئے تھے نہ کہ امت کی بخشش کیلیے۔اسی طرح عیسائی ایک اور فلسفہ جو حضرات مسیح کے سولی چڑھنے کے بارے میں پیش کرتے ہیں وہ اس دارکشی کو اپنی جگہ خود بخود فضیلت وشرافت گنواتے ہیں جو اپنی جگہ مسئلہ کو زیادہ پیچیدہ اور عقل سے بے بہرہ بنانے میں زیادہ اثر رکھتا ہے یہاں سے وہ آخر میں یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ چیزیں مافوق العقل ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنا۔

اس سلسلے میں اس واقعہ کو ملاحظہ فرمائیں جو قرآن کریم میں بیان ہوا ہے:

ترجمہ: ''پھر جب وہ ان کے ساتھ کام کاج کی عمر کو پہنچا تو کہا: اے بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس دیکھ لو تمہاری کیا رائے ہے اس نے کہا: اے ابا جان! آپ کو جو حکم ملا ہے اسے انجام دیں اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے پس جب

دونوں نے (حکم خدا کو) تسلیم کیا اور اسے ماتھے کے بل لٹا دیا، تو ہم نے ندا دی: اے ابراہیمؑ! تو نے خواب سچ کر دکھایا بے شک ہم نیکو کاروں کو ایسے ہی جزا دیتے ہیں، یقیناً یہ ایک نمایاں امتحان تھا اور ہم نے ایک عظیم قربانی سے اس کا فدیہ دیا'' (صافات/۱۰۲ تا ۱۰۷)

مندرجہ بالا آیات کریمہ کے فقرات پر سرسری وسطحی نظر کرنے کے بعد ایک عام انسان کے لئے یہ بات روزِ روشن کی طرح واضح و عیاں ہو جاتی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے بیٹے کو ذبح کرنیکی نذر نہیں کی۔

۱۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس ذبح کرنے کے عمل کو رویئت خواب سے مربوط کیا۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس ذبح کی ذمہ داری و مسئولیت کو حضرت اسماعیلؑ کے ذمہ کیا۔

ان نقاط کو مدنظر رکھنے کے بعد واضح ہوا شریعت اسلام میں ایک انسان دوسرے انسان کو چاہے وہ اس کا عزیز ہو قریبی دوست ہو یا دشمن کسی صورت میں بھی قتل کرنے کی اجازت نہیں ہے جب تک خداوند متعال از خود حکم نہ کرے یہ حق صرف خداوند متعال کو ہی حاصل ہے وہ جہاں اپنی خلائق کو تخلیق کر سکتا ہے وہاں اسے فنا بھی کر سکتا ہے۔ اور اسی طرح دوسرے کو اس کے قتل کا حکم بھی دے سکتا ہے مثلاً جس طرح گوسالہ پرستی کرنے والوں کو ایک دوسرے کو قتل کرنے کا حکم بھی خدا نے دیا۔ اسی طرح قصاص مفسدین فی الارض اور خدا و رسولؐ سے جنگ کرنے والوں کے بارے میں قتل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دو فرزند تھے ایک اسماعیل اور دوسرے اسحاق۔ حضرت اسحاق کے فرزند یعقوب سے بنی اسرائیل کی نسل چلی ہے۔

تحریفِ کلام اللہ کے ماہر ہیر و اسرائیلیوں نے قرآن میں موجود قصۂ ذبیح میں ذبیح کو حضرت اسحاق قرار دینے کی بھرپور کوشش کی ہے لیکن جب ہم اس سلسلہ میں وارد آیات قرآنی کو دیکھتے ہیں تو ان سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ بڑھاپے تک صاحب اولاد نہیں تھے حضرت ابراہیمؑ اور ان

کی زوجہ محترمہ اولاد سے مایوس ہو چکے تھے جیسا کہ سورۂ ذاریات کی آیت ۲۹ اور سورۂ ہود کی آیت ۷۲ سے واضح ہے:

﴿فاقبلت امراته فی صرة فصکت وجهها وقالت عجوز عقیم﴾ ''اوران کی زوجہ چلاتی ہوئی آئیں اور اپنا منہ پیٹنے لگیں اور بولیں: (میں تو) ایک بڑھیا (اور ساتھ) بانجھ (بھی ہوں)''

﴿قالت یٰویلتیٰ ءالد وانا عجوز وهذا بعلی شیخًا﴾

''وہ بولی: ہائے میری شامت! کیا میرے ہاں بچہ ہوگا جبکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہیں؟''

اس دوران حضرت سارہ نے اپنی کنیز ہاجرہ کو حضرت ابراہیمؑ کیلئے ہبہ کیا جس سے حضرت اسماعیل پیدا ہوئے:

﴿الحمدلله الذی وهب لی علی الکبر اسماعیل واسحق﴾

''شکر ہے اس خدا کا جس نے مجھے اس بڑھاپے میں اسماعیل اور اسحاق جیسے بیٹے دیئے'' (ابراہیم/۳۹)

حضرت اسماعیل کے پیدا ہونے کے بعد جب سارہ نے حضرت ابراہیمؑ کی توجہ ہاجرہ و اسماعیل کی طرف دیکھی تو انھیں اپنی نظروں سے دور لے جانے کو کہا۔

وہ وقت حضرت ابراہیمؑ پر کتنا بھاری گذرا ہوگا وہ ابراہیمؑ جو اپنے آپ کو ہمیشہ رضائے خدا کیلئے وقف کئے ہوئے تھے جو منتظر حکم خدا رہتے تھے، خداوندعالم نے ان کی رہنمائی کرتے ہوئے حکم دیا کہ اس فرزند اور اس کی ماں کو میرے گھر کے پاس لے جائیں تو حضرت ابراہیمؑ ہاجرہ اور حضرت اسماعیلؑ کو لے کر خانۂ خدا میں پہنچے اور ان کو وہاں چھوڑا جیسا کہ سورۂ ابراہیم کی آیت ۳۷ میں ذکر آیا ہے:

﴿ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتك المحرم﴾ ''پروردگار، میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے''

لہٰذا حضرت اسماعیلؑ اس خانۂ خدا کے جوار میں پرورش پانے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ اس گھر کے معمار بنے:

﴿واذ یرفع ابرٰھیم القواعد من البیت و اسمٰعیل﴾ ''اور یاد کرو ابراہیم اور اسماعیل جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے'' (بقرہ/۱۲۷)

ذبیح، اسماعیلؑ ہے یا اسحاقؑ

قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ سلام کو دو فرزندان کی بشارت دی گئی ہے۔ جن میں سے حضرت اسماعیل یعنی جن کی صفت میں ''حلیم'' کہا ہے اور دوسرے حضرت اسحاق ہیں جنکی صفت میں ''علیم'' بیان کیا گیا ہے حضرت ابراہیم علیہ سلام نے اپنے بڑھاپے کی عمر میں خواب میں دیکھا کو وہ اپنے فرزند کو اپنے ہی ہاتھوں ذبح کر رہے ہیں آپ نے اسکا ذکر اپنے بیٹے سے کیا اور پوچھا بیٹا تمہارا اس بارے میں کیا خیال ہے:

﴿فلما بلغ معه السعی قال یٰبنی انی اری فی المنام انی اذبحك فانظر ماذا تری قال یٰابت افعل ماتؤمر ستجدنی ان شآء الله من الصٰبرین﴾ ''پھر جب وہ ان کے ساتھ کام کاج کے عمر کو پہنچا تو کہا: اے بیٹا! میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس دیکھو تمہاری کیا رائے ہے اس نے کہا: اے ابا جان! آپ کو جو حکم ملا ہے اسے انجام دیں اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صبر کرنے والوں میں پائیں گے'' (صافات/۱۰۲)

تو فرزند نے جواب دیا آپ کو جو حکم خداوند کریم کی طرف سے ہوا ہے اس پر عمل کریں آپ مجھے

انشاءاللہ صابرین میں سے پائیں گے جب دونوں تسلیم ہوئے اپنی جبین اطاعت خدا میں زمین پر رکھی تو خداوند عالم نے ندا دی آپ نے خواب کو سچ کر دکھایا اور ہم محسنین کو ایسی ہی جزا دیتے ہیں اور بے شک یہ بہت بڑی آزمائش تھی اور ہم نے اسکے بدل میں فدیہ دیا یقیناً جو فرزند خدا کی رضا میں اس حد تک تسلیم ہوئے وہ ایک عظیم فرزند ہیں، حضرت محمد خاتم انبیاء آپ ہی کی نسل سے ہیں یہاں یہود پیغمبر اکرم کی دشمنی میں اس حد تک گئے کہ انھوں نے کتاب خدا میں بھی تحریف کی جسکی ایک مثال انھوں نے اس ذبح عظیم کو حضرت اسحاق سے منسوب کیا قرآن کریم میں بشارت حضرت اسماعیل اور اسحاق کا ذکر مندرجہ ذیل آیات میں آیا ہے:

﴿وبشرنه باسحق نبیاً من الصلحین۔ وبرکنا علیه وعلی اسحق﴾

''اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق کی بشارت دی کہ وہ صالحین میں سے نبی ہونگے۔ اور ہم ان پر اور اسحاق پر برکات نازل کیں'' (صافات/۱۱۲، ۱۱۳) ھود ۶۹ سے ۷۳، حجر ۵۱، ۵۶ اور ذاریات ۲۴ سے ۳۰۔

یہود کی یہ تحریف کہ ذبح عظیم سے مراد حضرت اسحاق ہیں اسکی حقیقت نہ ہونے کو کیسے ثابت کیا جائے۔ اس سلسلے میں قصص انبیاء کے ماہرین اور محققین نے ذبح عظیم سے مراد حضرت اسماعیل کو ثابت کرنے کیلئے ان دلائل سے استدلال کیا ہے۔

۱۔ قصہ ذبح بیان کرنے کے بعد خداوند عالم نے حضرت ابراھیم کو اسحاق اور انکی نبوت کی بشارت دی جس سے واضح ہوتا ہے کہ اسحاق ابھی پیدا ہونگے لہذا وہ ذبح نہیں ہو سکتے۔

۲۔ حضرت ابراھیم علیہ سلام نے درگاہ خدا میں فرزند کیلئے دعا کی تو خداوند متعال نے انھیں حضرت اسماعیل عنایت کیے جیسا سورۂ صافات کی آیات میں ذکر ہے جبکہ حضرت اسحاق کی بشارت قصہ ذبح کے بعد دی ہے۔

۳۔ جس وقت خداوند متعال نے حضرت ابراھیم علیہ سلام سے فرزند کو ذبح کرنے کی آزمائش کی

اور اسے ایک بڑا امتحان قرار دیا یہ امتحان اس وقت بڑا ہو سکتا ہے جب فرزند ایک ہی ہو۔

۴۔ خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ اور حضرت سارہ کو حضرت اسحاقؑ کے ساتھ ہی حضرت یعقوبؑ کی بھی بشارت دی لہذا ذبح سے مراد حضرت اسحاقؑ کو مراد نہیں لیا جا سکتا کیونکہ کیسے ممکن ہے کہ خداوند عالم ایک طرف تو انھیں ذبح کرنے کا حکم دیں اور ساتھ ہی یعقوبؑ کی بھی بشارت دیں لہذا ذبح عظیم سے مراد حضرت اسماعیل علیہ سلام ہی ہیں۔

۵۔ تاریخ میں ذکر ہے جس گوسفند کو حضرت اسماعیلؑ کی جگہ ذبح کیا گیا اسکے سینگ کعبہ پر آویزاں تھے یہ اس بات کی دلیل ہے ذبح سے مراد حضرت اسماعیلؑ ہیں کیونکہ انھوں نے ہی مکہ میں قیام کیا جبکہ حضرت اسحاق شام میں رہے۔

۶۔ خداوند عالم نے حضرت اسماعیلؑ کی صفت میں انھیں صابر کہا ہے:

﴿واسمٰعیل وادریس وذاالکفل کل من الصٰبرین﴾ ''اور اسماعیل وادریس اور ذوالکفل کو بھی (اپنی رحمت سے نوازا) یہ سب صبر کرنے والے تھے'' (انبیاء/۸۵)

یہاں حضرت اسماعیلؑ کے خاص صبر کا ذکر ہے جبکہ ایسی آزمائش حضرت اسحاق پر نہیں آئی:

﴿واذکر فی الکتٰب اسمٰعیل انه کان صادق الوعد وکان رسولاً نبیاً﴾

''اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر کیجئے وہ یقیناً وعدے کے سچے اور نبی مرسل تھے''

(مریم/۵۴)

۷۔ فطری حوالے سے انسان کو اسکا بڑا بیٹا عزیز ہوتا ہے اور خاص کر انسان جب بڑھاپے کی دہلیز پر ہو اور ساتھ ہی یہ بیٹا بہت سی دعاؤں کے بعد ملا ہو۔ حضرت ابراہیمؑ کا لقب خلیل ہے اور خلیل وہ ہے جس کے دل میں خدا کے سوا کسی اور کی محبت نہ ہو لہذا خداوند عالم نے انھیں اپنے فرزند کو ذبح کرنے کا حکم دیا۔

توحید اور شرک میں تصادم

ابراہیم علیہ السلام کا مقابلہ مشرکین اور بت پرستوں کے ساتھ

قرآن کریم میں روئے زمین پر انبیاء کی بعثت کی غرض وغایت اور فرائض میں شرک اور بت پرستی کے خلاف جنگ وجہاد اور توحید خدا کا رواج دینا قرار دیا ہے۔ لیکن ہر نبی کو اپنے دور میں ایک خاص قسم کی بت پرستی کا سامنا ہوا۔ جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بتِ انسان کا سامنا ہوا۔ لیکن حضرت ابراھیم علیہ سلام کو ہر قسم کی بت پرستی کا سامنا ہوا جن میں انسانوں کے جعل کردہ بت، ستارہ پرست اور بت حکمران بھی شامل تھے۔ اسی لئے قرآن میں حضرت ابراھیم علیہ سلام کو بت پرستی سے نبرد آزمائی میں صف اول میں شمار کیا گیا ہے قرآن نے کبھی آپ کو کلمہ ''حنیف'' سے متعارف کروایا یعنی آپ ابتداء سے ہی حق کی طرف جھکنے والے ہیں، کبھی کلمہ ''قانت'' سے متعارف کروایا یعنی درگاہ خدا میں خاضع وخاشع اور ہر قسم کی بت پرستی سے پاک ومنزہ شخصیت ہیں ملاحظہ کریں:

﴿ما كان ابرٰهيم يهوديًا ولا نصرانيًا ولكن كان حنيفًا مسلمًا﴾ ''ابراہیم نہ یہودی تھے نہ عیسائی بلکہ وہ یکسوئی کے ساتھ مسلم تھے'' (عمران/۶۷) بقرہ ۱۳۵، انعام ۱۶۲، نحل/ ۱۲۳۔ ﴿ان ابرٰهيم كان امة قانتًالله حنيفًا﴾ ''ابراہیم (اپنی ذات میں) ایک امت تھے اللہ کے فرمانبردار اور (اللہ کی طرف) یکسو ہونے والے تھے'' (نحل/۱۲۰)

ان آیات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم پر واضح ہوتا ہے حضرت ابراھیم علیہ سلام نے کیسے بت اور بت پرستوں کا مقابلہ کیا اور اپنے جنگ وجہاد میں کیا اسلوب اپنایا۔ اس سلسلے میں ہم گفتگو کو آگے بڑھانے کیلئے قرآن کی روشنی میں شرک وبت پرستی کے مصادیق بیان کرتے ہیں۔

قرآن کریم کی ۱۰۷ سے زائد آیات میں انسانوں کو خدا سبحانہ کے علاوہ کسی قسم کے معبود ومطاع

بنانے کو مسترد کیا گیا ہے اور اسے ایک بڑا ظلم قرار دیا ہے:

﴿ثم اتخذتم العجل من بعده وانتم ظلمون﴾ ”پھر تم نے اس کے بعد گوسالہ کو (بغرض پرستش) اختیار کیا اور تم ظالم بن گئے“ (بقرہ/۵۱)

اسکے علاوہ مشرکین کو نجس کہا ہے:

﴿انما المشرکون نجس﴾ ”مشرکین تو بلاشبہ ناپاک ہیں“ (توبہ/۲۸)

مشرکین کو خدا کی نافذ کردہ حدود سے تجاوز کرنے والا قرار دیا ہے:

﴿ومن یتعد حدود الله فالئك هم الظلمون﴾ ”جو لوگ حدود الٰہی سے تجاوز کرتے ہیں پس وہی ظالم ہیں“ (بقرہ/۲۲۹)

شرک کو کفر کہا ہے:

﴿والکفرون هم الظالمون﴾

”اور ظالم وہی لوگ ہیں جنہوں نے کفر اختیار کیا“ (بقرہ/۲۵۴)

مشرکین کو خدا اور رسول پر تہمت باندھنے والا قرار دیا ہے:

﴿فمن افترى على الله الكذب من بعدذلك فاولئك هم الظلمون﴾ ”اس کے بعد جنھوں نے اللہ کی طرف جھوٹی نسبت دی وہی لوگ ظالم ہیں“ (آل عمران/۹۴)

حکم خدا کو نافذ نہ کرنے والا قرار دیا ہے:

﴿یحکم بماانزل الله فاولئك هم الظلمون﴾ ”اور جو اللہ کی نازل کردہ حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں پس وہ ظالم ہیں“ (مائدہ/۴۵)

قرآن کریم میں شرک اور بت پرستی سے متعلق آیات کا خلاصہ یہ ہے:

۱۔ خدا کے مقابل کسی اور کو خالق، مدبر، مربی، منعم، محسن قرار دینا۔

خدا کے علاوہ کسی اور کے سامنے خاضع وخاشع ہونا اور اظہار تذلیل کرنا شرک کے مصداق جلی میں

سے ہے:

﴿ویعبدون من دون اللہ مالایضرھم ولاینفعھم......سبحنہ وتعلی عمایشرکون﴾ ''اور یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انھیں ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ انھیں کوئی فائدہ دے سکتے ہیں ......وہ پاک وبالاتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کر رہے ہیں'' (یونس/۱۸) ﴿ان الذین تدعون من دون اللہ عبادامثالکم فادعوھم فلیستجیبوالکم ان کنتم صٰدقین﴾

''اللہ کے سوا تم جنھیں پکارتے ہو بے شک وہ تمہاری طرح کے بندے ہیں پس اگر تم سچے ہو تو تم انھیں ذرا پکار کر تو دیکھو انھیں چاہئے کہ تمہیں (تمہاری دعاؤں کا) جواب دیں'' (اعراف/۱۹۴) نجم ۲۲

۲۔ حکم خدا کے بغیر کسی فرد کی اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کرنا۔

اطاعت ہمیشہ مولا کی ہے۔ آیات قرآنی میں بندگان کا حقیقی مولا صرف خداوندسبحانہ ہے اس کے علاوہ کسی اور کی اطاعت صحیح نہیں۔ خدا اور رسول سے استناد کیے بغیر اگر کسی کی اطاعت کی تو یہ عمل واضح بت پرستی میں شمار ہوگا جیسا کہ سورۂ مبارکہ توبہ آیت ۳۱ میں اسکا ذکر آیا ہے:

﴿اتخذوااحبارھم ورھبانھم اربابًامن دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الالیعبدوا الٰھًا واحدًالاالٰہ الاھوسبحنہ عمایشرکون﴾ ''انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور راہبوں کو اپنا رب بنالیا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی حالانکہ انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ذات ان کے شرک سے پاک ہے''

۳۔ حکم خدا یا اسکی طرف سے دی گئی نسبت کے بغیر کسی کی تقدیس واحترام کرنا۔

بعض افراد کا یہ اصرار ہے شرک کو تنہا تعدد خالق کے معتقد ہونے والوں تک محدود رکھیں انکا کہنا

ہے کسی چیز کے احترام کرنے کو شرک نہ قرار دیا جائے۔ یعنی انسان کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ جسے مناسب سمجھے اسے احترام دے لیکن آیات قرآنی کی رُو سے خداوند متعال نے یہ حق اپنے پاس رکھا ہے۔ جسے خدا محترم قرار نہ دے بندوں کو اسکا احترام کرنے کا حق حاصل نہیں۔ جاہلیت عرب بعض حیوانات کو انتہائی احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ لیکن خداوند متعال نے انکے اس عمل کو مسترد کیا جسکا ذکر سورہ مائدہ ۱۰۳ میں موجود ہے:

﴿ماجعل الله من بحيرة ولا سآئبة ولا وصيلة ولا حام ولكن الذين كفروا يفترون على الله الكذب﴾ ''اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام۔ مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں''۔

فلسفہ وحکمت بعثت انبیاء کے بارے میں وارد آیات سے واضح ہوتا ہے کہ انبیاء عظام کی بعثت کا بنیادی مقصد روئے زمین پر اس خالق متعال کی خالقیت کے تمام مراتب' درجات' تخلیق مواد و شکل وصورت' مزاج وخاصیت' عبادت وبندگی خضوع اور اطاعت سب کو اس ذات کیلئے مخصوص کرنے کی خاطر اور اس راہ میں حائل تمام قسم کے طاغوت چاہے انسانی شکل میں ہوں یا جہل ونادانی' عداوت ودشمنی' بت پرستی وخود پرستی' مفاد پرستی ومنفعت پرستی' فرد پرستی یا تنظیم پرستی کی صورت میں ہوں' غرض ہر قسم کی انواع واشکال شرک کا خاتمہ کرنا ہے اس سلسلہ میں ہم یہاں فلسفہ عبادت و بندگی اور شرک وبت پرستی اور ان دونوں سے مشابہ بت پرستی کی منطق کو قرآن کریم کی آیات سے پیش کریں گے۔

توحید

توحید یعنی خدا کو ذات وصفات وفعل میں واحد و یکتا و منفرد سمجھنا انبیاء الٰہی نے جب اپنی دعوت الی اللہ شروع کی تو لوگوں سے کہا اس ذات کی عبادت و پرستش کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلوں کو خلق کیا ہے لیکن لوگوں نے انکے مدمقابل یوں آواز اٹھائی ''ود' سواع کو مت چھوڑنا' کسی نے

کہا اپنے خداؤں کی مدد کرو کسی نے کہا تعجب کی بات ہے یہ بہت سے خداؤں کو ایک کرنے کی بات کرتے ہیں'' اس طرح لوگوں نے بت پرستی پر باقی رہنے کا اعلان کیا۔ انبیاء نے کہا خدا کی ذات وصفات وفعل میں ایک کی پرستش کرنا بہتر ہے یا بہت سے خداؤں کی پرستش کرنا اسی طرح توحید وشرک کی جنگ شروع ہوئی ہے لہذا قصہ نوحؑ وابراہیمؑ مناسب ترین جگہ ہے اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کرنے کی۔

شرک:

کسی فرد چیز یا فکر وتصور کو خداوند متعال کے لئے یا اس ذات کے برابر میں قرار دینے کو شرک کہتے ہیں شرک اللہ جل جلالہ کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف رخ کرنے کو کہتے ہیں جبکہ شرک خفی جو ظاہری طور پر اللہ تعالی کے لئے اور اندر سے کسی اور چیز کو شامل کرے۔ شرک جلی کے بہت سے مراتب ہیں:

دون:

یعنی کسی کی بہ نسبت غیر یا حقیر' ناقص' پست تر' پیچھے کیلئے استعمال ہوتا ہے قرآن کریم میں بہتر (۷۲) بار من دون اللہ' من دون الرحمن' من دونہ کی صورت میں خدا سے ہٹ کر کسی اور کی عبادت' حاجت طلب کرنا اور خاضع ہونے سے منع کیا ہے، اٹھارہ (۱۸) بار غیر اللہ یا غیر الٰہی کی کلمہ سے کسی اور کی طرف رجوع کرنے والوں کی مذمت وملامت کی ہے جن آیات میں یہ کلمہ استعمال ہوا ہے:

﴿ومالكم من دون الله من ولي ولا نصير﴾ ''اور اللہ کے سوا تمہارا کوکارساز اور مددگار نہیں'' (بقرہ/۱۰۷) ﴿ويغفر مادون ذلك لمن يشآء﴾ ''اس کے علاوہ دیگر گناہوں کو جس کے بارے میں چاہے گا معاف کردے گا'' (نساء/۴۸) جن ۱۱، مریم ۱۷، قصص ۲۳، رحمن ۶۲، بقرہ ۹۴۔

عربی قواعد میں دون، فوق کے مقابل ہے۔ یعنی منزل سے پہلے، کسی سے پست دکھانے پیچھے

سے پہلے دکھانے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

﴿یعیسی ابن مریم ئانت قلت للناس اتخذونی وأمی الهین من دون الله﴾ ''اے عیسیٰ بن مریم کیا آپ لوگوں نے سے کہا تھا کہ اللہ کے سوا مجھے اور میری والدہ کو خدا بناؤ؟'' (مائدہ/۱۱۶) ﴿مالهم من دونه من ولي ولا یشرك في حكمه احدا﴾ ''اس کے سوا ان کا کوئی سرپرست نہیں اور نہ ہی وہ کسی کو اپنی حکومت میں شریک کرتا ہے'' (کہف/۲۶) بقرہ ۲۳۔

جس طرح اللہ تعالی ہر چیز کا خالق ہے اسی طرح بعض چیزوں میں غیر خدا کو بطور استقلال یا بطور اختیار سپرد کرنا' وکالت دینا کو شرک در خالقیت کہتے ہیں قرآن کریم میں غیر خدا سے ہر قسم کی خالقیت کی نفی کی گئی ہے اللہ تعالی نے جن آیات میں خالقیت کو اپنے لئے مختص کیا ہے وہ مندرجہ ذیل ہیں:

﴿بدیع السمٰوٰت والارض﴾ ''وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے'' (انعام/۱۰۲) ﴿قل من رب السمٰوٰت والارض قل الله﴾ ''ان سے پوچھئے: آسمانوں اور زمین کا پروردگار کون ہے؟ کہہ دیجئے: اللہ ہے'' (رعد/۱۶) فاطر ۳، زمر ۲۲، غافر ۶۲، حشر ۲۴، طور ۳۵، واقعہ ۵۹، مومنون ۱۴، صافات ۱۲۵، حجر ۸۶، یٰسین ۸۱۔

خداوند عالم کے مقابل میں بطور استقلال کوئی شریک نہیں بن سکتا اگر ایسا ہوتا تو دونوں خالق اپنی مخلوق سمیت دیار عدم کی طرف زوال وفنا کا شکار ہو جاتے:

﴿لو كان فیهما الهة الا الله لفسدتا﴾ ''اگر اس آسمان و زمین میں اللہ کے سوا خدا ہوتا تو دونوں کا نظام درہم برہم ہو جاتا'' (انبیاء/۲۲)

اللہ تعالی تخلیق کائنات کسی اور کو سپرد کر دے، یہ بھی ناممکن ہے اس کا امکان نہ ہونے کے بارے میں قرآن کریم کی وہ آیات ہیں جو معجزات انبیاء کے بارے میں ہیں جہاں اللہ تعالی نے انبیاء کو فعل معجزات کا مظہر اور اصل فاعل اپنی ذات کو دکھایا ہے۔

تاریخ بت پرستی، بت سازی اور بتوں کو فروغ اور ترویج دنیا

بت پرستی کی پیدائش کب اور کیسے ہوئی اور کس طرح سے یہ اپنے ارتقائی مراحل کی طرف بڑھی یہ ایک اہم موضوع ہے۔ بت پرستی قدیم زمانے سے اقوام وملل میں ایک وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا عمل ہے چنانچہ اس ضمن میں دو حوالوں سے گفتگو کی جاسکتی ہے ایک بت پرستی اور دوسرا بت سازی جہاں تک بت پرستی کا تعلق ہے اس کی تعریف یوں ہے کہ غیر خدا کی اطاعت اور اس کے سامنے خضوع وخشوع کرنا۔ تاریخ میں بت پرستی و بت سازی قدیم دور سے جاری ہے لیکن بت سازی یعنی بت بنانے اور ان کی شکل وصورت میں گزشتہ زمانے کے ساتھ ساتھ تبدیلی ہوتی رہی ہے سورہ ہود کی آیت ۵۶ اور ۶۲ میں بت پرستی کے بارے میں قوم عاد کے بارے میں ذکر آیا ہے جنہوں نے طوفان نوح کے بعد تین بتوں کی پرستش کی:

(۱) صدا (۲) صودا (۳) ھرا۔

یہ چاروں عنوان اس باب میں توضیح طلب موضوع ہیں ہر ایک کے بارے میں بطور کامل بیان کی ضرورت ہے۔

۱۔ بت کی تعریف:

یہ ایک ایسا موضوع ہے جسکے آغاز کی دقیق تاریخ پیش کرنا اور اسکی انواع واقسام کو پیش کرنے سے پہلے ہم بت کے لغوی معانی اردو کتب لغت اور عربی معاجم اور قرآنی اصطلاحات میں پیش کریں گے۔

۱۔ بُت اُردو کتبِ لغت میں:

احسن لغات: کتاب احسن اللغات کے مطابق بت کے معانی کاٹنا، قطع کرنا اور مورتی کے ہیں بت فارسی کا لفظ ہے۔

بُت: مورتی ٔ مورت ٔ پُتلا ٔ پتھر یا پیتل وغیرہ کی مُورت جسکی پرستش کریں۔ معشوق ٔ محبوب ٔ خاموش ٔ گونگا ٔ احمق ٔ بیوقوف ٔ مُکا گھونسہ ٔ ڈک ۔ جواریوں کا کوڑیاں لُڑھکانے کا تختہ ٔ مٹی کا چراغدان جسے تارکش اپنے کندھوں پر رکھ کر کام کرتے ہیں ٔ بت نیز ذیل کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے

بتاوہ: فریب ٔ دھوکہ ٔ دھونس ٔ جھانسا ٔ حیلہ ٔ بہانہ۔

بت بنا: چپ ہونا ٔ گنگ ہونا ٔ خاموش ہونا ٔ صم بکم ہونا۔

بت تراش: بت گر ٔ بت بنانے والا۔

بت خانہ یا بت کدہ: بت رکھنے کی جگہ۔ مندر ٔ شوالہ ٔ شودوارہ۔

بت شکن: بت توڑنے والا۔

بت شکنی: بتوں کو توڑنا۔

کتاب فیروز اللغات: اس لغت کے مطابق بت مذکر ہے اور یہ ہندی اور فارسی زبان کا لفظ ہے اس کے معانی پانسہ پھینکنے ٔ چوسر کی کوڑیاں لڑھکانے کا تختہ۔ مکا ٔ گھونسہ ٔ مورتی ٔ مجسمہ ٔ معشوق ٔ محبوب ٔ چپ ٔ خاموش ٔ گنگ ٔ احمق اور مورکھ ٔ جمع بتان کے ہیں۔

بتانِ آزری: آزر کے بنائے ہوئے بت جو بہت خوبصورت ہوتے تھے۔

بت بن جانا: (محاورہ) چپ اور خاموش ہو جانا

بت بن کر بیٹھنا: بالکل خاموش رہنا۔ کوئی بات نہ کرنا۔

بت بے پیر: بے رحم معشوق

بت پرست: مورتی پوجنے والا ٔ کافر ٔ مشرک ٔ معشوق۔

بت پرستی: بتوں کی پوجا ٔ مورتی پوجا۔

بت تراشی: بت گر۔ مورتی بنانے والا۔

بت خانہ: بت کدہ۔ شوالہ۔ مندر۔ کدہ۔ مورتی پوجا کی جگہ۔

بت خانہ آزر: مجوسیوں کا آتش کدہ۔

بت شکن: بت توڑنے والا۔ موحد۔ محمود غزنوی۔

بت ہر جائی: بے وفا معشوق جو کسی ایک عاشق کا ہو کے نہ رہے۔

بتا بنانا: بت بنانا۔ دھوکہ دینا' فریب دینا' فقرہ دینا۔

بتا دینا: دھوکہ دینا۔ جھانسہ دینا۔ دغا دینا۔ بہانہ کرنا۔ ٹالنا۔

بتے بازی: حیلہ بازی' فریب دہی۔

بتے میں آنا: فریب میں آنا۔

اظہر الغات: بت: مورتی' پتلا' صنم' پتھر یا پیتل وغیرہ کی مورت جس کی پرستش کریں' معشوق' محبوب' گم سم' مدہوش' خاموش' گونگا' احمق بیوقوف' مکا' گھونسا' ڈک' جواریوں کا کوڑیاں لڑھکانے کا تختہ' مٹی کا چراغدان' جسے تارکش اپنے کاندھوں پر رکھ کر اس کی روشنی میں کام کرتے ہیں۔

بتا: اے بت۔ معشوق سے خطاب۔

بتا: فریب' دھوکہ' دھونس' جھانسہ' چھل' حیلہ' بہانہ۔

فرہنگ عمید فارسی: بت:۔ مجسمہ یعنی جو پتھر' لکڑی یا کسی دوسری چیز سے انسان یا حیوان کی شکل میں بنا کر اسکی پرستش کی جائے۔

معشوق بت خانہ: خانہ بت، معبودیت پرستش۔

یہ تھے بت کے وہ معنٰی جو ہم نے چار لغات سے پیش کئے۔

اسباب وعوامل بت پرستی:

آیت اللہ جعفر سبحانی دام ظلہ العالی نے اس کے تین بنیادی محرکات بیان کئے ہیں اور اپنی کتاب ''معالم التوحید'' کے صفحہ نمبر ۳۸۴ ان تینوں محرکات کو یوں بیان کیا ہے:

(۱) مخلوقات وموجودات کے بارے میں متعدد خالق وصانع کے اعتقاد سے بت پرستی نے جنم لیا مثلاً مذہب ہوزی میں تخلیق کائنات کو تین خداؤں کی طرف نسبت دی گئی ہے۔

(۱) براھما: وہ خدا جس نے کائنات کی تخلیق کی۔

(۲) فیشو: جو پیدا شدہ کائنات کی محافظت کرتا ہے۔

(۳) سیفا: جو کائنات کو فنا کرتا ہے۔

دین زردشتی میں کائنات کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے جن میں سے ایک خیر اور دوسرا شر ہے وہ کہتے ہیں اچھی چیزیں پیدا کرنے والے خدا کا نام یزدان ہے اور بری چیزیں پیدا کرنے والے خدا کا نام اہرمن ہے۔

نصرانیت میں بھی یہ تصور موجود ہے۔ وہ تخلیق کائنات کو اب، ابن اور روح القدس کی طرف نسبت دیتے ہیں اسی طرح نظریہ مفوضہ یعنی خدا نے پہلے آل محمدؑ کو خلق کیا پھر کائنات کی تخلیق اور تدبیر و ارزاق انھیں تفویض کی۔

(۲) خدا کا اپنے مخلوق سے غایب ہونا:

ہر مشرک و بت پرست کا عقیدہ تھا خدا اپنی مخلوق سے دور ہے ان کی اس تک رسائی نہیں کہ وہ اپنی آواز، نیاز مندی، اور راز و نیاز و مناجات کو خدا تک پہنچا سکیں لہٰذا انہوں نے یہ گمان کیا یہ چیزیں ان کی دعاوں، حاجات اور راز و نیاز و مناجات کو خدا تک پہنچنے کے وسائل میں سے ہیں۔ انہی وسائل کے ذریعے نیاز مندوں کی حاجات و آرزوئیں خدا تک پہنچتی ہیں چنانچہ بعض افراد نے مظاہر کائنات مثلاً چاند ستاروں کی پرستش شروع کی، بعض نے دریا کی اور بعض نے اس مقصد کے لئے انسان کا انتخاب کیا اور حاجت روائی کے لئے انسان کے مجسمے اور بت بنائے اور پھر انکی پوجا پاٹ شروع کی۔

(۳) تفویض:

اپنے اوپر مسلط طاقت وقدرت کے سامنے خاضع ہونا انسان کی فطرت میں پوشیدہ ایک عنصر ہے یہ اپنے اوپر مسلط قدرتوں کے مقابلہ میں خود کو بہت چھوٹا اور کمزور سمجھتا ہے اگر چہ زبان وجوارح اسکا اظہار نہیں کرتے لیکن یہ چیز اس کے ضمیر وخمیر میں موجود ہے لہذا انسان نے یہ تصور کیا کہ وہ موجودات جو اس کے لئے باعث فیوض ہیں یا جن سے کوئی خارق عادت چیز سامنے آتی ہے، وہ ایسی چیزوں کو دیکھ کر یہ سمجھنے لگتا ہے خدا نے کائنات کو تدبیر، خیر وشر، رضا ورغبت اور غیض وغضب کو چھوٹے خداؤں میں تقسیم کر دیا ہے جیسے خدائے دریا، خدائے جنگ، خدائے سلامتی وغیرہ لہذا دریا کے کنارے رہنے والوں نے دریا کو خدائے دریا جان کر اس کی پرستش شروع کر دی تا کہ دریا انہیں اپنی نعمتوں اور فیوض و برکات سے نوازتا رہے اور اپنی طوفان وسیلاب جیسی آفات سے بچائے رکھے۔ اسی طرح بعض لوگوں نے میدانوں اور صحراؤں کے خدا بنا لئے تا کہ وہ انہیں ایک تو اپنے فیض سے نوازیں اور دوسرا یہ کہ انہیں زلزلوں اور دیگر آفات ارضی سے بچائے رکھیں چونکہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے خدا کو نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی وہ ظاہری آنکھوں سے خدا کو دیکھ سکتے تھے لہذا انہوں نے خدا کے بارے میں اپنے اندر ایک وہمی وخیالی تصور کو پیدا کر لیا اور پھر اسی وہمی وخیالی صورت کی بنیاد پر مثال ونمونہ کے طور پر بت تراشی کی۔ انہوں نے ان قوتوں کی پرستش شروع کر دی کہ جن سے فیوض وفوائد کے ساتھ ساتھ ضرر ونقصان پہنچنے کا اندیشہ وخطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتا رہتا تھا الغرض بعض نے وسائل کے طور پر بت بنا ڈالے اور بعض نے خدا کی خلق کی گئی طاقتور مخلوقات کو بتوں کے طور پر پوجنا شروع کر دیا۔ چنانچہ دور جاہلیت میں بعض لوگ ملائکہ کی پرستش کرتے تھے انہوں نے ملائکہ کے بت بنائے، بعض نے جنوں اور ستاروں کی پرستش شروع کر دی۔

انسان ایک لحہ کے لئے بھی آزاد نہیں ہے اور نہ ہی کائنات بھر میں کوئی ایسا انسان یا ایسی قوت موجود ہے جو اسے حکومت خدا سے آزاد کرانے کی سکت رکھتی ہو۔ لہذا کوئی بھی انسان اپنی

سوچ وفکر و پسندیدگی اور اپنی تشخیص کی بنیاد پر عبادت و بندگی کا طریقہ وضع نہیں کر سکتا اور نہ ہی کوئی انسان ایسا کرنے کا اختیار رکھتا ہے کیونکہ وہ قادر مطلق کی مقرر کردہ حدود وقیود اور اوامر ونواہی کا پابند ہے۔ اسے اس دن کا ہر حال میں سامنا کرنا ہوگا جب اس کے ہر قول وفعل کے بارے میں اس سے بازپرس ہوگی لہٰذا انسان کیلئے کسی کی بطور مستقل بندگی یا شریک قرار دینے یا اسے واسطے کے طور پر استعمال کرنے کے عمل کیلئے کی اس کے پاس اس کے اس عمل کے بارے میں دلیل ہو۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل آیات میں آیا ہے:

﴿قال قد وقع علیکم من ربکم رجسٌ وغضب اتجادلوننی فی اسمآءٍ سمیتموھا انتم وآباؤکم مانزل اللہ بھامن سلطٰنٍ﴾ ''اس نے کہا تمہارے رب کی پھٹکار تم پر پڑگئی اور اس کا غضب ٹوٹ پڑا کیا تم مجھ سے اُن ناموں پر جھگڑتے ہو جو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے رکھ لئے ہیں جن کیلئے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے؟'' (اعراف/۷۱) ﴿فاتونا بسلطٰنٍ مبینٍ......﴾ ''اچھا تو لاؤ کوئی صریح سند......'' (ابراہیم ۱۰،۱۱) ﴿اولیاتینی بسلطٰنٍ مبینٍ﴾ ''اسے میرے سامنے معقول وجہ پیش کرنی ہوگی'' (نمل/۲۱) نجم ۲۳، حاقہ ۲۹۔

فلسفۂ عبادت وبندگی

جس نقطہ نظر کے تحت خدا پرستان خداوندمتعال کے حضور عبادت وبندگی، خضوع وخشوع کے معتقد ہیں وہ ہی فلسفہ مشرکین وبت پرست اپنائے ہوئے ہیں دلیل ومنطق دونوں کی ایک ہی ہے لیکن صحیح مصداق اور غلط مصداق کے تعین کرنے میں فرق ہے۔ دونوں کی منطق ہے ا نی زندگی کی سعادت اور نیک بختی اور شقاوت وبدبختی سے نجات کا ایک بڑا حصہ انسان کے ارادہ واختیار سے باہر ہے۔ بہت سی نعمتیں وآسائشیں اُسے نصیب ہوتی ہے جو اسکی قدرت سے باہر ہیں جو باہر سے

اسے ملتی ہیں وہ کہاں سے آتی ہیں، کس کی طرف سے آتی ہیں اس بات کی تحقیق کرنے میں بہت سے مضرات وتکلیف دہ حالات کا انسان کو سامنا ہے اسے روکنا اسکی قدرت سے باہر ہے جہاں تک جو چیزیں انسان کی قدرت واختیار اور اسکی توانائی کی حدود کے اندر ہیں ان کے بارے میں اسکی فطرت اسے کہتی ہے اپنے فائدے ومنفعت کی چیزیں جمع کرو نقصان دہ وضرر رساں چیزوں سے اجتناب کرو اسی کا نام زندگی ہے۔ زندگی کا دارومدار فوائد کو اپنی طرف کھینچنا اور ضرر کو اپنے سے دور کرنا ہے یہاں سے انسان اس تلاش میں نکلتا ہے اس کیلئے مسلسل خیرات ونیکی بھیجنے والا کون ہے انسانِ عاقل اس راہ میں ایسی ذات کی تلاش میں نکلتا ہے جو خود سے اور دیگر مخلوقات سے مافوق کوئی ہستی ہے جو تمام خیرات کا مالک ہے اور تمام چیز اسکے قبضہ وقدرت میں ہے وہ علم وقدرت کا مالک ہے جسکا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔ یہاں سے خدا پرست خداوند متعال کی تلاش میں نکلے لہذا خداوند متعال نے اپنی بندگی کی منطق کو اس فکر پر استوار کیا تمہیں حیات دینے والا کون ہے، تمہیں موت دینے والا۔ اگر ہم حیات دینا چاہیں تو کون اسے روک سکتا ہے، تم جنھیں نفع ونقصان کا مالک سمجھتے ہو وہ تمہارے کسی کام کے نہیں، وہ خود عاجز وناتواں ہیں انکے پاس کچھ اختیار نہیں، یہ ہے منطق خدا پرستوں کی ہے لیکن ان کے مقابل گروہ، گروہ در گروہ تقسیم ہوئے کسی نے سورج وچاند کی پرستش کی، کسی نے دریا، سیراب اور حیوانات کی کی پرستش کی، بعض نے خود بت تراشے اور بعض نے پیروں اور ملنگوں کی طرف نسبت دی۔

عبودیت وبندگی صرف ذات خدا سے مختص ہے:

عبادت مادہ "عبد" سے ہے جسکا معنی وہ صاف وشفاف راستہ ہے جو چلنے کیلئے ہموار ہو۔ عبادت کا معنی اپنے مولا کے سامنے اطاعت وذلت کا اظہار کرنا ہے۔ یہ مفہوم تین طریقوں سے ادا ہوسکتا ہے۔

۱۔طریقہ تکوینی: جیسا کہ سورہ مبارکہ مریم آیت ۹۳ میں ہے:

﴿ان كل من فى السمٰوٰت والارض الا اتى الرحمٰن عبدًا﴾

''جو کوئی آسمانوں اور زمین میں سے ہے وہ اس رحمٰن کے حضور صرف بندے کی حیثیت سے پیش ہوگا''

ہر چیز خدا کی عبدیت میں ہے:

﴿وهو القاهر فوق عباده﴾ ''اور وہ اپنے بندوں پر غالب ہے'' (انعام/۶۱)

﴿وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون﴾ ''اور میں نے جن وانس کو خلق نہیں کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں'' (ذاریات/۵۶)

انسان کے ساتھ کائنات کی تمام مخلوقات اپنی حیات وبقاء کیلئے خدا کے سامنے ذلیل وخاضع ہیں۔اس تعریف میں رضائت وغیر رضائت کا کوئی تصور نہیں کیونکہ یہاں عبودیت تکوینی راہ سے انجام پائی ہے۔

۲۔عبودت اختیاری یا تشریعی:

﴿يا ايها الناس اعبدوا ربكم الذى خلقكم والذين من قبلكم لعلكم تتقون﴾ ''لوگو! اپنے پروردگار کی عبادت کرو جس نے تمہیں اور تم سے پہلے والے لوگوں کو پیدا کیا تاکہ تم (خطرات سے) محفوظ رہو'' (بقرہ/۲۱) ﴿ان اعبدوا الله واتقوه﴾ ''کہ اللہ کی بندگی کرو اور اس سے ڈرو'' (نوح/۳) اعراف/ ۶۵، آل عمران ۷۹، کافرون ۲، آل عمران ۵۱۔

ان تمام آیات میں عبادت، عبودیت، اطاعت، خضوع اختیاری کے معنوں میں آیا ہے۔

۳۔عبودیت جعلی:

﴿ضرب الله مثلاً عبدًا مملوكًا لا يقدر على كل شيء ومن رزقنه منا رزقًا حسنًا

﴿فهو ينفق منه سرًا و جهرًا هل يستون الحمد لله بل اکثرهم لا یعلمون﴾ ''اللہ ایک غلام کی مثال بیان فرماتا ہے جو دوسرے کا مملوک ہے اور خود کسی چیز پر قادر نہیں اور دوسرا (وہ شخص) جسے ہم نے اپنی طرف سے اچھا رزق دے رکھا ہے پس وہ اس رزق میں سے پوشیدہ و علانیہ طور پر خرچ کرتا ہے کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ ثنائے کامل اللہ کیلئے ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے'' (نحل/۷۵) بقرہ/۱۷۸

مندرجہ بالا تین اقسام عبودیت کو بیان کرنے کے بعد قارئین کرام کے لئے یہ مسئلہ واضح و آشکار ہو جائے گا کہ عبودیت اختیاری اگر عبودیت تکوینی کے مطابق ہو تو انسان جادہ مستقیم پر گامزن ہوگا اور اگر عبودیت تکوینی کے خلاف ہوگی تو وہاں ذلالت و گمراہی مقدر ہوگی۔ چنانچہ بت پرستی کی تمام اقسام چاہے وہ موجودات طبیعی سے متعلق ہوں یا انسان یا جمادات سے متعلق ہوں یا ملائکہ یا جن سے متعلق ہوں یہ خداوند متعال کی درگاہ میں مردود ہیں کیونکہ عبادت تنہا اسی سے مختص ہے جو خالق و مربی ہے لہذا خداوند متعال نے ان تمام معبودوں اور عبادات کو مسترد کیا ہے جو انسان نے اپنی صوابدید پر اختیار کی ہیں:

﴿الم اعهد اليكم يبنی ادم ان لا تعبدوا الشيطن﴾ ''اے اولاد آدم! کیا ہم نے تم سے عہد نہیں لیا تھا کہ تم شیطان کی پرستش نہ کرنا؟'' (یٰسین/۶۰)

﴿ويوم يحشرهم جميعًا ثم يقول للملئكة اهؤلاء اياكم كانوا يعبدون﴾ ''اور جس دن وہ ان لوگوں کو جمع کرے گا پھر فرشتوں سے پوچھے گا: کیا یہ لوگ تمہاری پرستش کرتے تھے؟'' (سبا/۴۰)

عبودیت و بندگی:

عبادت و بندگی چاہے خداوند متعال کیلئے ہو یا طاغوت کیلئے دونوں کیلئے دلائل و استناد ایک ہی ہیں۔ انبیاء و آئمہ نے خدا کی عبادت و بندگی کیلئے خالق و مالک، رزاق منعم اور محافظ جیسے دلائل سے

استناد کیا ہے۔ لیکن طاغوت کی اطاعت کرنے والوں نے ان دلائل کو اپنے لئے استعمال کیا جبکہ حقیقت میں وہ اپنے زندہ رہنے کیلئے خالق ازلی کے محتاج ہیں۔

عبادت وبندگی انتہائی ذلت واطاعت کا نام ہے۔ صاحب مجمع البیان میں ہے عبادت ذلت اپنانے کا نام ہے یہاں سے ہی ہموار راستہ کو طریقہ معبد کہتے ہیں۔ غلام کو اس لئے عبد کہتے ہیں کہ وہ انتہائی خشوع وذلت سے اپنے مولا کی خدمت کرتا ہے، کتاب صحاح اللغت میں عبادت کا معنی خضوع وذلت بیان ہوا ہے اور اسی طرح عبادت بمعنی اطاعت بھی بیان ہوا ہے، اقرب الموارد میں عبادت کا معنی اطاعت بیان ہوا ہے اگر ان تمام معنی کو یکجا کیا جائے تو عبادت کا معنی ایسا اظہار ہے جس میں اطاعت وخضوع دونوں شامل ہوں۔

قرآن کریم میں عبادت بمعنی اطاعت وذلت دونوں استعمال ہوئے ہیں۔ جیسے سورۂ مریم ۴۴ میں حضرت ابراہیم علیہ سلام نے آزر سے کہا شیطان کی عبادت نہ کرو۔ آزر بت پرست تھا یہاں جو اسے کہا گیا ہے کہ شیطان کی عبادت نہ کرو یہ اس وجہ سے ہے کہ وہ شیطان کی اطاعت میں بتوں کی پوجا کرتا تھا جو حقیقت میں شیطان ہی کی عبادت تھی۔ اسی طرح سورۂ مائدہ ۶۰ میں لفظ عبد طاغوت استعمال ہوا ہے یعنی طاغوت کا مطیع وفرمانبردار۔ خداوند متعال کی عبادت کی دو قسمیں ہیں ایک زندگی میں درپیش مسائل میں اسکے حلال وحرام کی پیروی کرنا ہے چنانچہ مندرجہ ذیل آیات میں عبادت انھی معنوں میں ہے:

﴿ومن الناس من یعبداللہ علیٰ حرف﴾ ''اور لوگوں میں کوئی ایسا بھی ہے جو اللہ کی یکطرفہ بندگی کرتا ہو'' (حج/۱۱) ﴿وما خلقت الجن والانس الالیعبدون﴾ ''اور ہم نے جن وانس کو خلق نہیں کیا مگر یہ کہ وہ میری عبادت کریں'' (ذاریات/۵۶) ﴿اننی انا اللہ لا الہ الا انا فاعبدنی﴾ ''میں ہی اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں پس میری بندگی کرو'' (طٰہٰ/۱۴) ﴿ویعبدون من دون اللہ مالا یضرھم ولا ینفعھم﴾ ''اور یہ لوگ

اللہ کو چھوڑ کر ان کی پرستش کرتے ہیں جو نہ انہیں ضرر پہنچا سکتے ہیں اور نہ انہیں کوئی فائدہ دے سکتے ہیں'' (یونس/۱۸) ﴿ان الذین تدعون من دون اللہ عباد﴾ ''اللہ کے سوا تم جنھیں پکارتے ہو بے شک وہ تمہاری طرح کے بندے ہیں'' (اعراف/۱۹۴)

دوسری عبادت اظہار تذلیل کرنا ہے ایسی تذلیل کا اظہار کرنا جس سے واضح ہو جسکے لیے یہ عمل انجام دیا جارہا ہے وہ ایک اعلیٰ درجہ پر فائز ہستی ہے جو ہر قسم کے نقص وعیب سے پاک و منزہ ہے:

﴿ان کل من فی السمٰوٰت والارض الاآتی الرحمٰن عبداً﴾ ''جو کوئی آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اس رحمٰن کے حضور صرف بندے کی حیثیت سے پیش ہوگا'' (مریم/۹۳) ﴿قل ان کان للرحمٰن ولدفانااول العٰبدین﴾ ''کہہ دیجئے: اگر رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی تو میں سب سے پہلے (اس کی) عبادت کرنے والا ہوں'' (زخرف/۸۱) بقرہ ۸۷، نحل ۵۷، شوریٰ ۴۲

مندرجہ بالا آیات کو سامنے رکھتے ہوئے دو حقائق سامنے آتے ہیں ایک تو اس قسم کی تذلیل و خشوع صرف ذات خدا سے مخصوص ہے اور کسی کیلئے یہ عمل سزاوار نہیں۔ دوسرا نقطہ بغیر کسی استفسار کے اس قسم کی اطاعت وفرمانبرداری بھی کسی اور کیلئے جائز نہیں ہے بغیر کسی دلیل و برھان کے نہ تو کسی کے سامنے انتہائی خضوع وخشوع کے جھک سکتے ہیں اور نہ ہی اسکی اطاعت وفرمانبرداری کر سکتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بعض علاقوں میں ادب اور اطاعت کیلئے پاؤں کو ہاتھ لگایا جاتا ہے جسکی قرآن وسنت سے کوئی دلیل نہیں ملتی، یہ ایک فعل حرام ہے اور بت پرستی کی ہی ایک شکل ہے قرآن کریم میں جہاں انبیاءؑ آئمہ واولیاء اور علماء کی اطاعت و پیروی کرنے کا حکم ملتا ہے اسے بت پرستی سے مشابہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس اطاعت کی برگشت خدا ہی کی طرف منتہی ہوتی ہے۔

۱۔ خضوع وخشوع انتہائی: عبادت و بندگی کے مراتب و درجات ہیں جیسے سر جھکانا یعنی رکوع

وجود کرنا جس کے بعد اس سے بہتر اعلیٰ وارفع خضوع وخشوع کا تصور ممکن نہیں یہ خضوع و خشوع صرف ذاتِ باری تعالیٰ کیلئے ہی مختص ہے اگر یہ کسی غیر خدا کے کیلئے انجام دیا جائے چاہے وہ انبیاء واولیاء کیلئے ہی کیوں نہ شرک وکفر ہے یہ عمل کسی صورت میں بھی غیر خدا کے کیلئے تحقق پذیر نہیں ہے:

﴿اذنسویکم برب العلمین﴾

''جب تم کورب العالمین کے برابر قرار دے رہے تھے'' (شعراء/۹۸)

۲۔ اطاعت وتسلیم محض: خدا کے ہر امر ونہی کے سامنے خاضع اور فرمانبردار ہونا چاہے جیسے میری نماز پڑھو میرا ذکر کرو میری راہ میں جہاد کرو وغیرہ یا اسکے خاص بندوں کی اطاعت جیسے جو رسول کی اطاعت کرے گا وہ میری اطاعت کرے گا ان اوامر ونہی کی اطاعت میں رسول کی اطاعت ہو یا رسول کی توسط سے جن کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہو جیسے آئمہ طاہرینؑ اور علماء وفقہاء عادل۔ ان کے علاوہ ایسی اطاعت جس کی برگشت خدا کی طرف نہ ہو وہ شرک وکفر ہے چنانچہ روایات میں آیا ہے ہر وہ انسان جو کسی متکلم کے کلام کو سنے اگر وہ متکلم خدا کی طرف نسبت دیتا ہے تو یہ توحید ہے اور سامع نے خدا کی اطاعت کی ہے اگر اس نے اپنی یا کسی اور کی طرف نسبت دی تو اس نے غیر خدا کی عبادت کی ہے۔

۳۔ احترام: جن آیات میں عبادت کو صرف خدا کیلئے مختص کیا گیا ہے ان میں عبادت کے تمام مراتب کا بھی ذکر شامل ہے عبادت کا تیسرا درجہ جو ادنیٰ درجہ ہے وہ احترام ہے وہ احترام جو خدا اور رسول کی طرف سے ثابت نہ ہو وہ خود ساختہ احترام ہے یہ احترام شریعت میں قابل قبول نہیں چنانچہ جو حیوان حاجی نے کعبہ میں قربانی کیلئے مختص کیا ہے خدا نے اسے شعائر اللہ قرار دیا لیکن جن حیوانوں کو مشرکین نے اپنے بتوں کیلئے منسوب کیا ہے سورہ مبارکہ مائدہ کی

آیت ۱۰۳ میں خداوند عالم نے انھیں کوئی احترام نہیں دیا:

﴿ماجعل الله من بحيرة ولا سائبة ولا وصيلة ولا حام ولكن الذين كفروا يفترون على الله الكذب﴾ ''اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام ۔مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں''

عبادت وبندگی کے تمام مراتب غیر خدا کیلئے قرار دینا شرک ہے۔

بت پرستی اور خدا پرستی

اللہ تبارک تعالی نے جہاں اپنی عبادت وبندگی کا حکم دیا ہے وہیں بت پرستی سے شدت اور سختی سے منع کیا ہے اللہ تعالی نے بت پرستی کو اس دلیل وبرہان سے مسترد کیا ہے وہ کسی بھی حوالے سے ہمیں نفع ونقصان پہنچانے سے قاصر ہیں:

﴿قل اتعبدون من دون الله مالا يملك لكم ضرا و لا نفعا والله هو السميع العليم﴾ ''کہہ دیجئے کیا تم اللہ کے سوا ایسی چیز کی پرستش کرتے ہو جو تمہارے نقصان اور نفع پر کوئی اختیار نہیں رکھتی اور اللہ ہی خوب سننے جاننے والا ہے'' (مائدہ/۷۶) ﴿قل افاتخذتم من دونه اولياء لا يملكون لا نفسهم نفعا و لا ضرا﴾ ''کہہ دیں تو پھر کیا تم نے اللہ کے سوا ایسوں کو اپنا اولیاء بنایا ہے جو اپنے نفع ونقصان کے بھی مالک نہیں ہیں'' (رعد/۱۶) ﴿افلا يرون الا يرجع اليهم قولا ولا يملك لهم ضرا و لا نفعا﴾ ''کیا وہ یہ نہیں دیکھتے کہ یہ ان کی کسی بات کو جواب تک نہیں دے سکتا اور وہ نہ ان کے کسی نفع اور نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہے'' (طٰہٰ/۸۹) ﴿واتخذوا من دونه الهة لا يخلقون شياء وهم يخلقون ولا يملكون لانسهم ضرا و لا نفعا ولا يملكون موتا ولا حيوة ولا نشورا﴾ ''لوگوں نے اللہ کو چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے جو کسی چیز کو خلق نہیں کر سکتے بلکہ خود مخلوق ہیں اور وہ اپنے لیے بھی کسی نفع نقصان کا اختیار نہیں

رکھتے اور وہ نہ موت کا اختیار رکھتے ہیں اور نہ حیات کا اور نہ ہی اٹھائے جانے کا“ (فرقان/۳)

بت ہمیں اس لئے نفع ونقصان پہنچانے سے قاصر ہیں کہ وہ نہ تو ہماری فریاد کو سن سکتے ہیں اور نہ ہی ہماری حالت زار کو دیکھ سکتے ہیں:

﴿ان تدعوهم لا يسمعوا دعاء كم ولو سمعوا ما استجابو لكم......﴾ ”اگر تم انہیں پکارو تو وہ تمہاری پکار سن نہیں سکتے اور اگر سن بھی لیں تو وہ تمھیں جواب نہیں دے سکتے“ (فاطر/۱۴) ﴿اذ قال لابيه يا بت لم تعبد مالا يسمع ولا يبصرو لا يغني عمنك شياء﴾ ”جب انہوں نے اپنے باپ (چچا) سے کہا اے ابا آپ اسے کیوں پوجتے ہیں جو نہ سننے کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ دیکھنے کی اور نہ ہی آپ کو کسی چیز سے بے نیاز کرتا ہے“ (مریم/۴۲) ﴿قال هل يسمعونكم اذتدعون﴾ ”ابراھیم نے کہا: جب تم انہیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمہاری سنتے ہیں“ (شعراء/۷۲)

قرآن کریم میں بت کا تصور اور انکے نام

صنم پرستی یا بت پرستی کا تصور انسان کے اندر کہاں سے داخل ہوا اس کے بارے میں کہتے ہیں لوگ زندگی کے مسائل وضروریات کے بارے میں خاص اسباب رکھتے ہیں انسان جب روشنائی چاہتا ہے تو سورج کو دیکھتا ہے کہ یہ طلوع ہوا رات کو انھیں چاند نظر آتا ہے' طاقت وقدرت کے مظہر میں پہاڑ کو دیکھتا ہے اس کو اپنی زندگی کے اسباب میں دیکھتے ہیں۔ صنم بننے سے پہلے انسان ستاروں کی پوجا کرتے تھے صنم پرستی اس کے بعد میں وجود میں آئی ہے لیکن صنم پرستی اور ستارہ پرستی میں گہرا رشتہ ہے جب انسان نے ایک چیز کو دیکھا جو اسے فائدہ دے سکتی ہے تو وہ ہر فائدہ کو اسی کی طرف نسبت دیتا ہے انسان اپنے اندر قوت کو دیکھتا ہے تو اسے اچھا سمجھتا ہے لیکن انسان نے سوچا کہ خالق اشیاء غیب ہے تو اس نے ظاہر کی پرستش شروع کی، جب انسان نے دیکھا کہ ستارے

غروب ہوتے ہیں تو بعض نے کہا کیوں نہ اس کی جگہ صنم بنائیں تاکہ وہ ہمیں ان چیزوں کی یاد دلاتے رہیں یہیں سے سورج اور چاند کی شبیہ بنی، یہاں سے یہ واضح ہوا کہ بت ستاروں کی یاد دلانے کیلئے وجود میں آئے ہیں یہیں سے کہتے ہیں کہ انسان اس سبب سے غافل نہ ہو جو ان اسباب کے پیچھے ہے جتنی عقل ترقی کرے گی اسباب در اسباب بنائے گی سلسلۂ اسباب ختم ہو کر اس مسبب تک پہنچ جائے جہاں مخلوق سبب بنانے سے عاجز آجائے وہیں سے خالق شروع ہوتا ہے جو افراد اسباب کے فریفتہ ہوتے ہیں وہ سمجھتے ہیں یہ اسباب خود مسبب ہیں بت پرستی کے شروع ہونے کا امکان وہ جگہ ہے جہاں انسان کی نظروں سے دین چھپ جاتا ہے انسان اپنے گردونواح دیکھنا شروع کرتا ہے کون سی چیز اس کیلئے نقصان دہ اور کونسی چیز فائدہ مند ہے اور پھر غلط مصداق کا تعین کر کے اسکی پرستش شروع کرتا ہے۔

''ضلالت'' یعنی کسی منزل کو تلاش کرتے ہوئے راستہ گم ہو جائے۔ بت پرست یہ گمان کرتے تھے کہ یہ سب کچھ انھیں کے مرہون منت ہیں یہاں سے ہی یہ اصل راستے سے منحرف ہوئے اور سبب اصلی کو درک نہ کر سکے۔ یہاں اسباب نے انھیں مسبب تک نہیں پہنچایا یہاں آکر انسان ایک ایسی چیز کے سامنے رک گیا جو اس خدا کی مخلوق ہے زمین کی طرف' سورج' چاند' ستارے' بادلوں کی طرف (جب وہ بارش برسائے) پہاڑوں کی طرف جھکنا شروع کیا۔ انسان کو چاہئے تھا اس مسئلہ کی طرف دیکھتا کہ ان فوائد کو ان چیزوں نے خلق نہیں کیا' پست سے پست چیز وجود میں آنے کیلئے کسی صانع کی محتاج ہے مثلاً ایک کپ کو لے لیں جس سے ہم چائے پیتے ہیں وہ چندین مراحل سے گزرنے کے بعد ہمارے ہاتھ میں آیا ہے کس نے اس کے مادہ کو کشف کیا' کس نے اس کو شکل میں لایا، اسی طرح اس چراغ کو دیکھیں جس کے وجود کیلئے کتنی وسائل فکری و مادی صرف ہوئے ہیں مثلاً تار ہی کو لے لیں' کا خانہ' لوہے اور آگ ان سب مراحل سے گزر کر بنا ہے تو اس سورج کے بارے میں آپ کیا کہیں گے کہ جو پورے کرۂ زمین کو روشنی دیتا ہے۔ اس میں نہ کوئی

تا رہے اور نہ ہی کسی لمحہ اس کی روشنی میں کمی آتی ہے ہم نے سکولوں میں پڑھا تھا کس نے اس بجلی کو ایجاد کیا کتنے لوگوں نے ہمیں بجلی بنانے والے کے بارے میں تعجب اور حیریت کے ساتھ درس دیئے لیکن کسی نے یہ درس نہیں دیا کہ پوری دنیا کو روشنی دینے والی بجلی کو کس نے پیدا کیا ہے ہم ہمیشہ نزدیک والے سبب پر ہی رکتے ہیں ہمیں گہرائی تک سوچنے اور فکر میں عمق پیدا کرنے کیلئے سلسلۂ سبب میں تسلسل جاری رکھنا چاہیے تا کہ مسبب اصلی تک پہنچ جائیں چنانچہ انبیاء آئے ہیں ہمیں ان چیزوں کے خالق کا بتانے کیلئے یعنی سبب اصلی سے متعارف کروانے کیلئے۔

(۱) ''صنم'':

﴿وعدالله الذین امنوا منکم وعملوا الصلحت لیستخلفنهم فی الارض کما استخلف الذین من قبلهم ولیمکنن لهم دینهم الذی ارضی لهم ولیبدلنهم من بعد خوفهم امنًا یعبدوننی لایشرکون بی شیئًا﴾ ''تم میں سے جو لوگ ایمان لے آئے ہیں اور نیک اعمال بجالائے ہیں اللہ نے ان سے وعدہ کر رکھا ہے کہ انھیں زمین میں اسی طرح جانشین ضرور بنائے گا جس طرح ان سے پہلوں کو جانشین بنایا اور جس دین کو اللہ نے پسندیدہ بنایا ہے اسے پائیدار ضرور بنائے گا اور انھیں خوف کے بعد امن ضرور فراہم کریگا وہ میری بندگی کریں اور میرے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھرائیں''

یہ کلمہ قرآن کریم میں بھی چندین بار آیا ہے، صنم جسکی جمع اصنام ہے جیسا کہ سورہ مبارکہ ابراہیم ۳۵ میں آیا ہے:

﴿واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام﴾ ''اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا''

''صنم'' اس ڈھانچہ کو کہتے ہیں جو چاندی، تانبے یا لکڑی سے بنایا گیا ہو جو جسم کے ساتھ شکل و صورت کا بھی حامل ہو۔ یہ کلمہ قرآن میں پانچ مرتبہ آیا ہے:

﴿واذ قال ابراهيم لابيه ازر اتتخذ اصنام الهتة﴾ ''اور جب ابراہیم نے اپنے باپ آزر سے کہا کیا تم بتوں کو معبود بناتے ہو'' (ابراہیم/۷۵) ﴿فاتوا علی قوم یعکفون علی اصنام لھم﴾ ''وہ ایسے لوگوں کے پاس پہنچ گئے جو اپنے بتوں کی پوجا میں لگے ہوئے تھے'' (اعراف/۱۳۸) ﴿وتاللہ لاکیدن اصنامکم بعد ان تولوا مدبرین﴾ ''اور اللہ کی قسم جب تم یہاں سے پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے تو میں تمہارے ان بتوں کی خبر لینے کی تدبیر ضرور سوچوں گا'' (انبیاء/۵۷)

ارباب ماہرین لغت عرب کا کہنا ہے کہ صنم اصل میں عجمی کلمہ ہے جیسا کہ کتاب لغت تاج العروس میں آیا ہے صنم اصل میں کلمہ عجمی ہے۔ لیکن اس میں یہ ذکر نہیں یہ کلمہ کس زبان سے ماخوذ ہے۔ بعض نے کہا یہ کلمہ یورپی زبان کے لفظ SELEM سے بنا ہے جو کہ عبری سے لیا گیا ہے۔ اسی طرح بعض نے کہا ہے صنم صالم سے ماخوذ ہے جو زبان عبرانی آرمیائی سے ہے۔

کتب تاریخ اور اخبار میں نقل ہے سرزمین حجاز مکہ میں سب سے پہلے ''صنم'' نصب کرنے والا شخص عمر ابن لحی ہے جس نے ایک بت سرزمین شام سے لا کر مکہ کے کسی کنواں پر نصب کیا اور لوگوں کو کہا کہ اس کی پوجا کریں اس کا نام اس نے ''ہبل'' رکھا یہ سب سے مشہور بت تھا جو مکہ میں مشہور ہوا۔

(۲) ''وثن'': بت کے لئے استعمال ہونے والا یہ کلمہ بھی قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں آیا ہے:

﴿فاجتنبوا الرجس من الاوثان﴾ ''پس تم لوگ بتوں کی پلیدی سے اجتناب کرو'' (حج/۳۰) ﴿وقال انما اتخذتم من دون اللہ اوثانا﴾ ''اور ابرہیم نے کہا تم صرف اس لیے اللہ کو چھوڑ کر بتوں کو لیے بیٹھے ہو'' (عنکبوت/۲۵) ﴿انما تعبدون من دون اللہ

اوثانا﴾ ''تم تو اللہ کو چھوڑ کر بس بتوں کو پوجتے ہو'' (عنکبوت/۱۷)

''وثن'' جسکی جمع اوثان ہے۔ اس کے بارے میں قاموس قرآن میں ہے ''وثن'' ایک بت ہے۔ یہ چاہے پتھر سے بنا ہو یا لکڑی سے ہو لیکن اس میں شکل وصورت کا ہونا ضروری نہیں۔

وثن ان مجسموں کو کہا جاتا ہے جو پتھر سے بنائے گے ہوں اور معبود ہونے کی نشانی ہوں انکے سامنے زمانہ جاہلیت میں لوگ اپنی نذرو نیاز اور قربانیاں پیش کرتے تھے۔

''صنم'' اسے کہا جاتا ہے کہ جسکی شکل وصورت ہو اور ''وثن'' اسے کہا جاتا ہے جسکی شکل وصورت نہ ہو بلکہ ایک ڈھانچہ ہو لیکن اسے مقدس گردانا جاتا ہو جیسے کعبہ کا پتھر۔ وثن کو وثن اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ ایک جگہ قائم رہتا ہے۔

''وثن'' جیسا کہ صاحب تحقیق کلمات قرآن نے اس کلمہ کے ذیل میں ''لسان العرب'' سے نقل کیا کہ ''وثن'' اور محکم الراقد اور ثابت الدائم کو کہتے ہیں۔ یعنی کوئی چیز کسی جگہ قائم ودائم ہو۔''

وثن'' ہر اس چیز کو کہتے ہیں جسکا ڈھانچہ پتھر لکڑی وغیرہ سے بنا ہو اور کسی جگہ نصب کر دیا جائے تا کہ اسکی پوجا کی جائے تحقیق یہ ہے کہ وثن کے اصل معنی ثابت ودائم کے ہیں۔

وثن ایک اصطلاح ہے جو ان مجسموں اور تصویروں کے لیے استعمال ہوتی ہے جنکی عرب دور جاہلیت میں پرستش کرتے تھے قدیم دور جاہلیت میں عرب اس کلمے کو ان چیزوں کے لیے استعمال کرتے تھے جنہیں وہ بت سمجھتے تھے کتاب مسند اور ابن کلبی میں صنم اور وثن دونوں میں فرق رکھا گیا ہے انسانی شکل کا پردہ مجسمہ جو سونے چاندی یا لکڑی سے بنایا گیا ہو اسے صنم کہتے ہیں لہٰذا وثن کی اصطلاح ہمیشہ پتھر سے بنائے گئے بتوں کے لیے استعمال ہوتی تھی اور عرب مشرکین انہیں کے سامنے اپنی نذورات پیش کرتے اور حیوانات ذبح کرتے تھے لیکن صاحب لسان العرب نے کہا ہے کہ وثن اور صنم میں فرق یہ ہے ہر وہ بت جو صورت نہ رکھتا ہے اسے وثن کہتے ہیں اور جس کی شکل و صورت ہو اسے صنم کہتے ہیں چنانچہ انسانی یا حیوانی شکل میں بنائے گئے بتوں کو صنم کہتے ہیں چاہیے

وہ سونے چاندی اور حتمی جواہرات سے بنے ہوں یا پتھر سے اور وثن ان بتوں کو کہتے ہیں جنکے لئے شکل وصورت کا ہونا ضروری نہیں لیکن عرب بت پرست وثن کو مقدس گردانتے تھے یہی وجہ ہے کہ دور جاہلیت میں عرب کعبہ اور مکے کے پتھروں کو وثن کہتے تھے۔

وثن ایک اصطلاح ہے جو ان مجسموں اور تصویروں کے لیے استعمال ہوتی ہے جنکی عرب دور جاہلیت میں پرستش کرتے تھے قدیم دور جاہلیت میں عرب اس کلمے کو ان چیزوں کے لیے استعمال کرتے تھے جنہیں وہ بت سمجھتے تھے کتاب مسند اور ابن کلبی میں صنم اور وثن دونوں میں فرق رکھا گیا ہے انسانی شکل کا مجسمہ جو سونے چاندی یا لکڑی سے بنایا گیا ہو اسے صنم کہتے ہیں لہٰذا وثن کی اصطلاح ہمیشہ پتھر سے بنائے گئے بتوں کے لیے استعمال ہوتی تھی عرب مشرکین انہیں کے سامنے اپنی نذرانے پیش کرتے تھے اور یہاں حیوانات ذبح کرتے تھے۔ لیکن صاحب لسان العرب نے کہا ہے کہ وثن اور صنم میں فرق یہ ہے کہ ہر وہ بت جو صورت نہ رکھتا ہے اسے وثن کہتے ہیں اور جس کی شکل وصورت ہو اسے صنم کہتے ہیں چنانچہ انسانی یا حیوانی شکل میں بنائے گئے بتوں کو صنم کہتے ہیں چاہیے وہ سونے چاندی اور حتمی جواہرات سے بنے ہوں یا پتھر سے اور وثن ان بتوں کو کہتے ہیں جنکے لئے شکل وصورت کا ہونا ضروری نہیں لیکن عرب بت پرست وثن کو مقدس گردانتے تھے یہی وجہ ہے کہ دور جاہلیت میں عرب کعبہ اور مکے کے پتھروں کو وثن کہتے تھے۔

سب سے قدیم ترین بت:

(۱) ود (۲) سواع (۳) یغوث (۴) یعوق (۵) نسر

سب سے قدیم ترین بت جنکا ذکر سورہ نوح آیت ۲۳ میں آیا ہے:

﴿وقالوا لا تذرن الھتکم ولا تذرن ودًا ولا سواعًا ولا یغوث ویعوق ونسرًا﴾ ''اور کہنے لگے: اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کو نہ چھوڑنا''

یہ پانچ نام ان صالح ومتعدین افراد کے ہیں جو حضرت نوحؑ سے پہلے حضرت ادریسؑ کے دور میں تھے یہ لوگ محبوب خدا ہونے کے ساتھ لوگوں کے بھی محبوب و پسندیدہ تھے۔

(۱) ''ود'':

عرب جاہلیت میں قوم بنی برہ نے بت کو عوف بن عذرا ابن قاصد بن قدیح کے حوالے کیا یہ لوگ دومتہ الجندل میں آباد تھے اس عوف نے اپنے بیٹے کا نام عبدود رکھا یعنی ود کا بیٹا اسی طرح اپنے دوسرے بیٹے عامر کو اس بت کا خادم مقرر کیا۔

یہ بت ایک انسان کی شکل میں بنایا گیا جس کے اوپر ایک چادر چڑھائی گئی، ہاتھ میں تلوار بازو میں کمند ایک ہاتھ میں پرچم اور ترکش دیا جس میں تیر تھے اس بت کو اسلام کے آنے کے بعد ختم کیا گیا۔

بعض کہتے ہیں کہ اس کی شکل یونان کے عروس کی شکل پر تھی لیکن اس کا کوئی نام نہیں رکھا ہوا تھا اسی طرح معجم البلدان میں ''ود'' کو چاند کا نام دیا ہے۔

(۲) ''سواع'':

یہ بت مدینے کے اطراف میں ینبع کے مقام پر نصب تھا وہاں کے مقیم قبائل اس کی پرستش کرتے تھے اس کے خادم قبیلہ تہیان کے لوگ تھے۔

(۳) ''یغوث'':

اس بت کی پرستش قبیلہ مذحج اور اس کے حلیف کرتے تھے جسے عمرو ابن لحی نے اپنے بیٹے انعام ابن عمرو مرادی کو دیا یہ لوگ یمن میں آباد تھے۔ انہوں نے اس بت کو وہاں سے نجران منتقل کیا یہ ایک شیر کی شکل پر بنا ہوا تھا۔

(۴) ''یعوق'':

اس بت کی شکل گھوڑے جیسی بنائی گئی یہ بت عمرو ابن لحی نے قبیلہ ہمدان سے تعلق رکھنے والے

شخص مالک بن مرصد بن خشم بن خیران کے حوالے کیا یمن کے لوگ اس کی پرستش کرتے تھے۔

(۵) ''نسر'':

عمرو ابن لحی کی بت پرستی کی مہم میں نسر بھی شامل ہے اس نے اس بت کو قبیلہ حمیر کے حوالے کیا جو ارض سبا میں رہتے تھے۔

اسی طرح جو عرب بت نہیں بنا سکتے تھے ان کے ہاں پتھر بہت محترم تھے جن کی وہ پوجا کرتے چنانچہ حرم کے باہر یا دوسری جگہوں پر ایک پتھر نصب کرتے اور اس کے گرد طواف کرتے تھے وہاں پر لوگ قربانی کرتے جسے ذبح عشائر کہا جاتا تھا چنانچہ مشرکین کے اس عمل قبیح کیخلاف قرآن کریم کی سورۂ مائدہ کی آیت نمبر ۳ اور ۹۰ میں آیا ہے:

﴿حرمت علیکم المیتة والدم ولحم الخنزیر وما اهل لغیر الله﴾ ''تم پر حرام کیا گیا مُردار، خون، سور کا گوشت، وہ جانور جو خدا کے سوا کسی اور نام پر ذبح کیا گیا ہو''

زمانہ بعثت سے پہلے عربوں میں بت پرستی اس حد تک پھیلی کہ ہر قبیلے نے اپنے لئے ایک بت بنا رکھا تھا۔

اولاد ابراہیمؑ بن اسماعیلؑ کے دور میں سب سے پہلے جس قبیلے نے بت بنایا اس کا نام ھذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر ہے انہوں نے سواعا کا بت بنایا اور انہوں نے دین ابراہیمؑ کو چھوڑ کر دین بت پرستی کو اپنایا۔

کیونکہ ان کا ارتباط مدینے کی یثرب سے تھا اس لئے کلب بن وبرۃ جو خاندان قضاعہ سے تعلق رکھنے والے نے ود کو اپنا بت بنایا۔

عرب میں بتوں کی تعداد:

کیا یہ ممکن ہے عرب میں موجود بتوں کے اعداد و شمار کا پتہ لگایا جا سکے آیا وہ صنم وثن اور نصب ہی

کو خدا مانتے تھے یا انھیں خدائے واحد کی طرف علامت دے کر ان کی پرستش کرتے تھے یا ہر بت ایک جداگانہ خدا کی حیثیت رکھتا تھا عرب میں اہم بت اصنام اوثان اور انصاب تھے لیکن ان کی تعداد کو محصور کرنا ممکن نہیں بعض اصنام، اوثان اور انصاب کی تعداد حد سے زیادہ ہے اس سلسلے میں محمد جاوری کہتے ہیں ہر قبیلے میں ایک سے زائد بت ہوا کرتا تھا اور ہر قبیلے کی طرف سے ایک بت کعبہ میں رکھا جاتا تھا۔

جن افراد نے بتوں کی تعداد کو شمار میں لانے کی کوشش کی ہے یہ کوئی ایسی تحقیق نہیں جس پر اعتماد کیا جائے کہ ہر ایک عرب کے پاس ایک بت وثن یا نصب ہوتا تھا جو اس کا ذاتی خدا سمجھا جاتا تھا بعض نے کھجور کو بت بنایا ہوا تھا جب بھوک لگتی تو اس کا پھل کھاتے اوثان اصنام اور انصاب کی تعداد حد سے زیادہ تھی۔

بعض کتب سیر وتواریخ ابن اسحاق اور ابن ہشام وغیرہ نے ذکر کیا ہے کعبے میں ہر دن کے حوالے سے ایک بت تھا جنکی تعداد ۳۶۰ تھی۔ ابن کلبی نے کہا اگر کوئی انسان اس وقت کسی جگہ کیلئے سفر کرتا تو چار پتھر وہاں سے اٹھاتا اور ان میں سے خوبصورت پتھر کو اپنا رب قرار دیتا باقی تین کو چولہے کے طور پر استعمال کرتا اور پھر وہاں چھوڑ کر چلا جاتا۔

بعض نے کہا ہے ہم جاہلیت میں پتھر کی پوجا کرتے تھے یہاں تک کہ کسی منادی نے ندا دی اے جانے والے تمہارا رب نابود وختم ہو گیا ہے تم اپنے لئے ایک اور رب تلاش کرو تو سب پہاڑوں میں گھس کر اپنے لئے رب تلاش کرتے جب کوئی پتھر مل جاتا تو اس وقت آواز دیتے ہم نے اپنا رب پا لیا ہے پھر اس کی پوجا کرتے اور اس کے سامنے حیوانات ذبح کرتے اتاریدی یا عطاریدی کہتا ہے اگر ہمیں پتھر نہ ملتا تو ہم مٹی جمع کرتے اس پر بکری یا گوسفند کو پیشاب کراتے اور اس کیچڑ سے بت بناتے اور پھر اس کا طواف کرتے اہل مکہ کے ہر گھر میں ایک بت ہوتا تھا جب سفر کے لئے گھر سے نکلنے لگتے تو اس وقت بت کو مس کرتے اور سفر سے واپسی پر پھر اسے مس کرتے قریش میں

کوئی ایسا نہیں تھا جس کے گھر بت نہ ہوتا بڑے لوگوں کے گھر بڑے بت ہوتے، یہاں تک کہ قبائل کے نام بھی بتوں کے نام پر تھے۔

عرب میں مشہور بتوں کے نام منات عزیٰ، لات اور ہبل تھے یہ بتوں کی مثال نہیں تھے یا خدا کی پہچان نہیں تھے بلکہ یہ بذات خود انہیں خدا تصور کرتے تھے لہٰذا وہ لوگ ان کی تعظیم کرتے اور ان کے لئے خاص مراسم ادا کرتے یہ چاروں بہت مشہور تھے ان میں سے بعض طبیعت سے منسوب تھے بعض حیوانات اور بعض کسی اور چیز سے، منات صنم اور لات سب سے قدیم ترین بت تھے۔

ان بتوں کو مکہ و مدینہ کے درمیان دریا کے کنارے رکھا جاتا تمام عرب ان کی تعظیم کرتے اور یہاں آکر قربانی کرتے تھے۔ اوس وخزرج مکہ ومدینہ سے آتے جاتے وقت اسکے گرد گھومتے اور ان کی طرف نسبت دے کر بندوں کے نام رکھتے مثلاً زید منات، عبد منات اور اوس منات کہتے تھے۔

بتوں سے راز و نیاز

تاریخ بت پرستی میں بت پرستی کے مختلف اشکال وانواع دیکھنے میں آتے ہیں ان میں سے ایک بتوں کے سامنے تحفہ وتحائف ' ذبح حیوانات انسانوں ' حیوانوں اور املاک کو ان کے لئے وقف کرنا ہے۔

۱۔ اپنی اولادوں کی بتوں کے بندے کے عنوان پر نام گزاری کرنا۔

۲۔ وہ حیوانات جو خدا نے انسانوں کیلئے بطور نعمت ہبہ کیے ہیں انھیں بتوں کے نام وقف کر کے اپنے اوپر حرام قرار دینا، چنانچہ جن حیوانات کو مشرکین بتوں کے نام وقف کر کے اپنے اوپر حرام قرار دیتے تھے خدا نے ان کی مذمت میں آیت نازل کی ملاحظہ کریں:

﴿ماجعل الله من بحيرة ولاسائبة ولا وصيلة ولا حام ولكن الذين كفروا يفترون على الله الكذب﴾ ''اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ نہ وصیلہ اور نہ حام ۔مگر یہ کافر اللہ پر جھوٹی تہمت لگاتے ہیں'' (مائدہ/۱۰۳)

۱۔ بحیرہ: اگر کوئی اونٹنی چار بار لگاتار مادہ بچے پیدا کرتی اور چوتھی بار نر پیدا کرتی تو اسکا مالک اسکا کان چیر دیتا اور اسے آزاد کردیتا۔ اب وہ جہاں چاہے گھومے اسے کوئی نہیں روک سکتا اور نہ ہی کوئی اس پر سوار ہوسکتا ہے چاہے کوئی کتنا ہی مجبور کیوں نہ ہو۔ اسکے علاوہ اسے ذبح کرنے کا حق بھی کسی کو حاصل نہیں تھا۔

۲۔ وصیلہ: اگر کوئی گوسفند مادہ بچہ دیتا تو اسے یہ اپنے لیے مخصوص کرتے اور اگر نر ہوتا تو اسے بتوں کیلئے ذبح کرتے، اگر اسکے بعد پھر اس نے نر اور مادہ بچہ دیا تو نر کو ذبح نہیں کرتے بلکہ اسے آزاد چھوڑ دیتے تھے۔

۳۔ حام: وہ نر اونٹ ہے جس سے دس بچے پیدا ہوتے یہ اسکی پشت پر زخم لگاتے اور اس پر کوئی سوار نہیں ہوتا تھا۔

۴۔ بتوں کے نام سے نیاز کردہ حیوانات کو ان کے سامنے ذبح کرنا جسے ذبحِ علی الانصاب کہا ہے ۔اسے خدا نے حرام قرار دیا ہے:

﴿وما ذبح علی النصب﴾ ''اور جو نصاب پر ذبح کیا جائے'' (مائدہ/۳)

''انصاب'': انصاب جمع نصب مادۂ نصبہ سے ہے یہ کسی کو پریشان کرنے، پریشان دیکھنے یا کھڑا کرنے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

نصب کے معنی رنج وتعب کے ہیں:

﴿اتنا غدآء نا لقد لقینا من سفرنا ھذا نصبا﴾ ''اب ہمارا کھانا لاؤ ہم نے اس سفر میں بہت تھکان برداشت کی ہے'' (کہف/۶۲)

یعنی اس سفر سے ہمیں پریشانی اور تھکاوٹ ہوئی:

﴿انی مسنی الشیطٰن بنصب و عذاب﴾ ''شیطان نے مجھے بڑی تکلیف ۔ اذیت پہنچائی ہے'' (ص/۴۱)

نصب کے معنی کسی کو پریشان کرنا یا زحمت دینا ہے:

﴿وجوہ یومئذ خاشعۃ ط عاملۃ ناصبۃ﴾ ''اس دن بہت سے چہرے ذلیل اور رسوا ہوں گے۔ محنت کرنے والے تھکے ہوئے'' (غاشیہ/۲،۳)

ناجائز عمل بجالانا آخرت کے رنج وغم کا موجب بنتا ہے:

یعنی وہ بت جنہیں کسی جگہ نصب کیا ہو۔ یا جو عبادت کے لئے کسی جگہ گاڑ دیے ہوں اور لوگ ان کے سامنے قربانی دیں۔

نصب شئی سے مراد کسی چیز کو کسی جگہ قائم کرنا ہے جیسا بیان ہوا انصاب نصب سے ہے۔ جس کے معنی کسی چیز کو کسی جگہ پر گاڑنا ہے تاکہ یہ علامت اور حد بندی سمجھا جائے جیسے سرزمینِ پاک مکہ مکرمہ کے چاروں طرف پتھر یا تختیاں نصب ہیں جنہیں حدودِ حرم کی ابتداء وانتہا کا خط سمجھا جاتا ہے سورۂ غاشیہ آیت ۱۹ میں آیا ہے:

﴿والی الجبال کیف نصبت﴾ ''اور پہاڑ کو کس طرح نصب کیا گیا ہے''

اسی سے لفظ نصیب بنا ہے نصیب حصہ کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح زمانِ جاہلیت میں کعبہ کے نزدیک ایک پتھر نصب تھا جس کے پاس کعبہ کیلئے نذر کیے جانے والے جانوروں کو ذبح کیا جاتا تھا۔

ایک پتھر یا بت ہے جسکی جمع انصاب ہے۔ دور جاہلیت میں عرب اس کے سامنے حیوانات ذبح کرتے تھے۔ صاحب لسان العرب نے لکھا ہے نصب وہ پتھر تھا جسکی عرب پوجا کرتے تھے اور اپنے ذبیحوں کا خون اس کے پاس گراتے۔

مجاہد نے لکھا ہے، نصب ایک پتھر ہے جو کعبہ کے گرد نصب تھا دور جاہلیت میں عرب وہاں حیوانات ذبح کرتے اور انکے گوشت وخون کو کعبہ کی دیواروں پر مارتے۔ سورہ حج ۳۷ میں خداوند متعال نے فرمایا جو حیوان کو تم ان کے پاس ذبح کرتے ہو، ان کا گوشت اور خون ان تک نہیں پہنچتا۔

نصب ان پتھروں کا نام ہے جن کی پرستش کی جاتی تھی ابن کلبی نے انصاب کے بارے میں لکھا ہے جاہلیت میں جو شخص اپنے گھر میں بت نہیں بنا سکتا تھا وہ ایک پتھر حرم کے سامنے یا اپنے پاس رکھتا اور پھر اس کے گرد طواف کرتا ایسے پتھروں کو انصاب کہتے تھے انصاب وہ پتھر تھے جو کعبے کے گرد تھے ان پتھروں پر وہ تسبیح و تحلیل کرتے تھے اور یہاں پر گوسفند ذبح کرتے تھے۔

انصاب کا ذکر قرآن کریم میں تین جگہوں پر آیا ہے:

﴿وماذبح علی النصب﴾ ''اور جسے تھان پر ذبح کیا گیا ہو'' (مائدہ/۳) ﴿انما الخمر و المیسر والانصاب والازلام رجس﴾ ''شراب اور جوا اور مقدس تھان اور پانسے سب ناپاک شیطانی عمل ہیں'' (مائدہ/۹۰) ﴿کانھم الیٰ نصب یوفضون﴾ ''گویا وہ کسی نشانی کی طرف بھاگ رہے ہیں'' (معارج/۴۳)

جن بتوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے ان میں منات بھی ہے:

منات:

منات کا مشتق منا اور منیہ سے ہے اس کے معنی موت و تقدیر کیے جاتے ہیں یہ بت مکہ کی ایک ایسی جگہ پر تھا جہاں بت پرست گوسفند کا خون بہاتے تھے۔ زمانہ بابلین میں منات کو منا تو کہتے تھے منات قبائل عرب میں زیادہ منتشر تھے ''عبد منات'' اس سے منسوب ہے سورۂ نجم آیت ۲۰ میں لات کے بعد منات کا ذکر آیا ہے:

﴿ومنوۃ الثالثۃ الاخریٰ﴾ ''اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے؟''

یہ بت قبیلہ ہریلوعزہ سے مخصوص تھا مکہ اور مدینہ کے درمیان دریا کے کنارے پر نصب تھا اسے کالے پتھر سے بنایا گیا تھا اوس و خزرج اس کی پوجا کرتے تھے۔ ارباب لغت نے منات کو مادۂ منا سے لیا ہے منات وہ بت ہے جسے عمر بن لحی شام سے حجاز لایا، اہل بابل اسے موت کا خدا سمجھتے تھے

اہل عرب اسکی طرف زیادہ متوجہ تھے اس لئے یہ اپنے بچوں کے نام بھی اس سے منسوب کرتے تھے جیسے زائد مناتؔ عبدالمنات وغیرہ۔ فتح مکہ پر حضرت محمدؐ نے حضرت علیؑ کو بھیجا تا کہ منات کو گرا دیں۔ بت پرستی و وثن پرستی عرب میں اس حد تک سرایت کرگئی تھی کہ ہر قبیلے کے لئے ایک بت تھا کہا جاتا ہے سب سے پہلے عرب میں بت پرستی حضرت اسماعیل کی نسل سے شروع ہوئی جہاں انھوں نے اپنے اولادوں کے نام بتوں سے منسوب کیے جس نے بت پرستی کا آغاز کیا اس کا نام ھذیل بن مدرکہ بن الیاس بن مضر تھا اس کا ذکر قرآن کریم کی سورہ نجم کی آیت ۲۰ میں آیا ہے:

﴿و منٰوۃ الثالثۃ الاخریٰ﴾ ''اور تیسری ایک دیوی منات کی حقیقت پر کچھ غور بھی کیا ہے؟''

لات:

لات قدیم زمانہ کی عربی ہے لات کے معنی مؤنث خدا کے کیے جاتے تھے لات ایک ایسا پتھر ہے جو عورت کی شکل میں تھا قرآن کریم میں لات کا ذکر سورہ نجم کی آیت ۱۹ آیا ہے:

﴿افرئیتم اللٰت والعزیٰ﴾ ''بھلا تم لوگوں نے لات اور عزیٰ کو دیکھا ہے؟''

شہر طائف میں قریش اور دیگر قبائل عرب اس کی پوجا کرتے تھے اس بت کو لات کہنے کی توجیہ میں لکھتے ہیں پرانے زمانے میں ایک مرد اس پتھر پر بیٹھ کر حج و زیارات پر آنے والوں کیلئے روغن بیچتا تھا۔ جب اس شخص کا انتقال ہوا تو عمرو بن لحی نے کہا وہ مرا نہیں ہے بلکہ اسی پتھر کے اندر چلا گیا ہے۔ اس وقت سے لوگوں نے اس کی پوجا کرنا شروع کی اور اس وقت اس کا نام لات رکھا زمانہ گزرنے کے ساتھ ت گر گئی صرف لا رہ گیا۔ یہ افسانہ درحقیقت اہل بابل کے مؤنث بتوں کا نام ہیں لات بعل کی بیٹی اور منات کی بہن ہے اب وہ بت کو رب النوع اور مظہر خورشید سمجھتے ہیں۔ عرب جاہلیت کے پاس اجنبی جیسی ہے۔

جنگ اُحد میں ابوسفیان اسے اپنے ساتھ لایا، فتح مکہ کے موقع پر پیغمبر اکرمؐ نے مغیرۃ ابن شعبہ او رعقاب بن مالک کو بھیجا تا کہ وہ لات کو گرادیں۔

عزیٰ:

ان بتوں میں سے ایک بت عزیٰ ہے یہ اسم مونث تعزیر ہے مصدر عزت سے لیا ہے یہ بھی عورت کی شکل میں تھا سورہ نجم آیت نمبر ۱۹ میں اس کا ذکر آیا ہے:

عرب قریش اس کا بہت احترام کرتے چنانچہ بہت سے قریشوں کو اسی بت سے منسوب کیا ہے اہل لہب کو عبدالعزیٰ کہتے قائم تھا۔ اس بت کا بت خانہ ذات ارد میں تھے جو شہر عراق سے مکہ آتے وقت راستے میں تھا۔ یہ بت لکڑی کا بنا اس کے تینوں اطراف پتھر کے بت رکھے ہوئے تھے بت پرست اسکے پاس جانور ذبح کرتے' اپنی بیماریوں میں اس سے توسل کرتے۔ ابوسفیان جب جنگ کیلئے آیا تو اس کے جھنڈا پر عزیٰ کا نقشہ تھا اور اسکا نعرہ تھا عزیٰ تو ہمیں فتح دے۔

بت کے مصادیق: قرآن میں مندرجہ ذیل بتوں کے نام آئے ہیں:

شعریٰ: ماہرین علم نجوم کہتے ہے دو ستارے شعریٰ کے نام سے معروف تھے ایک دب اکبر اور دوسرا دب اصغر۔ پہلے کا نام شعر عبوریا اور دوسرے کو شعریٰ شامی کہتے تھے قرآن میں شعریٰ شامی کا ذکر آیا ہے قبیلہ حمیر اور حزا زمانہ جاہلیت میں اس ستارے کی پرستش کرتے تھے سب سے پہلے پرستش کرنے والے عربوں میں ابوکلشیہ تھا اس نے بت پرستی میں تبدیلی کی اس وجہ سے عرب اسکے مخالف تھے بعض عرب جاہلیت دین اسلام کو اپنی تقلید رسومات کے خلاف سمجھتے تھے وہ لوگ پیغمبر اکرم کو ابوقلشیہ کی طرف نسبت دیتے تھے اس ستارے میں نورانیت تھی اس وجہ سے لوگوں نے اس کی پرستش شروع کی خصوصا گرمیوں میں مصری ستارا شعریٰ کو برکت اور فروانی نعمت کی علامت سمجھتے تھے مصری ستارہ شعریٰ سے پیشن گوئیاں کرتے، اہل بابل کے پاس شعرا خشک سالی کی نشانی

تھا لہٰذا وہ عرب کی تقلید کرتے ہوئے اسکی مخالفت کرتے تھے ۔شعراء زمین کے نزدیک ترین ستاروں میں سے ہے بعض کے مطابق ۸۰۸ سال نوری زمین سے فاصلہ رکھتا ہے اس کا نور زمین پر یہ سورج سے ۵۰ برابر زیادہ ہے اور ۲۸ برابر نور دیتا ہے خورشید کے مقابلے میں ۔قرآن کریم سورۂ نجم آیت ۴۹ میں آیا ہے شعری ایک ستارہ ہے:

﴿وانہ ھورب الشعرٰی﴾ ''اور یہ کہ وہی (ستارہ) شعریٰ کا مالک ہے''

بعل:

یہ کلمہ قرآن کریم میں ایک دفعہ سورۂ ہود آیت نمبر ۷۲ میں حضرت سارہ کی زبان سے نکلا ہے ﴿ھذا بعلی شیخا﴾ ''اور میرے میاں بھی بوڑھے ہیں'' جب ملائکہ نے انہیں حضرت اسحاق کی ولادت کی خبر سنائی یہاں بعل شوہر کے معانی میں آیا ہے اسی طرح سورۂ بقرہ آیت ۲۲۸، سورۂ نور آیت ۳۱ میں شوہر کے معانی میں آیا ہے:

﴿وبعولتھن احق بردھن فی ذلک ان ارادوا اصلاحًا﴾ ''ان کے شوہر تعلقات درست کر لینے پر آمادہ ہوں'' ﴿الا بعولتھن﴾ ''اپنے شوہروں''

سورۂ صافات آیت ۱۲۵ میں بعل کا جو کلمہ آیا ہے وہ بت کے معنوں میں آیا ہے:

﴿اتدعون بعلًا﴾ ''کیا تم بعل کو پکارتے ہو'' جس کے بارے میں صاحب تفسیر طبری نے تین توجیہ بیان کی ہیں:

۱۔ اس بت کا نام ہے جسکی قوم الیاس پرستش کرتی تھی۔

۲۔ بعل ایک عورت کا نام ہے جس کی قوم الیاس پوجا کرتی تھی۔

۳۔ بعل یعنی صاحب و مالک کے معانی میں آیا ہے ۔بعال کے بارے میں لکھتے ہیں یہ زبان سریانی ہے یہ بابل میں کعنان کا بت تھا جسکی حضرت الیاس کے زمانے میں بنی اسرائیل پرستش

کرتے تھے لیکن صاحب کتاب راغب اصفہانی نے تمام معنٰی کی برگشت ایک معنٰی کی طرف دی ہے جس کا معنی بلندی پسند اور تسلط کے ہیں۔ پہلے زمانے میں بعل صرف خورشید کو کہتے تھے گزشتہ اختلاف زمان اور مکان کے لحاظ سے اس میں تبدیلی آئی ہے۔ پہلے زمانے میں یہ فی فینکو کے پاس تھا۔ جبکہ بعد میں انکے آباد کردہ شہروں بھی لے جایا گیا۔ شہر کلیدا کے رہنے والے ہر ستارے کے لیے ایک بت بناتے تھے، ہفتہ میں ایک دن اس کی پرستش کرتے تھے' ستارہ زہرہ ان کے پاس عشق کا مظہر تھا مریخ خدا جنگ اور بہت اہمیت کا حامل تھا اہل بابل ستارا شناسی کی غرض سے ایک ستارے سے دوسرے ستارے کے درمیان فاصلہ معلوم کرتے' انکا نظریہ تھا چاند' عطارد' زہرہ' خورشید' مریخ' مشتری' زحل یہ سات ستارے پوری کائنات کی تعبیر کرتے ہیں یہ انھی کے ذریعے حوادث زمانہ کو درک کرنے کا دعویٰ بھی کرتے تھے۔

(۱) ''نسر'': زمان حضرت نوحؑ میں بت پرست پانچ بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ ان کے نام سورہ نوح آیت نمبر ۲۳ میں آئے ہیں:

﴿وقالوا لاتذرن الهتكم ولاتذرن ودًا ولا سواعًا ولا يغوث ويعوق ونسرًا﴾ ''اور کہنے لگے: اپنے معبودوں کو ہرگز نہ چھوڑنا اور ود' سواع' یغوث' یعوق اور نسر کو نہ چھوڑنا''

بت نسر پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں بھی تھا عرب میں قوم حمیر اور مملکت سباء والے اس کی پرستش کرتے تھے۔ یہ بت پیغمبر اکرمؐ کے ہاتھوں منہدم اور نیست ونابود ہوا۔

(۲) بت بنام ''ود'': اس کی پرستش کرنے والوں کا خیال تھا کہ یہ بت انکے اور خدا کے درمیان دوستی اور ربط کا وسیلہ ہے۔ یہ بت دور جاہلیت میں دومۃ الجندل میں تھا۔ یہ وہی علاقہ ہے جہاں عمرو عاص اور ابوموسیٰ اشعری دونوں نے مسئلہ خلافت پر بحث وگفتگو کی۔ عمرو عاص نے علیؑ کو خلافت سے معذول کیا ان دونوں کی گفتگو حکمین کے فیصلے کے نام سے معروف ومشہور ہے اس زمانے میں

عرب اپنے بیٹوں کے نام اس بت کے نام سے منسوب کر کے رکھتے تھے جیسا کہ جنگ خندق میں امیر المومنین علیؑ کے مقابلے میں آنے والے پہلوان کا نام عمرو بن عبد وود تھا

(۳) تیسرا بت ''یعوق'': یہ بت یمن میں تھا اور قبیلہ ہمدان کے لوگ اس بت کی پرستش کرتے تھے

(۴) یغوث: اس بت کی پرستش قبیلہ مذجج اور اس کے حلیف کرتے تھے۔

(۵) سواع: کتاب قاموس قرآن میں مادہ سواع میں علامہ قرشی لکھتے ہیں یہ پانچ بت آدم ونوح کے زمانے میں موجود نیک مردوں کے نام تھے گزشت زمان کے ساتھ لوگوں نے ان کے مجسمے بنا لئے اور ان کی پرستش شروع کردی۔ قبیلہ عزیر بن مدر اور قبیلہ لہیان کے لوگ بت سواع کی پوجا کرتے تھے۔ غلبہ اسلام کے بعد پیغمبر اکرمؐ نے عمرو بن عاص کو اسے توڑنے کے لئے بھیجا یہ بت عورت کی شکل وصورت میں بنا تھا چنانچہ فرہنگ قصص قرآنی میں العھام کی جگہ پر اس کا ذکر ہے۔

بتوں کی شکل وصورت

بتوں کو کسی اعداد وشمار میں لانا ایک مشکل عمل ہے۔ قرآن کریم جو ہر قسم کی تحریف اور غلط بیانی سے پاک ومنزہ کتاب ہے اور اقوام وملل کے دیرینہ حقائق ومناظر کیلئے واحد مصدر ہے۔ اس میں اس حوالے سے ہمیں جو آیات ملتی ہیں ان میں ذکر ہے ہر دور کے نبی کو بت پرستوں کا سامنا ومقابلہ کرنا پڑا ہے۔

ان تمام اقسام وانواع معبودات باطل جنھیں ہم بت کہتے ہیں ہر ایک کے امتیازات اور خصوصیات ایک دوسرے سے ممتاز ہیں انھیں قرآن کریم نے دو الفاظ میں محصور کیا ہے۔

تاریخ بت پرستی میں جہاں بت پرستوں نے سونے چاندی پتھر لوہے اور لکڑی کے بت بنائے ہیں وہاں ہی بتوں کی شکل وصورت کا انتخاب بھی بت پرستوں کی سابق معتقدات اور تقدیس کی بنیاد پر کیا گیا تھا وہ اشکال مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ بُتِ انسان:

عرب بت پرستوں نے مختلف شکلوں میں بت بنا رکھے تھے ان میں سے ایک شکل جس کی پوجا کی جاتی وہ عامر ابن طفیل کا بت تھا جو اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر کے ارد گرد نصب کیا گیا اس کی لمبائی ایک میٹر تھی کوئی حیوان، کوئی سواری اور نہ ہی کوئی پیدل اسکی حدود سے گزر سکتا تھا اس لیے کہ یہ بت عامر ابن طفیل کے احترام میں بنایا تھا اس طرح انھوں نے اپنی اشراف بزرگوں اور روسا کو بھی بتوں کا مقام دے رکھا تھا انکے سامنے خاضع و خاشع ہوتے، عمر ابن لحیہ حج کے موقع پر حیوانات ذبح کر کے لوگوں کو کھلاتا اور ناداروں میں کپڑے تقسیم کرتا۔ اس کی یہ سیرت اسکی مقبولیت کی وجہ بنی، آخر میں لوگوں نے اسے ربوبیت کے مقام تک پہنچایا اور اسکی پوجا شروع کی۔

۲۔ حیوان کی شکل:

''بت ود'' شیر کی شکل میں، ''بت یعوق'' گھوڑے کی شکل میں ''بت نسر'' باز کی شکل میں اور ایک بت ''بت غزالہ'' ہرن کی شکل میں تھا۔ بعض بت کبوتر کی شکل میں ہوتے، ان بتوں کے سامنے دانے بھی رکھے جاتے تھے۔ اگر کوئی حیوان فرار کر کے ان بتوں کے پاس آجاتا تو مالک اسے واپس نہیں لے جاسکتا تھا۔ جن حیوانات کو مشرکین نے تقدس واحترام دیا ہے ان کا ذکر سورۂ انعام ۱۳۵ تا ۱۳۸، مائدہ ۱۰۳ میں آیا ہے:

﴿وجعلوا لله مما ذرا من الحرث والانعام نصیباً فقالوا هذا لله بزعمهم وهذا لشركائنا فما كان لشركائهم فلا یصل الله وما كان لله فهو یصل الیٰ شركائهم ساء ما یحكمون۔ وكذلك زین لكثیرٍ من المشركین قتل اولادهم لیردوهم ولیلبسوا علیهم دینهم ولو شاء الله مافعلوه فذرهم ومایفترون۔ وقالوا هذه انعام وحرث حجر لا یطعمها الا من نشاء بزعمهم وانعام حرمت ظهورها وانعام لا یذكرون اسم الله علیها افتراءً علیه سیجزیهم

بما کانو ایفترون ﴾

''ان لوگوں نے اللہ کیلئے خود اُسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں یہ اللہ کیلئے ہے بزعم خود اور یہ ہمارے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کے لیے۔ پھر جو حصہ اُن کے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کیلئے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کیلئے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے کیسے بُرے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ! اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کیلئے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنادیا ہے تاکہ ان کو ہلاکت میں مبتلا کریں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنادیں اگر اللہ چاہتا تو یہ ایسا نہ کرتے لہذا انھیں چھوڑ دو کہ اپنی افترا پردازیوں میں لگے رہیں ۔کہتے ہیں یہ جانور اور یہ کھیت محفوظ ہیں انھیں صرف وہی کھا سکتے ہیں جنھیں ہم کھلانا چاہتے ہیں حالانکہ یہ پابندی ان کی خودساختہ ہے پھر کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کردی گئی ہے اور کچھ جانور ہیں جن پر یہ اللہ کا نام نہیں لیتے اور یہ سب کچھ انھوں نے اللہ پر افترا کیا ہے عنقریب اللہ انھیں ان افترا پردازیوں کا بدلہ دے گا'' (انعام/۱۳۵ تا ۱۳۸)

۳۔ نباتات:

جزیرۃ العرب میں پانی کی قلت تھی لہذا جو درخت یا پودے وہاں اُگتے یہ ایک خاص اہمیت کے حامل ہوتے تھے اور انکے نزدیک محترم شمار ہوتے، یہاں تک ان کے کاٹنے پر بھی پابندی ہوتی تھی۔ یہاں سے ہی انھوں نے ان درختوں کو مزارات قرار دیا اور اپنے بتوں کو انکی شکل میں نصب کیا۔ ان مقدس درختوں میں سے ایک کھجور کا درخت ہے جو انسانی جسم کے لئے مقویم کی حیثیت رکھتا ہے عربوں نے اسے پہلے دن سے ہی اپنے سامنے پایا۔ اس سے انکی ضرورت پوری ہوتی تھی یعنی اس نے انکی بھوک کو دور کیا لہذا اسے محترم شمار کرنے لگے چنانچہ نصاریٰ نجران دین نصاریٰ قبول

کرنے سے پہلے اپنے علاقے میں ایک کھجور کے درخت کی پرستش کرتے تھے وہ عید کے موقع پر اسکے گرد جمع ہوتے اور اسے اچھا لباس پہناتے تھے۔ جنوب عرب میں درختوں کی پرستش کا بہت رواج تھا۔ وہ سرسبز درخت کے پاس آتے اور اپنا اسلحہ اس کے اوپر چھوڑتے، اسکے سامنے قربانی کرتے اور ایک دن اسکے پاس گذارتے تھے۔

جنگِ حدیبیہ کے موقع پر پیغمبرؐ نے جس درخت کے نیچے اپنے اصحاب سے بیعت لی جس کا ذکر سورۂ فتح آیت نمبر ۱۸ میں آیا ہے:

﴿اذ یبایعونك تحت شجرة﴾ ''جو درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے''

بعد میں بعض لوگوں نے اس کی پوجا کرنی شروع کی اور اس کو لات و منات کے برابر اٹھایا۔ لہٰذا حضرت عمر نے اسکو کٹوا دیا۔ اسی طرح ابن نجران کے ہاں ایک کھجور کا بڑا درخت تھا وہ ہر سال یہاں پر عید مناتے' اسے اچھے لباس پہناتے اور اس کے گرد طواف کرتے تھے۔

اسی طرح ستاروں کی پرستش کرتے کہ وہ ان کی زندگی کے نفع و نقصان میں کردار رکھتے ہیں یہی سے لوگوں نے اس دروازے سے دنیا بنانے کے لیے علم نجوم سیکھنا شروع کیا لہٰذا شریعت نے اس حوالے سے علم نجوم سیکھنے سے منع کیا ہے:

[ایھا الناس ، ایاکم و تعلم النجوم الا مایھتدی به فی برّ او بحرٍ، فانھا تدعوالیٰ الکھانة، والمنجم کالکاھن، والکاھن کالسّاحر، والسّاحر کالکافر، والکافر فی النار اسیروا علیٰ اسم الله] ''ایہا الناس! خبردار علم نجوم مت حاصل کرو مگر اتنا ہی جس سے برّ و بحر میں راستے دریافت کیے جاسکیں کہ یہ علم کہانت کی طرف لیجاتا ہے اور منجم بھی ایک طرح کا کاہن (علم غیب کی خبر دینے والا) ہو جاتا ہے جبکہ کاہن جادوگر جیسا ہے اور جادوگر کافر جیسا ہوتا ہے اور کافر کا انجام جہنم ہے۔ چلو نام خدا لے کر نکل پڑو'' (خطبہ/۷۹، ترجمہ، جوادی، ص ۱۳۹)

ایک صاحب شعور کے تعجب میں اس وقت اضافہ ہوتا ہے کہ قرآن وروایات اور علماء کی طرف سے نجوم کا انسانی زندگی میں کردار کا عقیدہ باطل ہونے کے باوجود خدا پرستوں کی زندگی میں ستارہ پرستی کے آثار نظر آتے ہیں ہماری اپنی درسگاہوں میں اس نظریہ کی تائید میں جنتریوں کا نشر ہونا ایک بڑا ظلم ہے۔

۴۔ جن:

عرب بدو وانسانی زندگی میں جنوں کے تصرف کے قائل تھے لہٰذا جو چیز انسان کیلئے محال نظر آتی اسے جن کی طرف نسبت دیتے تھے چنانچہ سورۂ انعام آیت ۱۲۸، جن آیت ۶ میں اسکا ذکر آیا ہے:

﴿ویوم یحشرهم جمیعًا یمعشر الجن قد استکثرتم من الانس وقال اولیٰوهم من الانس ربنا استمع بعضنا ببعض وبلغنا اجلنا الذی اجلت لنا﴾ ''جس روز اللہ ان لوگوں کو گھیر کر جمع کرے گا اس روز وہ جنوں (یعنی شیاطین جن) سے خطاب کر کے فرمائے گا اے گروہ جن! تم نے تو نوع انسانی پر خوب ہاتھ صاف کیا۔ انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے وہ عرض کریں گے پروردگار ہم میں سے ہر ایک نے دوسرے کو خوب استعمال کیا ہے اور اب ہم اس وقت پر آپہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لئے مقرر کر دیا تھا'' (انعام/۱۲۸) ﴿وانه کان رجال من الانس یعوذون برجالٍ من الجن فزادوهم رهقًا﴾ ''اور یہ کہ انسانوں میں سے کچھ لوگ جنوں میں سے کچھ لوگوں کی پناہ مانگا کرتے تھے اس طرح انھوں نے جنوں کا غرور اور زیادہ بڑھا دیا'' (جن/۶)

﴿یابت لا تعبد الشیطٰن ان الشیطٰن کان للرحمن عصیا﴾ ''اے ابا شیطان کی پوجا نہ کریں کیونکہ شیطان تو خدائے رحمان کا نافرمان ہے'' (مریم/۴۴) ﴿بل کانوا یعبدون الجن اکثرهم بهم مومنون﴾ ''بلکہ وہ تو جنات کی پرستش کرتے تھے اور

ان کی اکثریت انہی کو مانتی ہے﴾"(سباء/۴۱)

﴿وانہ کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادو ھم رھقا﴾ "اور یہ کہ بعض انسان بعض جنات سے پناہ طلب کیا کرتے تھے جس سے جنات کی سرکشی مزید بڑھ گئی"(جن/۶)

کلدانیوں کے بت:

کلدانیوں نے سورج اور چانداور ستاروں کی پرستش کی ہے انھوں نے ہر ستارے کے لیے ایک دن عبادت کے لیے مخصوص کیا۔اتوار سورج کا دن ہے اس لیے اس کو Sunday کہتے ہیں پیر چاند کا دن ہے اس لیے اس کو Monday کہتے ہیں ہفتہ زحل کا دن ہے اس لیے اسے Saturday کہتے ہیں کلدانیوں نے اپنے اسے پہلے والی قوم اشوریین سے بت پرست اور بت سازی کے طریقہ کو سیکھا۔ کلدانیون نے اس نظریہ کوفروغ دیا کہ روئے زمین پر خوشحالی کے آثار بروج آسمانی سے وابستہ ہیں لہٰذا انسان کواپنے برج سے آگاہ ہونا چاہیے۔

کلدانیوں نے بظاہر طبیعت کی پرستش کی ہے لہٰذا اپنے خداؤں کے حوالے سے درجات کے قائل ہیں۔ان کے پاس سب سے بڑا بت آسمان ہے اس کا نام ایل ہے ان کے پاس یہ باپ کی جگہ ہے قدرت بھی رکھتا ہے رحم دل بھی ہے جس نے تمام مخلوقات کو خلق کیا ہے اس کا بت باوقار محترم اور بوڑھے کی شکل میں بنایا گیا دوسرا بت "عشروت" ہے یہ بت ماں ہے اس کے بعد بت بعل ہے جو راحت اور برکت اور بارش کا خدا ہے یہ ایک سرشار جوان کی طرح بنایا گیا اسی طرح انھوں نے سبزی اور نباتات کے لیے بت بنایا جسے "عنات" کہتے ہیں یہ بعل کی بہن ہے عشیرا یہ بعل کی بیوی ہے کلدانیوں نے چشمے، کنویں اور درختوں کی پرستش کی ہے۔

انواع واقسام بت اور بت پرستی:

بت پرستی کب، کیسے اور کن بنیادوں پر شروع ہوئی، اسکا دقیق تعین کرنا نہایت مشکل ہے کیونکہ قدیم زمانے کی تمام قومیں بت پرستی کی اسیر تھیں لیکن بتوں کی شکل وصورت اور بت پرستی کا انداز مختلف تھا۔ جو بت ہندوستان کے بت پرستوں براہمہ بوزی اور ہندووں کے بت کدوں میں تھے اور جو بت مملکت سبا' قوم عاد ثمود اور قوم ہود وصالح میں تھے وہ ایک دوسرے سے مختلف تھے۔

بت پرستی

ہر وہ عمل جسے کوئی شخص' نظام' تنظیم یا پارٹی اور نام نہاد دینی سرگرمیاں جو انسان کو آگاہی اور تحقیق سے روکنے کا کردار ادا کریں وہ بت پرستی کہلائے گی۔ بت پرستی کے مصادیق کو ہم خلاصہ کی شکل میں پیش کرتے ہیں۔

۱۔ کسی مادی شکل کی یادگار کو فروغ دینا۔

۲۔ غیر صالح اور نااہل افراد کی قیادت کا پرچار کرنا۔

۳۔ انتہا پسند اور رجعت پسند تنظیموں کو بیک وقت ایک ملک اور ایک ہی جماعت میں وجود میں لانا تاکہ ملت جادۂ مستقیم کو نہ پہچان سکے یا اپنے خلاف ہونے والے عزائم اور سازشوں کا مقابلہ نہ کر سکے۔

۴۔ قومی ولسانی فکر کو فروغ دینا۔

۵۔ دین ومذہب سے ہٹ کر ترقی میں محو ہونے کے افکار کو فروغ دینا۔

۶۔ وہ علوم جو انسان کو دین وخدا سے روکتے ہیں انھیں فروغ دینا۔

۷۔ کاروبار وتجارت کو بنیادی مقام دینا۔

۸۔ آباؤ اجداد کی یادوں کو زیادہ اٹھانا اور عصر حاضر سے زیادہ ماضی میں محو ہونا۔

۹۔ وہ اولاد جو دین سے باغی ہے اسکی خوشی کو اپنی خوشی سمجھنا۔

۱۰۔ مال و دولت

۱۱۔ ملازمت

۱۲۔ قبیلہ و خاندان

۱۳۔ کہنہ پرستی۔

جن سے حاجت طلب کی جاتی ہے خود نیاز مند اور محتاج ہیں

خدا کو چھوڑ کر کسی سے اپنی حاجات کو وابستہ کرنا عقل و منطق سے عاری عمل ہے۔ قرآن نے ایسا کرنے والوں کو کافر اور مشرک قرار دیا ہے اسی کے ساتھ ان کے دلیل کا مطالبہ بھی کیا ہے۔ قرآن کریم میں خداوند متعال نے بت پرستی کے عمل کے غلط ہونے کے بارے میں چند دلیل سے استدال کیا ہے یہ دلائل بعض پر تو پوری طرح صادق آتے ہیں اور بعض کے جذبات پر ان کا اطلاق ہوتا ہے۔ بتوں کی اقسام ہم پہلے بیان کر چکے ہیں لہذا یہاں تکرار نہیں کرتے قرآن کریم نے جن دلائل سے استدلال کیا وہ قارئین کی خدمت میں پیش کرتے ہیں:

بت پرستی کی ممانعت کی وجوہات:

(۱) نفع ونقصان کا مالک ہونا' جلب' منفعت اور دفع وضرر تمام عقائد کا فلسفہ و حکمت کی برگشت اسی کی طرف ہے لہذا اللہ تعالی نے بتوں سے وابستگی ولگاو اور ان کی پوجا و پرستش کو بہت سی آیات میں اس منطق کے تحت مسترد کیا ہے کہ بت نہ تو مالک نفع ہیں اور نہ ہی مالک نقصان۔

۲۔ یہ نہ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں لہذا تمہاری نہ دعا کو سنتے ہیں نہ حالت زار کو دیکھتے ہیں یہ استدال ان تمام بتوں پہ صادق آتا ہے جو جامد ہیں چاہیے ساخت انسانی ہو یا موجود طبیعی جیسے درخت ستارے پانی دریا وغیرہ کے مانند ان کا ذکر مندرجہ آیات میں آیا ہے:

﴿ان تدعوهم لا یسمعو دعائکم ولو سمعوا ما استجابو الکم ویوم القیٰمة یکفرون بشرککم﴾ ''انھیں پکارو تو وہ تمہاری دعائیں سن نہیں سکتے اور سن لیں تو ان کا تمہیں کوئی جواب نہیں دے سکتے اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کردیں گے'' (فاطر/۱۴) ﴿کانهم خشب مسندة﴾ ''یہ گویا لکڑی کے کندے ہیں'' (منافقون/۴)

۳۔ وہ فاسد ظالم جابر انسان ہیں جنھوں نے عوام کی جاہلیت و نادانی سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی جبر وتشدد کے علاوہ خود کو حکام الوہیت پر پیش کر کے لوگوں کو اپنا عبد بنایا ہے ان کے بار ے میں مندرجہ ذیل آیات میں ذکر ہے:

﴿قل ادعوا الذین زعمتم من دونه فلا یملکون کشف ضر عنکم ولا تحویلاً﴾ ''ان سے کہو پکارو دیکھو ان معبودوں کو جن کو تم خدا کے سوا (اپنا کارساز) سمجھتے ہو وہ کسی تکلیف کو تم سے نہیں ہٹا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں'' (اسراء/۵۶) ﴿واتخذوا من دونه الهةً لا یخلقون شیئًا وهم یخلقون ولا یملکون لانفسهم ضرًا ولا نفعًا ولا یملکون موتًا ولا حیٰوةً ولا نشورًا﴾ ''لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لئے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے جو نہ مار سکتے ہیں نہ جلا سکتے ہیں نہ مرے ہوئے کو پھر اٹھا سکتے ہیں'' (فرقان/۳) عنکبوت ۱۷، سبا ۲۲، فاطر ۱۳، زمر ۴۳ نمل ۷۵۔

☆۔ صاحبان مال و دولت: یہ لوگ گرچہ بقول بعض نہ ختم ہونے والے مال و دولت کے حامل ہیں لیکن اپنے اندر بغض رکھتے ہیں:

﴿قل لو انتم تملکون خزائن رحمة ربی اذًا لامسکتم خشیة الانفاق﴾ ''اے نبیؐ ان سے کہو اگر کہیں میرے رب کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں ہوتے تو تم خرچ ہو جانے کے اندیشے سے ضرور ان کو روک رکھتے'' (اسراء/۱۰۰) ط

۸۹، فتح ۱۱، نمل ۴۳، ۷، مائدہ ۲۶۔

☆۔ انبیاء واولیاء سے حاجتیں وابستہ نہ کریں کیونکہ ایسا کرنا بعثت انبیاء کی حکمت کے خلاف ہے نہ یہ دین ہے اور نہ ہی حکم خدا ہے بلکہ ان کے بعثت کے خلاف ایک سازش ہے اس فکر کو فروغ دینے کی وجہ انبیاء کی پیروی کرنے سے روکنا ہے، ان سے حاجتیں مانگنا ان کی فضیلت نہیں بلکہ ان کی پیروی کرنا اور انھیں مقتداء بنانا ان کی فضیلت ہے انبیاء کو خداوند متعال نے تبلیغ وترویج دین اور نفاذ واجرا قانون الٰہی کے لیے منتخب کیا جبکہ ان لوگوں نے ظالم وجابر حکمرانوں کے لیے میدان خالی کرنے کے خاطر ان ذوات پاک کی قیادت و رہبری کے مسئلے کو لوگوں کے اذہان سے محو اور فراموش کر کے ان سے حاجت طلبی دنیا کے مسئلے کو معاشرے میں موضوع بحث وگفتگو بنا رکھا ہے یہ اس مشن کو سرگرم کرا اور تقویت دینے کے لیے معاوضہ دے کر لوگوں کے ضمیر وجدان کو خریدتے ہیں اور اس فکر سے اختلاف نظر رکھنے والوں کو طرح طرح کی تہمتیں وافتراء یا ضرورت پڑنے پر طاقت استعمال کرنے کی دھمکی دے کر بھی ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

انبیاء واوصیاء کو مقام نبوت ورہبری سے اٹھا کر مقام الوہیت تک لے جانے کی مذموم روش یہودیوں اور مسیحیوں نے اپنائی ہے چنانچہ ان کے رد میں قرآن کریم میں یہ آیات آئی ہیں:

﴿لقد کفر الذین قالوا ان اللہ ھو المسیح ابن مریم﴾ ''یقیناً کفر کیا اُن لوگوں نے کہا کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے'' (مائدہ/۱۷) ﴿وقالت الیھود عزیر ابن اللہ و قالت النصٰری المسیح ابن اللہ ذالک قولھم بافواھھم یضاھئون قول الذین کفروا من قبل قاتلھم اللہ انی یؤفکون۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ والمسیح ابن مریم وما امروا الا لیعبدوا الٰھا واحدا لاالٰہ الا ھو سبحنہ عما یشرکون﴾ ''اور یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے اور نصاریٰ کہتے ہیں کہ مسیح

اللہ کا بیٹا ہے یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں ان لوگوں کی باتوں کے مشابہ ہیں جو ان سے پہلے کافر ہو چکے ہیں اللہ انھیں غارت کرے، یہ کدھر بہکتے پھرتے ہیں؟۔انھوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء اور راہبوں کو اپنا رب بنالیا ہے اور مسیح بن مریم کو بھی حالانکہ انھیں یہ حکم دیا گیا تھا کہ خدائے واحد کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں جس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ذات ان کے شرک سے پاک ہے'' (توبہ/۳۰ تا ۳۱) مریم ۲۷،

انھیں کی تقلید کرتے ہوئے غالیوں اسماعیلیوں نے دین وشریعت کو معطل کر کے آئمہ طاہرینؑ کو مقام الوہیت اور ان سے حاجتیں اور نیازیں حاصل کرنے کے لیے پیش کیا ہے ان کا کہنا ہے خداوند عالم نے پہلے ان کو خلق کیا پھر تخلیق کائنات کو ان کے سپرد کیا ہے یا تدبیر کائنات کے سلسلہ میں یہودیوں اور مسیحیوں کے افکار کو لیا ہے آیات وروایات اور سیرت معصومینؑ کے علاوہ ان کے دعویٰ کے باطل ہونے پر عقل حاکم ہے عقل انسانی اس سلسلے میں ان گمراہوں ومنحرفین سے یہ پوچھتی ہے آیا خدا کی الوہیت، ملکیت وقدرت ابھی اپنی جگہ باقی ہے یا نہیں اگر باقی ہے تو اہل بیتؑ کے نہ ماننے والی دیگر خلائق کی حاجتیں کیوں روا ہوتی ہیں۔

۲۔ اگر خدا نے اپنی الوہیت اور اس سے متعلق تمام مسائل کو اہل بیت کے حوالے کیا ہے اور اب اس کے پاس کچھ نہیں تو نعوذ باللہ خدا کی الوہیت ناقص ہوگئی ہے۔

بت اور بت پرستوں کے خلاف قرآن اور انبیاءؑ کا رویہ

بعض افراد جو دین ومذہب کو ذریعہ معاش بنائے ہوئے ہیں کو یہ آیت بہت پسند ہے جہاں خداوند متعال نے حضرت موسیٰ علیہ سلام سے خطاب کر کے فرمایا فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے نرمی سے بات کرو۔اور اسی طرح جہاں نبی اکرمؐ سے فرمایا گیا ان لوگوں کو سب وشتم مت کرو جو خدا کو چھوڑ کر بتوں کی پوجا کرتے ہیں وہ آیہ جس میں ان لوگوں سب وشتم کرنے سے منع کیا ہے

جو غیر خدا کی پرستش کرتے ہیں اسی کو بزعم اپنے سند بنا کر فی زمانہ جابر و منحرف، گمراہ اور دور جدید کے دیگر بتوں اور شعائر کے نام سے ہر روز دین میں خرافات داخل کرنے والوں کے خلاف آواز اٹھانے والوں پر مفسدین فی الارض کی تہمت لگاتے ہیں۔

ایسے لوگوں کیلئے ایک معقولہ جو اہل علم و دانش میں رائج ہے کہ تم نے ایک چیز کو یاد کیا اور باقی سب کو بھلا دیا صادق آتا ہے۔ انھوں نے نہیں دیکھا فرعون سے نرمی سے بات کرنے والے حضرت موسیٰ علیہ السلام سورۂ مبارکہ طٰہٰ ۹۷ کے تحت سامری کے خلاف تند و تیز اور انقلابی انداز میں اٹھتے ہیں:

﴿قال فاذهب فان لك في الحيوة ان تقول لامساس وان لك موعدًا لن تخلفه وانظر الىٰ الٰهك الذي ظلت عليه عاكفًا لنحرقنه﴾ ''موسیٰ نے کہا: دور ہو جا (تیری سزا یہ ہے کہ) تجھے زندگی بھر یہ کہتے رہنا ہوگا: مجھے ہاتھ نہ لگانا اور تیرے لئے ایک وقت مقرر ہے جو تجھ سے ٹلنے والا نہیں ہے اور تو اپنے معبود کو دیکھ کر جس (کی پوجا) میں تو منہمک ہے ہم اسے ضرور جلا ڈالیں گے اور پھر اس (کی راکھ) کو اڑا کر دریا میں ضرور بکھیر دیں گے۔''

اسی طرح جو موقف آپ نے بت خانے میں اٹھایا' یا جو عمل پیغمبر اکرمؐ نے فتح مکہ کے موقع پر تمام مشرکین کی موجودگی میں انجام دیا یعنی اپنے عصاء مبارک سے سارے بتوں کو پاش پاش کیا یہ سب کچھ ان دین فروشوں کی نظروں سے اوجھل ہے اسی طرح ضرب کلیم کا ایک نمونہ جو بت پرستوں کے خلاف ہے اسکا نظارہ نہیں کیا حضرت موسیٰ علیہ سلام نے بت پرست سامری سے کہا اب تم یہاں سے نکل جاؤ نہ تم کسی سے بات کر سکتے ہو اور نہ ہی تم سے کوئی بات کر سکتا ہے تم معاشرے میں ذلالت اور تنہائی کی زندگی گذارو چاہے تمھیں موت لاحق ہو جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ سلام نے سامری کے ساتھ جو رویہ اپنایا اسکی مثال تاریخ میں نہیں ملتی، اسکے بعد ضرب کلیم نے اس گوسالہ کو پاش

پاش کیا اور اسے جلایا اور پھر اسکی راکھ کو دریا میں پھینک دیا۔

☆ شرک و بت پرستی کو قرآن کریم نے نا قابل بخشش عمل قرار دیا ہے۔

☆ بت پرستی کرنے والوں کو قرآن کریم نے نجس قرار دیا ہے۔

☆ بت پرستی کو قرآن کریم نے ظلم عظیم قرار دیا ہے۔

☆ ابراھیم خلیل نے بتوں کو پاش پاش کیا۔

☆ موسیٰ کلیم نے بتوں کو جلا کر ہوا میں اڑایا۔

☆ بت پرستوں اور بت سازوں کو موسیٰ کلیم نے نجس اور منحوس قرار دے کر اجتماع سے دور کیا۔

بت پرستوں نے دین توحید میں کن جملوں اور ثقافت سے نفوذ کیا یہ عمل اپنی جگہ حیرت انگیز ہے اگر ایسے کردار کے حامل افراد کو داد دینا جائز ہوتا تو ہم انھیں داد دیتے کہ وہ کیسے دین توحید کے پیروکاروں کے درمیان داخل ہوئے۔ انھوں نے جس انداز اور کلمات وثقافت سے بت پرستی کو فروغ دیا وہ درج ذیل ہیں۔ قارئین کرام ملاحظہ فرمائیں۔

☆ شرک اتنا آسان نہیں کہ فوراً ہی کوئی شرک اختیار کرلے۔

☆ برابر ایسا کرنا شرک ہے یہ وہابیوں کا عقیدہ ہے۔

☆ واسطہ دینے میں تو کوئی حرج نہیں۔

☆ ہمیں بت پرستی اور احترام میں فرق رکھنے کی ضرورت ہے۔

☆ شرک و بت پرستی کی آیات کے بارے میں گفتگو کرنے والے دشمن اہل بیت ہیں اور اپنے اس عمل سے اہل بیت کے فضائل کو روکنا چاہتے ہیں۔

☆ ہم تو اس عمل کو عین توحید سمجھتے ہیں۔

☆ شبیہ سازی میں کیا حرج ہے۔

☆ انکے خلاف بولنے سے ملت میں انتشار واختلاف پیدا ہوتا ہے جبکہ ایسا کرنا ایک بڑا جرم ہے

☆ عباء و عمامہ پوشوں کے دست مبارک سے گھوڑے کی لجام پکڑوانا، فلک بوس علم کی سنگ بنیاد رکھنا، جعلی ضریحوں کے سامنے زیارت امام پڑھنا۔

ان دروازوں اور کلمات سے یہ انتہائی آسانی سے اس عمل میں وارد ہوئے بلکہ انکا استقبال کیا گیا۔ لیکن دین وملت کے سرپرستوں نے باریک بینی اور عرق ریزی اور دور اندیشی سے انکے مقابل چشم پوشی، سکوت کو دین وملت کی عظیم ترین مصلحت قرار دیا ہے۔

بت اور بت پرستی کا نتیجہ:

۱۔ اصل اور حقیقت کو چھوڑ کر پست اور نقلی چیزوں سے وابستگی۔

۲۔ صاحب حیات اور متحرک حقائق کو چھوڑ کر جامد اور ساکت چیزوں میں تبدیل کرنا۔

۳۔ پہلے مرحلہ میں یاد ہانی اور یادگار کے واسطہ کے طور پر اپنانا اور بعد میں استقلال کی حیثیت دینا، جس طرح سابق زمانے میں لوگ بتوں سے اظہار عقیدت کی خاطر اپنی اولادوں کو ان بتوں کے بندے قرار دیتے تھے جس طرح آج کل ہمارے لوگ اپنی اولادوں کو کلب فلاں امام قرار دیتے ہیں پہلے تو یہ لقب ہمارے سمجھ میں نہیں آیا لیکن جب اس پر غور کیا تو واضح ہوا کہ یہ مسمی کے کردار کی عکاسی کرتا ہے کیونکہ کلب دوسروں کو گھروں میں آنے سے روکتا ہے یہ لوگ بھی سب وشتم کر کے لوگوں کو آئمہ کیطرف آنے سے روکتے ہیں۔اسی طرح پہلے زمانے میں علم امام حسینؑ کے پرچم کی شبیہ تھا لیکن اب یہ قوم کی پہچان اور قبر میں پوچھے جانے والے سوالوں میں اسکا شمار ہونے لگا ہے پہلے لوگ اسے اپنے ہاتھوں میں بلند کرتے تھے لیکن اب یہ زمین میں گاڑا جاتا ہے اور اس کے نیچے صندوق رکھ کر دولت جمع کی جاتی ہے۔

جھنڈے کو عربی زبان میں ’’رایۃ‘لوا‘‘ کے علاوہ علم بھی کہتے ہیں علم مادہ علم سے ہے علم کسی چیز کی شکل وصورت ذہن میں آنے کو کہتے ہیں یہ اپنی جگہ دو قسم کا ہے ایک اس کی اصل شکل وصورت ذہن میں آنا ہے جیسے زید‘ درخت‘ پتھر وغیرہ دوسرا کسی چیز کے علم ہونے سے دوسرے کی طرف ذہن منتقل

ہوتا ہے یعنی یہ ایک نشانی ہے جس سے دوسرے کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے یہاں علم سے مراد دوسری صورت ہے۔ جنگوں میں بلند جھنڈے علامت تھے تا کہ اس جھنڈے سے وابستہ افراد اپنے واپسی کیلئے اسے نشان قرار دیں لہٰذا یہ صرف ایک نشانی ہے عزداروں نے بھی جلوس میں عزاداروں کو جمع کرنے کیلئے یا کربلا کی جنگی منظر دکھانے کیلئے بطور نشان اسے استعمال کیا۔ اس وقت یہ علم تھا لیکن اب تو اس نے استقلالی ؟ ت اختیار کرلی، جو کچھ امام حسینؑ سے نہیں مانگ سکتے تھے اس سے مانگنا شروع کیا، وہ تواضع جو امام حسینؑ کے سامنے کرنا شرک تھا اس کے سامنے کی جاتی ہے۔ حسین اب بھی بندۂ خدا ہیں لیکن یہ پرچم اب ان عزاداروں کا خدا بنا ہوا ہے

۴۔ پہلے مرحلے میں اجتماعی اور عمومی حیثیت دینا بعد میں فردی گروہی اور خاص حیثیت دینا۔

کسی چیز کی نقل کو اصل کا مقام دینے کو بت پرستی کہتے ہیں بت پرستی ایک سرسری اور سادہ سرگرمی نہیں بلکہ یہ خاص افکار ونظریات اور ثقافت کی حامل ہے بت پرستی کی ترویج کیلئے ایسے افکار و نظریات کو فروغ دیا جاتا ہے تا کہ بت پرستی کو دوام حاصل ہو بت پرستی کو معاشرے میں فروغ دینے والوں کی مثال اس عورت کی مانند ہے جو اپنے بچے کی پشت پر تھپکی دیتے ہوئے ترنم کے ساتھ اسے سلانے کی کوشش کرتی ہے تا کہ اسکے بعد وہ آرام سے اپنا کام کر سکے۔ اسی طرح دنیائے استعمار نے اقوام وملل کو خواب غفلت میں رکھنے کیلئے بہت سی بے ہودہ سیاسی وثقافتی سرگرمیوں کو معاشرے میں رواج دیا ہے تا کہ وہ آرام سے انکا استحصال کر سکیں جیسے مختلف قسم کی بین الاقوامی کھیلیں' سیف گیمز کرکٹ اور دیگر میچوں کی سرگرمیاں وغیرہ چنانچہ آپ نے مشاہدہ کیا ہوگا حالیہ بغداد میں جب امریکی جہاز آسمان سے بم باری کررہے تھے تو اسی وقت نیچے لوگوں کو فٹ بال کھیلتے ہوئے دکھایا گیا یہ لوگوں کو غفلت میں رکھنے کی ایک مثال ہے۔ اسی طرح افغانستان میں قبضہ کرتے وقت ہمارے ملک میں سیف گیمز کی تیاریوں اور انعامات کی قرعہ اندازیوں میں لوگوں کی توجہ کو مصروف رکھا گیا یا ڈیم بنانے کا شوشہ چھوڑ دیا گیا لہٰذا اپوزیشن بھی بخوبی جانتی ہے لیکن مزاحمتی سرگرمیاں شروع کرتی

ہے کیونکہ ان دونوں کے اھد اف ایک ہی ہیں

شبیہ سازی:

اس وقت مسلمانوں میں خاص طور پر شیعوں میں شبیہ سازی دین کا ایک رکن اور مذہبی نشان بنی ہوئی ہے۔ شبیہ تشبیہ سے ماخوذ ہے جب دو مختلف چیزیں چند لحاظ سے آپس میں مشابہت رکھتی ہوں اس وقت صفت سے شباہت رکھنے پر بطور نمونہ پیش کرنے کو تشبیہ کہتے ہیں تشبیہ کا مقصد موجود چیز سے غائب چیز کی یاددہانی کرانا ہوتا ہے یعنی کسی چیز کی اس جیسی چیز سے تعریف کرنے کو تشبیہ کہتے ہیں اور اس عمل کو شبیہ سازی کہتے ہیں۔

تشبیہ کے چار ارکان ہیں:

۱۔ مشبہ یعنی تشبیہ دینے والی چیز ۔۲۔ مشبہ بہ جس چیز سے تشبیہ دی جائے۔

۳۔ آلات تشبیہ جس کے ذریعے تشبیہ دی جائے ۔۴۔ وجہ تشبیہ دونوں میں شباہت کے سبب کا بیان کرنا۔

جس موجود چیز کی کسی غائب چیز سے تعریف وشناسائی کرنا چاہتے ہیں اس موجود چیز کو مشبہ اور غائب کو مشبہ بہ کہتے ہیں۔

وہ کلمہ جو تشبیہ دینے کے لیے استعمال ہوتا ہے اسے آداب تشبیہ کہتے ہیں اور جس صفت کیوجہ سے موجود و غائب دونوں کو ایک دوسرے کی مانند سمجھا جاتا ہے اسے وجہ شبہ کہتے ہیں۔

ارکان تشبیہ واضح ہونے کے بعد اگلا مرحلہ اہداف تشبیہ یعنی شباہت دینے کا مقصد ہے شباہت دینے کا مقصد مخاطب کو مشبہ یا مشبہ بہ کے بارے میں آگاہ کرنا ہے یا اس سے مشبہ کے حکم کو ثابت کرنا ہے بطور مثال زید میدان جنگ میں دشمن پر ٹوٹ پڑنے میں شیر جیسا ہے۔ یہاں زید کو شجاع ثابت کرنے کے لیے شیر جیسا کہنے کا مطلب یہ ہے وہ میدان جنگ میں حملہ آور ہونے اور جرائت

دکھانے میں شیر جیسا ہے یعنی وہ بھی اپنے مدمقابل پر اس طرح حملہ آور ہوتا ہے جس طرح شیر غصے اور غیض وغضب سے شکار کرنے والے حیوانوں پر ٹوٹ پڑتا ہے اس شباہت کے بارے میں علماء کا کہنا ہے زید کا صرف اپنے مدمقابل پر ٹوٹ پڑنے میں شیر کی مانند دکھانا اس کی تعریف نہیں بلکہ اسکا نقص وعیب گنا جائے گا۔

ارکان شباہت واضح ہونے کے بعد اگلا مرحلہ تشبیہ کے اہداف ومقاصد آثار ونتائج اور احکام کا مرتب کرنا ہے۔

شبیہ سازی جیسے عمل غیر منصفانہ طور پر اختیار کر کے کئی جہات اور زاویوں سے اس سے دین ومذہب کے روشن وتابناک چہرے کو مسخ کیا گیا ہے یہاں ہم اس سلسلہ میں چند زاویوں سے پردہ اٹھائیں گے۔

کسی چیز کو شعائر قرار دینے کے لئے شبیہ سازی:

قرآن وسنت کے مطابق شبیہ سازی کلی طور پر ہمیشہ حق تک رسائی کا وسیلہ نہیں ہے بلکہ اکثر وبیشتر اس کا انجام ہلاکت وگمراہی اور جہنم ہے شباہت ہمیشہ غلط اور غیر حقیقت کی نشاندہی کرتی ہے:

﴿ان البقر تشبه علینا وانا ان شاء الله لمهتدون﴾ ''ہمیں اس کی تعین میں اشتباہ ہوگیا ہے اللہ نے چاہا تو ہم اس کا پتہ پالیں گے'' (بقرہ/۷۰) ﴿تشابهت قلوبهم﴾ ''ان کے دل ایک جیسے ہوگئے ہیں'' (بقرہ/۱۱۸) ﴿وما قتلوه وما صلبوه ولکن شبه لهم﴾ ''انہوں نے نہ انھیں قتل کیا اور نہ سولی چڑھایا بلکہ دوسرے کو ان کے لئے شبیہ بنا دیا گیا'' (نساء/۱۵۷) ﴿فاما الذین فی قلوبهم زیغ فیتبعون ماتشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله﴾ ''اب جن کے دلوں میں کجی ہے وہ انھیں متشابہات کے پیچھے لگ جاتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کریں اور من مانی تاویلیں کریں'' (آلعمران/۷)

[یااشباہ الرجال ولارجال!حلوم الاطفال،وعقول ربات الحجال] ''اے مردوں کی شکل وصورت والواورواقعاً نامردو!تمہاری فکریں بچوں جیسی اور تمہاری عقلیں حجلہ نشین عورتوں جیسی ہیں'' نہج البلاغہ (خطبہ/۲۷)[وانماسمیت الشبهة شبهةً لانهاتشبی الحق] ''یقیناً شبہ کوشبہ اسی لیے کہاجاتا ہے کہ وہ حق سے مشابہ ہوتا ہے'' (خطبہ/۳۸)[تعالی الله عمایقوله المشبهون] ''وہ مخلوقات سے تشبیہ دینے والے'' (خطبہ/۴۹)[اذشبهوك باصنامهم] ''انھوں نے تجھے اپنے اصنام سے تشبیہ دی ہے'' (خطبہ/۹۱)[ان الفتن اذااقبلت شبهت] ''یادرکھو فتنے جب آتے ہیں تو لوگوں کو شبہات میں ڈال دیتے ہیں'' (خطبہ/۹۳)[واخذهامن مصرحاتهاو مشتبهاتها] ''کبھی واضح راستوں سے حاصل کیااور کبھی مشتبہ طریقوں سے'' (خطبہ/۱۰۹)[متشابهة (متسابقة)اموره] ''اس کے تمام معاملات ایک جیسے'' (خطبہ/۱۵۷)[فان شبهته بماانبتت الارض] ''اوراگرانھیں زمین کے نباتات سے تشبیہ دیناچاہو گے'' (خطبہ/۱۶۵)

[وان المبتدعات المشتبهات هن المهلكات الاماحفظ (عصم)الله منها] ''اورنئی نئی بدعتیں اورنئے نئے شبہات ہی ہلاک کرنے والے ہیں'' (خطبہ/۱۶۹)[اقرب اشتباه الامثال!تالموا امرهم فی حال تشتتهم وتفرقهم،لیالی کانت الاکاسرة والقیاصرة اربابالهم،یحتازونهم عن ریف الافاق ،وبحرالعراق ،وخضرة الدنیاءالیٰ منابت (مهات)الشیح،ومهافی الریح......] ''دیکھوان کے انتشارو افتراق کے دور میں ان کا کیاعالم ہے کہ قیصرو کسریٰ ان کے ارباب بن گئے تھے اورانھیں اطراف عالم کے سبزہ زاروں ،عراق کے دریاؤں اورشادابیوں سے نکال کرخاردارجھاڑیوں اورآندھیوں کی بے روک گذرگاہوں اورمعیشت کی

دشوارگذار منزلوں تک پہنچا کر اس عالم میں چھوڑ دیا تھا کہ وہ فقیر و نادار، اونٹوں کی پشت پر چلنے والے اور بادلوں کے خیموں میں قیام کرنے والے ہوگئے تھے گھربار کے اعتبار سے تمام قوموں سے زیادہ ذلیل اور جگہ کے اعتبار سے سب سے زیادہ خشک سالیوں کا شکار تھے نہ انکی آواز تھی جن کی پناہ لے کر اپنا تحفظ کرسکیں اور نہ کوئی الفت کا سایہ تھا جس کی طاقت پر بھروسہ کرسکیں۔ حالات مضطرب، طاقتیں منتشر، کثرت میں انتشار بلائیں سخت۔ جہالت تہ بہ تہ۔ زندہ درگور بیٹیاں۔ پتھر پرستش کے قابل ،رشتہ داریاں ٹوٹی ہوئی اور چاروں طرف سے حملوں کی یلغار۔!'' (خطبہ/۱۹۲)[یقولون فیشبهون ویصفون فیموهون] ''جب بات کرتے ہیں تو مشتبہ قسم کی اور جب تعریف کرتے ہیں تو باطل کو حق کا رنگ دے کر'' (خطبہ/۱۹۴)[والمحکم والمتشابه،فوضع کل شیء موضعه] ''خاص و عام اور محکم و متشابہ کو بھی پہچانتا ہے اور اس کے مطابق عمل بھی کرتا ہے'' (خطبہ/۲۱۰)[غیرانه بك شبیه] ''تم بالکل یہی شخص نہیں ہو لیکن اسی کے جیسے ہو'' (کلام/۷۳)[واوقفهم فی الشبهات] ''شبہات میں توقف کرنے والے ہوں اور دلیلوں کو سب سے زیادہ اختیار کرنے والے ہوں'' (کلام/۵۳)[فان الجاهل المتعلم شبیه بالعالم] ''جاہل بھی اگر سیکھنا چاہے تو وہ عالم جیسا ہے'' (ق/۳۲۰)[فانه قل من تشبه بقوم الا اوشك ان یکون منهم] ''بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی قوم کی شباہت اختیار کرے اور ان میں سے نہ ہوجائے'' (ق /۲۰۷)[فما اشتبه علیك علمه فالفظه] ''اور اگر اس کی حقیقت مشتبہ ہو تو اسے پھینک دیا کرو'' کتب/ ۴۵)[ومحکمة و متشابهه] ''محکم و متشابہ سب کو واضح کردیا ہے'' (خطبہ/۱)

شبیہ سازی اپنی مادہ وصورت، غرض وغایت اور دلیل و برہان میں بت سازی سے چنداں فرق

نہیں رکھتی۔

۱۔ ہم ان بتوں اور شبیہوں کے ذریعے خدا سے قرب حاصل کرنا چاہتے ہیں جبکہ اگر حقائق کو مدنظر رکھا جائے تو واضح ہوگا یہ بت ہر قسم کی سماعت و بصارت سے محروم ہیں یہ نفع ونقصان دینے سے قاصر ہیں کیونکہ جو نفع ونقصان پہنچانے کا حامل ہوتا ہے جب تک محتاج مند کی فریاد کو نہ سن سکے اور اس کے حالات کو نہ جان سکے اس وقت تک اس کی فریادرسی نہیں کرسکتا چہ جائیکہ وہ چیز جو اصلاً سماعت و بصارت سے محروم ہے وہ کسی کی مدد کرے۔

۲۔ بت سازی یا اس طرح کی کوئی بھی شکل وصورت بنانا یا کسی کو نمائندہ قرار دینا صرف اسی وقت معقول ہوتا ہے جب خداوند متعال کی طرف سے ایسا کرنے کی صریح الفاظ میں اجازت دی گئی ہو اللہ تبارک تعالی نے قرآن کریم کی آیات میں واضح طور پر بیان فرمایا ہے کسی کو بھی اس طرح کی چیزیں بنانے کی اجازت نہیں۔ شبیہ سازی و مجسمہ سازی کی تمام اشکال وصورتیں بھی ایسی ہی ہیں۔

۳۔ بت سازی کی تمام اشکال وصورتیں انسان کو اپنے مالک حقیقی و مولائے حقیقی سے دور کرتی ہیں، بلکہ اسے نسیان کے مرتبہ تک پہنچا دیتی ہیں۔ شبیہ سازی سے بھی ایسے ہی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔

۱۔ یہ چیزیں انسان کی فریاد وفغان اور اسکی حالت زار کو دیکھنے سننے اور سمجھنے سے محروم ہوتی ہیں۔ کیونکہ گھوڑا کبھی بھی آپ کی پریشانی اور حالت زار کو سمجھ نہیں سکتا۔

۲۔ ان کے پاس کسی قسم کے خزائن یا مسائل کا حل موجود نہیں، یہ اپنے ماننے والوں کو کچھ عنایت کرسکیں انکی ضروریات کو پورا کرسکیں۔

۳۔ آئمہ طاہرینؑ کی طرف سے اس قسم کے وسیلے بنانے کا کوئی حکم یا ھدایت صادر نہیں ہوا۔

۴۔ جس طرح بتوں نے بت پرستوں کو خدا سے جدا کیا اسی طرح ان چیزوں نے شیعوں کو آئمہ طاہرینؑ اور انکے احکام و تعلیمات سے دور کیا ہے۔

۵۔ بت پرستی کرنے والے اپنے اس عمل کی سند میں اپنے آباواجداد کی سیرت وسنت کو پیش کرتے تھے۔ اسی طرح آج شبیہ ساز بھی اپنی اس ظالمانہ حرکت کا جواز اپنے سابق آباواجداد کی سیرت وسنت کو پیش کرتے ہیں در حقیقت وہ اس سند کو پیش کرنے میں بھی جھوٹے ہیں کیونکہ وہ اپنی دنیوی زندگی کو انکی سیرت پر چلانے کیلئے تیار نہیں ہیں بہت پیچھے آباواجداد تو چھوڑیں یہ تو اپنے زندہ باپ کو فرسودہ اور دقیہ نوسی فکر کا حامل کہتے ہیں۔ لیکن دین کو ان کے نظریات پر چلانا چاہتے ہیں۔

شبیہ سازی یا ظلم روائی یا ظلم کی ترویج

علماء و محققین نے ظلم کے معنی کسی صاحب حق کو اس کے حق سے محروم کرنے سے کیے ہیں شبیہ بھی جیسا کہ واضح ہے نقل کو اصل اور مفروضہ کو حقیقت کی جگہ پر پیش کرنے کا عمل ہے۔ جس طرح خدا کی پرستش کی جگہ بتوں کی جگہ لینے پر عبادت خدا ذہنوں سے محو ہوئی۔ اسی طرح ان شبیہوں کی وجہ سے امام حسینؑ اور انکے مقدس قیام کے حقیقی مفاہیم اور اسکے اھداف و مقاصد کو پس پشت ڈال کر گھوڑوں، ضریحوں اور جھنڈوں نے جگہ لے لی ہے۔ آج عزاداروں کے قول و فعل اور اذھان پر یہی چیزیں چھائی ہوئی ہیں۔ امام حسین علیہ سلام پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا۔ وقت کے یزید نے اس وقت امت کو وجود حسین سے محروم کیا اور عصر حاضر کے یزید نواز اور انکے ہم خیالوں نے امام کے اھداف و مقاصد کو ذھنوں سے مٹا کر ان چیزوں کو انکی جگہ پر رکھا ہے قیام امام حسین کے اھداف و مقاصد پر تحقیق کرنے والے اس پر قلم و بیان صرف کرنے والے دین حسین کی ترویج و اشاعت کرنے والے علماء و محققین، فرزدق و کمیت جیسے شاعر بن کر آپکی مظلومیت کو مرثیوں میں پیش کرنے والے مخلص سمجھدار شعراء فقر و فاقہ اور محرومیت کی زندگی گذار رہے ہیں اور ان شبیہوں کو اٹھانے والے کروڑ وپتی بن چکے ہیں۔

اس سلسلہ میں فتویٰ کی سند پیش کرنے والے مقلد و مرجع دونوں کو چاہیے وہ جائز و ناجائز پر مہر لگانے کی بجائے دس بیس صفحات پر مشتمل قرآن وسنت اور سیرت معصومین کی تحریر پیش کریں۔ تاہم مسلمانوں کی کثیر رقم کس کے پاس جاتی ہے اور کس مصرف پر خرچ ہوتی ہے معلوم نہیں ہے اسے صرف فعل جائز پر خرچ کرنے کا اصرار کرنا بذات خود ایک ناروا ظلم ہے۔

ا۔ گھوڑے کو صرف اس منظر کی یاد کے لیے تشبیہ دینا کہ امام حسینؑ اس سواری سے زمین پر گرے اور یہ سواری امام حسینؑ کے بغیر خیام کی طرف آئی تو اہل بیتؑ کے لیے یہ منظر انتہائی دردناک اور مصیبت آور تھا۔ اس درد انگیز منظر کو دکھانا چاہیں تو اتنا ہی دکھا سکتے ہیں لیکن مفاد پرستوں نے اتنی تشبیہ پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ اگلے مراحل میں انہوں نے دین وملت کے بہت سے مقدسات ومقدرات کو بھی پامال کیا۔

جعلی ضریحیں:

عرصہ دس سال سے یہاں جعلی ضریحوں کا سلسلہ شروع ہے اور ان کے اردگرد دن رات بے حجاب خواتین اور مرد حضرات مخلوط طریقے سے گردش کرتے رہتے ہیں، وہاں کھڑے ہو کر ضریحوں سے مخاطب ہو کر راز و نیاز پیش کرتے ہیں ان اسے اپنی حاجتیں مانگتے ہیں، دولہا دلہن شادی کے موقع پر یہاں آکر سربسجود ہوتے ہیں کیا آپ بتائیں گے ان کے اندر کون ہیں اور کیا یہاں کوئی مقدس ہستی ہے یا کوئی امام یہاں تشریف فرما ہیں یا یہ جعلی وخود ساختہ ہیں اور محض جھوٹ وفریب پر مبنی ہیں کیا صادقین کے ساتھ ہونے کی نشانی یہی ہے کہ انسان جعلی ضریحوں کے گرد گردش کرے اور ان کے سامنے اپنی حاجات ومشکلات پیش کرے ان ضریحوں کے اندر جمع ہونے والی رقوم کہاں اور کس مد میں خرچ ہوتی ہیں کیا یہ اعلیٰ وارفع اہداف کے فروغ میں خرچ ہوتی ہیں یا مفاد پرستوں کی جیب میں جاتی ہیں یا نعوذ باللہ تخریب دین کی مد میں خرچ ہوتی ہیں۔ جس دین میں یتیم و دیوانہ لوگوں کے مال ودولت کے حفاظت کی ذمہ داری ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے اور جس دین نے اوقاف اور

مجہول المالک اموال کی حفظ ونگہداری کا ضامن مجتہدین اوران کے خاص اجازت یافتہ افراد کو مسئول وذمہ دارقرار دیا ہے کیا کسی وقت مجتہدین نے ان ضریحوں میں جمع ہونے والی رقوم اور یہ کس مد میں خرچ ہوتی ہیں ان کے بارے میں کوئی تحقیق کی ہے یا ان کی تمام تحقیقات صرف مال خمس تک محدود ہیں۔

۲۔ ایک گھوڑے اور حیوان کے نام پر مسلمانوں سے نذرونیاز جمع کرنا بذات خود ایک فعل غیر شرعی و حرام کا ارتکاب ہے۔

۳۔ ایک حیوان کے نام سے بے بہا مال ودولت جمع کرنا ملت کے ساتھ ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔

۴۔ یہ نذرونیاز اوراس طرح حاصل ہونے والا مال ودولت کس مد میں خرچ ہوتا ہے یہ اب تک ملت سے پوشیدہ ہے۔

۵۔ اگر یہ وہی سواری ہوتی جس پر امام حسین سوار ہوئے تھے تب بھی یہ کسی عام انسان سے افضل و اشرف اور ہر انسان کے لیے قابل تکریم واحترام نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ یہ حیوان ہر حال میں حیوان ہی رہے گا کوئی نبی یا امامؑ کسی انسان سے یہ نہیں کہہ سکتے تم سے میری سواری یا میرا یہ حیوان افضل واشرف ہے جب تک کسی انسان نے صفت انسانیت سے گر کر صفت حیوانی کو نہ اپنا لیا ہو۔

۶۔ اس گھوڑے کو اُس گھوڑے کی شبیہ نہیں بنایا جاتا ہے پر امام حسینؑ سوار ہوئے تھے بلکہ اسے مولا کہتے ہیں اس سے راز ونیاز اور حاجات مانگتے ہیں امام حسینؑ کے دور میں کوئی بھی انسان امام حسینؑ کی سواری سے حاجت نہیں مانگتا تھا چاہے وہ دیوانہ ہی کیوں نہ ہو وہ لوگ امامؑ سے بات کرتے تھے نہ کہ حیوان سے۔

۷۔ لکڑی، پتھر اور پیتل وغیرہ کے گھوڑے بنا کر بت خانوں میں سجانے کا سلسلہ ملک کے گوشہ وکنار میں شروع ہو چکا ہے ہر ایک نے اپنے اپنے گھروں میں اس گھوڑے کے بت بنا

رکھے ہیں۔

۸۔ پوری قوم وملت کا فرض ہے امام کی سواری کے نام سے گھوڑا پرستوں سے سوال کریں کہ وہ اس عمل سے حاصل ہونے والی رقوم کو کس مد میں خرچ کرتے ہیں۔

۹۔ اگر کوئی ہندو، مسیحی یا یہودی وغیرہ اہل تشیع سے پوچھے سابق زمانے میں گاو پرستی اور گھوڑا پرستی کرنے والوں اور آپ کے مذہب کے پیروکاروں کو جو لگاؤ اس گھوڑے سے ہے ان دونوں میں کیا فرق ہے تو کیا وہ علماء اور وہ مجتہد جو اس عمل گھوڑا پرستی کو مستحسن قرار دیتے ہیں اپنے موقف کے ثبوت میں کسی آیت قرآن، روایت معصومین اور سیرت انبیاء پر مشتمل چند صفحات سے استدلال پیش کرسکیں گے یا اس گھوڑے کے بارے میں ان کی فکر خود ساختہ ہے اور یہ ان کی ذاتی تشخیص اور استحسان وقبح آرائی سے ماخوذ ہے۔

ستارہ پرستان:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حیات طیبہ میں دوبار آسمانی ستاروں کا ذکر آیا ہے۔ جس سے بعض نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ابراہیمؑ ابتداء میں ستارہ پرست تھے پہلی دفعہ جب آپؑ سے قوم نے میلے میں جانے کیلئے کہا تو آپؑ نے ستاروں کی طرف دیکھ کر فرمایا میں مریض ہوں۔

دوسری مرتبہ آپؑ نے رات کو ستاروں کو دیکھا تو فرمایا یہ میرا رب ہے۔ ہم اسی مناسبت سے حضرت ابراہیم خلیل قہرمانِ توحید سے دفاع کریں گے اسی طرح ہم مسلمان اس وقت ایک قسم کی ستارہ پرستی میں مبتلا ہیں حتیٰ کہ وہ افراد جو دینِ مبینِ اسلام کے خود کو داعی اور مروج کہتے ہیں وہ بھی لوگوں کو ستاروں کی گردش کے حساب سے سعادت اور نحوستِ زندگی کے بارے مین اپنی خام خیالی میں راہنمائی کرتے ہیں لہٰذا مناسب سمجھتے ہیں ستاروں کا ہماری زندگی میں کیا کردار ہے اور ایسا عقیدہ رکھنے والوں کے بارے میں قرآن وسنت اور سیرت معصومین کیا فرماتے ہیں اور فقہاءِ اسلام کیا فتویٰ دیتے ہیں۔

علماءِ ادیان و مذاہب نے ستاروں کی پرستش کرنے والوں کو صابئین کہا ہے:

صابئ مادہ صبا سے ہے ایک دن چھوڑ کر دوسرے دن میں داخل ہونے کو صبا کہتے ہیں۔ کتب قاموس ولغت میں صابئین ستارہ پرستوں کو کہا گیا ہے ان کی اصل برگشت کے بارے میں علمائے ادیان و مذاہب میں اختلاف ہے۔ بعض کا کہنا ہے یہ دین شیث وادریس پر باقی ہیں۔ جبکہ بعض نے کہا ہے کہ صابع فرزند متوشلہ بن ادریس سے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ صابع بن ماری ہے جو حضرت ابراھیم علیہ السلام کے دور میں گزرے ہیں۔ تاریخ بت وبت پرستی کے تسلسل اور اقسام میں سے ایک واضح اور نمایاں بت پرستی، ستارہ پرستی کے نام سے معروف ہے شہسوار بت شکن حضرت ابراھیم خلیل اللہ کو بھی جسکا سامنا تھا ان آیات میں انھیں صابئ کہا گیا ہے۔

غرض صابئین سات بڑے ستاروں کے ساتھ بارہ برجوں کی تعظیم و تقدیس کرتے ہیں۔ انکی صورتیں بناتے ہیں اور انکے لئے قربانی دیتے ہیں۔ قرآن کریم میں سورۂ بقرہ ۶۲، مائدہ ۶۹ میں ستارہ پرستوں کا ذکر موجود ہے:

﴿ان الذین امنو والذین ھادوا و النصٰری و الصابئین من امن باللہ والیوم الاٰخر﴾ ''بے شک مسلمان، یہودی، نصاریٰ اور صابئین میں سے جو کوئی اللہ اور آخرت پر ایمان لے آئے'' (بقرہ/۶۲) ﴿ان الذین امنوا والذین ھادوا والصابئون والنصٰری من امن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحاً فلا خوف علیھم ولاھم یحزنون﴾

''جو لوگ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل انجام دیتے ہیں وہ خواہ مسلمان، یہودی، صابی یا عیسائی انھیں (روز قیامت) نہ کوئی خوف ہوگا نہ ہی وہ محزون ہونگے'' (مائدہ/۶۹)

چنانچہ سورۂ واقعہ آیت ۸۵ اور ۷۶ میں خداوند عالم نے انہی ستاروں کی قسم کھائی ہے:

﴿فلا اقسم مواقع النجوم۔ وانه لقسم لو تعلمون عظیم﴾ ''میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے مقامات کی اور اگر تم سمجھو تو یہ یقیناً بہت بڑی قسم ہے''۔

منطقہ حران شمال مغربی عراق میں واقع ہے جو آج کل ترکیہ میں ہے، اسے صابئین کا مرکز گنا جاتا ہے یہاں پر انہوں نے مدرسہ فلکیات قائم کیا ہے یہیں سے علم ستارہ شناسی دیگر اقوام وملل کی طرف منتقل ہوا ہے ستارہ پرستوں کا عقیدہ ہے کچھ روحانی طاقتیں ہیں جو ہمیں عظمت و بزرگی بخشتی ہیں اور یہ ان مقامات سے نکلتی ہیں جہاں تاریکی نہ ہو اور یہ مقامات ستارے ہیں منطقہ حران میں بت او ربت خانے ہیں شہرستانی لکھتے ہیں صابئین نے جن ستاروں کے مجسمے بنائے ہیں وہ مندرجہ ذیل ہیں:

زحل، مشتری، مریخ، سورج، چاند، زہرہ، عطارد کے متعلق صابئین کا خیال ہے یہ تقرب رب ارباب اور مسبب الاسباب سے قرب کا سبب بنتے ہیں شہرستانی لکھتے ہیں ستارہ پرست حضرت ابراہیمؑ کے دور میں یا ان سے پہلے موجود تھے چنانچہ انہوں نے سورۂ انعام کی آیت نمبر ۷۴ سے استدلال کیا ہے ستارہ پرست مختلف مقامات پر منتشر تھے اور عربوں میں ستارہ پرستی انہیں صابئین اور کلدانیین سے آئی ہے یہاں سے عربوں نے ہر ستارے کی ایک صفت بیان کی ہے مثلاً کہتے ہیں ثریا ثرا سے بنا ہے اور یہ ستارہ بارش ہے اور اسے اس لیے ثریا کہتے ہیں کہ اسکی بارش ہماری ثروت و دولت میں کثرت کا سبب بنتی ہے مذہب صابئی کے افراد جن ستاروں کی پرستش کرتے ہیں ان میں سے ایک ستارہ زہرہ ہے ان کے نزدیک اس کا بہت مقام ہے اس کے لئے انہوں نے بہت سے نام متعارف کروائے ہیں چنانچہ ہندوستان میں اس کا الگ نام ہے اور ایران میں الگ۔ فینوکین، روم و یونان اور عربوں نے اسے زہرہ کا نام دیا ہے انکا کہنا ہے اسکی پرستش کرنے والے انسان تمام منکرات اور برائیوں کو مباح سمجھتے ہیں ستارہ پرست عریان حالت میں حسین و جمیل عورتوں کو اکٹھا کرتے ہیں اور اسے اس ستارے سے نسبت دیتے ہیں ان کا کہنا ہے مشتری کے بعد

سعادت اور خوشیوں کی برگشت اسی کی طرف ہوتی ہے۔

طبقات صابئ:

صابئین لفظ بقرہ آیت ۶۲، مائدہ ۶۹، حج ۱۷ میں آیا ہے۔ علماء کا کہنا ہے صابئین صابہ سے بنایا ہے صابہ کے معانی میل کے ہیں یعنی ایک دین کو چھوڑ کو دوسرے دین کو اپنانے والوں کو صابع کہتے تھے صابع اسم فعل صابہ ہے۔ بعض نے کہا ہے صابہ مادہ صبحت تیرنے سے لیا ہے یہ مذہب یہود و نصاریٰ سے نکلنے والی ایک شاخ ہیں انھیں صابئین کہتے تھے گزشتہ زمانہ کے ساتھ س ص سے بدل گیا ہے بعض کا کہنا ہے صابئین شہر سبا کے رہنے والوں کا دین ہے یہ مادہ سبا سے ہے اہل تحقیق کا کہنا ہے صابئین دو گروہوں میں تقسیم ہیں ایک صابئین موحد جو یہودیت اور مسیحیت سے نکل کر ستارہ پرست بنے دوسرے صابئین شرک ان کا دین ستارہ پرستی پر مبنی ہے سورۂ مائدہ میں جن صابئین کا ذکر آیا ہے وہ صابئین موحد ہیں سورۂ حج میں جن کا ذکر آیا ہے وہ صابئین شرک ہیں بعض کا کہنا ہے صابئین اہل توحید اور اہل شرک کے درمیان سے نکلنے والے مذہب کا نام ہے یہ لوگ تین گرہوں میں تقسیم ہیں:

۱۔ ضرورت وجود کواکب کے قائل ہیں ان کی نظر میں سورج سب سے بڑا خدا ہے

۲۔ دوسرے گروہ کا کہنا ہے ستارے خدا کا مظہر ہیں۔

۳۔ تیسرے گروہ کا کہنا ہے ستارے حکم خدا سے کائنات میں تصرف کرتے ہیں۔

صابئین کا کہنا ہے ستارے اس کائنات میں ارواح کے ذریعے سفر کرتے ہیں شاعرستانی لکھتے ہیں بعض صابئین ستاروں کی پرستش نہیں کرتے بلکہ یہ ستارے کا ایک بت بناتے ہیں اور اپنے بت خانے کی شکل وصورت اس ستارے کی شکل وصورت پر تیسری صدی تک صابئین کا مرکز حران میں تھی۔

ان ستاروں میں سے بعض کی بشر نے پرستش کی ہے اور قرآن کریم میں ان کا نام لیا ہے وہ یہ ہیں:

شعریٰ:

﴿وانه هورب الشعرٰی﴾ ''اور یہ کہ وہی شعریٰ کا رب ہے'' (نجم/۴۹)

یہ ایک روشن ستارہ ہے جو ثابت ستاروں میں سے ہے یہ گرمیوں میں جنوب میں دکھائی دیتا ہے۔اس کا حجم زمین کے برابر اور وزن سورج کے برابر ہے کتاب مجمع البیان میں ہے قوم خزاع ستارۂ شعریٰ کی پرستش کرتے تھے لہٰذا خداوند عالم نے اس کا ذکر کیا ہے، شعریٰ کے نام سے دو ستارے ہیں ایک شعریٰ یمانی اور دوسرا شعریٰ شامی لیکن اس آیت میں مراد شعریٰ یمانی ہے یہ کلمہ قرآن کریم میں صرف ایک ہی بار سورہ نجم کی آیت ۴۹ میں آیا ہے۔

طبرسی کہتے ہیں شعریٰ ایک ستارہ ہے جسکی دور جاہلیت عرب میں قبیلہ خزاع کے لوگ پرستش کرتے تھے چونکہ یہ ستارہ دیگر ستاروں کی نسبت زیادہ درخشاں اور نورانی تھا اس لیے قدیم زمانے میں بہت سے قبائل اسکی پرستش کرتے تھے۔دو گروہوں نے متضاد نکتہ نظر کے تحت اس کی پرستش کی۔اہل مصر اس ستارے کے طلوع ہونے کو باعث برکت اور فراوانی نعمت سمجھتے تھے اور اپنے مستقبل کیلئے پر امید تصور کرتے تھے لہٰذا وہ بطور شکرانہ اس کی پرستش کرتے تھے ان کے بالمقابل اہل بابل ستارہ شعریٰ کے طلوع کو خشک سالی وقحط سالی کا سبب خیال کرتے تھے اور اس کے خوف اور ڈر سے اس کی پرستش کرتے تھے۔اس ستارے کی نورانیت کی وجہ دیگر ستاروں کی نسبت سورج سے زیادہ نزدیک ہوتا ہے یہ سورج سے سات آٹھ سال سنہ نوری (نوری سال) کے فاصلے پر واقع ہے جبکہ سورج اور زمین کا درمیانی فاصلہ ۸۰۸ سال سنہ نوری (نوری سال) کا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اور علم نجوم:

جب اہل بابل اپنے سالانہ میلے میں شرکت کیلئے جا رہے تھے اس دن حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کی کی طرف دیکھ کر کہا میں مریض ہوں بعض علماء تاریخ اور مفسرین نے کہا ہے اس وقت

شہر بابل میں علمِ نجوم کو بہت فروغ حاصل تھا وہ اپنی سعادتوں کا حصول اور برائیوں سے بچاؤ کو علم نجوم کے ذریعے حاصل کرتے تھے۔

جب بابل سے ہجرت کر کے منطقۂ حران پہنچے تو وہاں اُنھیں ستارہ پرستوں کا سامنا ہوا چنانچہ آپ نے ان سے ستارہ پرستی کی ردّ میں سوالیہ فقرے کے طور پر سوال کیا:

﴿فلما جن علیه الیل راکو کبا﴾ ''جب رات اس پر طاری ہوئی تو اس نے ایک ستارا دیکھا'' (انعام/۷۶)

جسطرح آج کے بعض نام نہاد ماہرینِ نجوم کا دعویٰ ہے۔ اسی طرح دسترخوانِ دین و مذہب کے نمک خوار بھی لوگوں کو نیک دن اور نحس دنوں کی نشاندہی کر کے اپنی گزر اوقات اسی علمِ نجوم سے کرتے ہیں یہیں سے ہم نے مناسب سمجھا کہ علمِ نجوم کی حقیقت اور اسکے بارے میں قرآن وسنت کے نقطۂ نظر کو اسی مناسبت سے یہاں بیان کریں آیئے دیکھتے ہیں اسے ہم چند کلمات کے ضمن میں بیان کریں گے:

ا۔ نجوم: نجوم نجم کی جمع ہے کلمہ نجم قرآنِ کریم میں مفرد کی صورت میں تین بار اور جمع کی صورت میں نو بار تکرار ہوا ہے۔

نجم طلوع وظہور کو کہتے ہیں یہیں سے کہتے ہیں ''نجم القرن'' یعنی سینگ نکلا ''نجم النبات'' سبزی اُگی۔ اسی مناسبت سے ان ستاروں کو نجوم کہتے ہیں جو لوگوں کے نظروں میں آتا ہے۔

نجم کی جمع نجوم ہے نجم جیسا کہ سورۂ نحل میں آیا ہے علامات، ہدایت کیلئے استعمال ہوتا ہے سورۂ رحمن/۶ میں اس نباتات کو کہا گیا ہے جو شجر کے مقابلے میں آئی ہے:

﴿والنجم والشجر یسجدان﴾ ''ستارے یا درخت یا ساق دار و غیر ساق دار اسی کا سجدہ کرر ہے ہیں''

کیونکہ وہ بھی زمین سے اُگتی ہے لہٰذا وہ سبزی جس کی کوئی جڑ نہ ہو اسے نجم کہتے ہیں اور جس کی جڑ ہو اسے

نجم کہتے ہیں خداوند عالم نے سورہ نجم سے قسم کھائی ہے:

﴿والنجم اذا ھوی﴾ ''قسم ہے ستارے کی جب وہ غروب کرے''

سورہ اعراف ۵۴ میں خداوند عالم نے سورج اور چاند ستارے سب اسی ذات کیلئے مسخر کہا ہے:

﴿والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہ﴾ ''اور سورج اور چاند اور ستارے سب اس کے تابع فرمان ہیں''

کلمہ نجم جمع کی صورت میں نو (۹) بار قرآن میں تکرار ہوا ہے قرآن میں نجم اور نجوم سے مراد وہ ستارے مراد ہیں جو ثابت اور یکجا رہتے ہیں اور جو گردش میں ہیں انھیں کوکب کہتے ہیں۔

کوکب اس ستارے کو کہتے ہیں جو روشن وصاف نظر آتا ہے اسکا نور کسی اور سے ماخوذ نہیں ہے۔ کوکب مادہ کب سے لیا ہے کواکب جمع ہے کوکب کی، جس سے کوئی چیز باہر نہ ہو ریت کے ٹیلے کو کباب' کہتے ہیں' کوکب کسی ذخیرہ یا جماعت کو کہتے ہیں' پانی کی جمع کو لبکہ' گھوڑوں کی جمع کو بھی کوکب کہتے ہیں۔ لفظ کوکب عبری' سریانی اور ارامیہ سے ماخوذ ہیں کب بمعنی تجمع کو کہتے ہیں بعض ستاروں کو ہم نہیں دیکھ سکتے کیونکہ یا تو وہ نور نہیں رکھتے یا انکا نور ہم تک نہیں پہنچتا۔ لیکن یہاں اس سے مراد وہ ستارے ہیں جنھیں خداوند متعال نے اس وسیع فضاء میں تخلیق کیا ہے۔ نجم اور کوکب میں فرق یہ ہے کہ کوکب اپنے نور اور دیگر حوالے سے بزرگ ہے جبکہ ستارہ صرف ظاہر کو کہتے ہیں۔

کوکب کے بارے میں آیات:

﴿کانھا کوکب دری﴾ ''موتی کی طرح چمکتا ہوا تارا'' (نور/۳۵) ﴿واذا الکواکب انتثرت﴾ ''اور جب ستارے بکھر جائیں گے'' (انفطار/۲) ﴿انا زینا السماء الدنیا بزینۃ الکواکب﴾ ''ہم نے آسمان دنیا کو تاروں کی زینت سے آراستہ کیا'' (صافات/۶)

ستاروں کے مجموعے کو قرآن کریم میں بروج کہا ہے:

بروج ''برج کی جمع ہے جس کی جمع ابراج ہے اس کے دو مصدر ہے:

۱۔ البروز والظہور، عیان کے معنی میں آیا ہے یعنی عورت کا اپنی خوبیوں اور زینت کے اظہار کو بروج کہتے ہیں۔

۲۔ بروج یعنی پناہ گاہ۔ اس کا جمع بروج سماء۔ بروج کا معنی قلعے یہ محکم پناہ گاہوں کے لیے استعمال ہوتا ہے:

﴿اینما تکونوا یدرککم الموت ولو کنتم فی بروج مشیدۃ﴾ ''(تمہیں موت کا خوف ہے) تم جہاں کہیں بھی ہو خواہ تم مضبوط قلعوں میں بند رہو'' (نساء/۷۸)

تحقیق یہ ہے کہ دونوں کا معنی ایک ہے ظہور، جذب، کشش کے معنوں میں آیا ہے ہر وہ چیز جو ظاہر اور بلندی پر ہو اسے برج کہتے ہیں یہی سے بلند منزلوں، قصر و کسریٰ کی عمارتوں کو بروج کہتے ہیں۔ وہ شکل وصورت کی حامل زینتوں سے آراستہ عورتیں جو اپنی حسن وجمال کو دوسروں کے لیے ظاہر کرتی ہیں انکے اس عمل کو بروج کہتے ہیں ہر وہ عورت جو اپنی حرکت وسکون سے نامحرموں کی نظروں کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور ان میں نفوذ واثر رکھنے اور ان پر حاوی ہونے کا سبب بنتی ہے قرآن نے انکے اس عمل کی مخالفت کی ہے:

﴿وقرن فی بیوتکن ولا تبرجن تبرج الجاهلیة الاولیٰ﴾

''اور اپنے گھروں میں جم کر بیٹھی رہو اور قدیم جاہلیت کی طرح اپنے آپ کو نمایاں کرتی نہ پھرو'' (احزاب/۳۳)

یہی سے وہ ستارے جو آسمان میں اپنے نور اور روشنائی دیکھتے ہیں اسے بروج کہتے ہیں:

﴿والسمآء ذات البروج﴾ ''قسم ہے برجوں والے آسمان کی'' (بروج/۱)

﴿ولقد جعلنا فی السمآء بروجًا وزینّٰها للنّٰظرین﴾ ''اور بتحقیق ہم نے آسمان میں نمایاں ستارے بنادیے اور دیکھنے والوں کیلئے انھیں زیبائی بخشی'' (حجر/۱۶)

اس آیت سے ظاہر ہوتا ہے بروج ان ستاروں کو کہتے ہیں جو دیکھنے والوں کے نظر میں ہیں۔

صاحب قاموس قرآن نے ''برج'' کے معنی ظاہر، آشکار اور واضح ہونے کے لئے ہیں۔
یہ کلمہ قرآن میں تین بار استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں جہاں بروج آیا ہے اس سے مراد ستارے ہیں یہ مندرجہ ذیل جگہ پر آیا ہے:

﴿تبرک الذی جعل فی السماء بروجًا و جعل فیھا سرٰجًا و قمرًا منیرًا﴾ ''بابرکت ہے وہ ذات جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور روشن چاند بنایا'' (فرقان/٦١) بروج/١، حجر/١٦،

ان آیات سے مراد بروج وہ ستارہ ہے جو آسمان میں ہیں اور اپنی نورانیت کی وجہ سے ان ستاروں کو بروج کہا گیا ہے یا ان ستاروں کے ذریعے آسمان کو زینت ملی ہے جیسا سورۂ حجر آیت ١٦ سے واضح ہے:

﴿ولقد جعلنا فی السماء بروجًا و زینھا للنظرین﴾ ''اور تحقیق ہم نے آسمان میں نمایاں ستارے بنا دیئے اور دیکھنے والوں کے لئے انھیں زیبائی بخشی''

ستاروں کے مجموعے کو قرآن کریم میں بروج کہا ہے جدید علم فلکیات میں اسے مجرہ کہتے ہیں ، مجرہ اس کائنات کی اکائی ہے جس میں اربوں مجرات ہیں ان مجرات میں سے صرف ایک مجرہ جو ہماری نظروں میں آتا ہے جسے مجرۂ درب تبانہ کہتے ہیں ہماری مجرے کی اکائی میں سے ایک ہمارا منظومۂ شمسی ہے منظومۂ شمسی کی اکائی میں سے ایک ہماری زمین ہے۔ زمین کی اکائی اس کے عناصر ہیں عناصر کی اکائی الیکٹران اور پروٹران بھی ان کی ہر ایک کی جائے وقوع ایک دوسرے سے فاصلے اور آثار و نتائج کے بارے میں تحقیق کرنے کے علم کو قدیم زمانے میں علم نجوم اور جدید دور میں علم فلکیات کہتے ہیں۔

٢۔ **علمِ نجوم :** ستاروں منازل مقامات اور اس سے مرتب ہونے والے آثار و نتائج میں غور و خوص کرنے کو علم نجوم کہتے ہیں یعنی جو اجرام علوی کو خاص آلات اور وسائل سے کشف کرتے

ہیں، وہ زمین سے کتنے فاصلہ پر ہیں اس ستارے کا حجم کتنا ہے اس میں استعمال ہونے والے آلات کو اسطرلاب کہتے ہیں:

اسطرلاب: آلہ کشفِ نجوم کو ''اسطرلابو'' کہتے ہیں جس کے معنی ستاروں کا آئینہ ہے بعض نے کہا ہے ''اسطر'' کا معنی تصنیف ہے ''لاب'' حرمس حکیم کے بیٹے کا نام ہے جس نے اس آلے کو بنایا ہے بعض نے کہا ہے جب لاب نے کاغذ پر ایک لکیر کھینچی تو حرمس حکیم نے پوچھا کہ یہ لکیر کس نے کھینچی ہے جواب ملا کہ لاب نے یہیں سے اسکا نام ''اسطرلاب'' ہوا۔

ستاروں کے ہماری زندگی پر اثرات

۱۔ ستارے آسمان کی زینت ہیں۔ بہت سے ستارے اپنی نورانیت شکل وصورت کے حوالے سے آسمان کو حسین وجمیل بناتے ہیں جسے دیکھ کر انسانوں کے اندر خوشی وراحت محسوس ہوتی ہے اور رات کی وحشت وتاریکی ذہنوں سے نکل جاتی ہے:

﴿انا زینّا السمآء الدنیا بزینۃ الکواکب﴾ ''ہم نے آسمان کو ستاروں کی زینت سے مزین کیا'' (صافات/۷)

۲۔ ہدایت انسان۔ یعنی ان ستاروں سے انسان کو سمت، وقت مہینے اور حسابوں کے لیے ہدایت ملتی ہے چنانچہ سابق زمانے میں صحرا' میدانوں' دریاوں میں کشتی میں سوار مسافر انہی ستاروں سے رہنمائی لیتے تھے جیسا کہ سورۂ مبارکہ انعام آیت نمبر ۹۷ میں آیا ہے:

﴿والشمس والقمر حسباناً﴾ ''سورج اور چاند کو حساب کا ذریعہ بنایا ہے'' اس سلسلے میں کچھ حقائق یہ ہے۔

ستاروں کے بارے میں خداوند متعال نے فرمایا ہم نے آسمان کو ستاروں سے مزین کیا ہے۔ ستاروں کی ایک تقسیم بندی ہے بعض ستارے ثابت وقائم ہیں یعنی اربوں سال گذر گئے لیکن یہ

دیکھنے والوں کو ایک جگہ پر ہی ملیں گے جیسے کوئی انسان ایک قدیم عمارت میں ایک عرصہ سے رہ رہا ہے اور اس کے چھت کو اپنی جگہ پر ہی دیکھتا ہے:

ستارے

ستاروں کے بارے میں تین حقیقتیں ملاحظہ فرمائیں۔ ایک ستارے ہیں جو صرف ایک جگہ پر ہی قائم رہتے ہیں اسے ہم مکان کے حوالے سے نشانی کے طور پر لیتے ہیں دوسرے وہ ستارے ہیں جو اپنے محور میں گردش کرتے ہیں اور چوبیس گھنٹوں میں اپنے مرکز کی طرف برگشت کرتے ہیں۔ تیسرے وہ دب اصغر ہیں جو ایک سوئی کی طرح آسمان پر نصب ہیں یہ کبھی غروب نہیں ہوتے۔ ان تین حقائق کی روشنی میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں آسمان پر ایک گھڑی جس کے مرکز میں ایک ستارہ ہے اور دو سوئیاں اسکے گرد گردش کر رہی ہیں یہاں سے ہی کہا جاتا ہے ستارے ہماری زمان و مکان دونوں حوالوں سے راہنمائی کرتے ہیں خداوند متعال نے سورہ واقعہ ۷۶ میں انکی قسم کھائی ہے یہ ستارے بشریت کے آغاز زندگی سے ابھی تک قائم ہیں اور بشر اپنے سفر و حضر دونوں میں ان سے استفادہ کر رہے ہیں حتی موجودہ دور میں ایجادات اور ترقی کے باوجود زمان و مکان کے حوالے سے انھیں سے راہنمائی لی جاتی ہے۔

۱۔ نجم قطبی: یعنی نجم وہ ثابت ستارہ ہے جو پورا سال اپنی جگہ پر باقی رہتا ہے۔ یہ انسانوں کی راہنمائی کے لیے ہے۔

۲۔ وہ ستارہ ہے جو قطب میں اپنے دائرے میں گردش میں رہتا ہے ہر چوبیس گھنٹے کے بعد اپنی جگہ پر آتا ہے۔

۳۔ نجم دب اصغر: دب اصغر نامی ستارے آسمانی گھنٹی کے طور پر پہچانا جاتا ہے جو کبھی غروب نہیں ہوتا جس طرح نجم دب اکبر غروب نہیں ہوتا ہے یہاں سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ آسمان

کے اس سفید صفحے پر ایک گھنٹی منسوب ہے جس کا مرکز نجم قطبی ہے اس کی دو سوئیاں ہیں جو گردش میں رہتی ہیں اس طرح ستارے ہمیں بیابان، سمندروں میں اور فضائی سفر اور تاریک رات میں زمان و مکان دونوں کی راہنمائی کرتے ہیں سورہ مبارکہ واقعہ آیت ۷۵ میں ان کی طرف اشارہ کرکے خدا نے قسم کھائی ہے:

﴿فلا اقسم بمواقع النجوم﴾ ''میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے مقامات کی''

جبکہ بعض ستارے تیزی سے گردش میں ہیں۔ انسان زمان و مکان سے کبھی بھی جدا نہیں ہوا اور نہ ہی ہوگا لہٰذا انسان زمان و مکان دونوں کے بارے میں محتاج ہدایت و رہبری ہے اور رہے گا لہٰذا خداوند متعال نے فرمایا:

﴿وسخر لکم الیل والنہار والشمس والقمر والنجوم مسخرت بامرہ ان فی ذلک لاٰیٰتٍ لقوم یعقلون﴾ ''اور تمہارے لئے رات اور دن، سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں عقل سے کام لینے والوں کیلئے ان چیزوں میں یقیناً نشانیاں ہیں'' (نحل/۱۲) ﴿وعلٰمٰتٍ وبالنجم ھم یھتدون﴾ ''اور علامتیں بھی (بنائیں) اور ستاروں سے بھی لوگ راستہ معلوم کر لیتے ہیں'' (نحل/۱۶) انعام ۹۷، اعراف ۵۴، حج ۱۸، صافات ۸۸، طور ۴۹، واقعہ ۷۵۔ ان آیات میں چاند سورج کے ساتھ ساتھ ستاروں کو بھی ہماری زندگی میں ھادی و راہنما بتایا گیا ہے۔

سورہ نحل آیت ۱۲ میں اللہ تبارک تعالیٰ نے چاند سورج ستاروں کو اپنی مخلوق کیلئے مسخر کیا ہے:

﴿وسخر لکم الیل والنہار والشمس والقمر والنجوم مسخرت بامرہ﴾ ''اور اس نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مسخر کیا ہے اور ستارے بھی اس کے حکم سے مسخر ہیں'' ان میں ہر ایک اپنے کام کی ادائیگی میں مصروف ہے۔ رات چاند سے مناسبت رکھتی ہے اور دن سورج سے، سورہ قصص ۷۳ کے تحت رات استراحت کیلئے اور دن عمل اور تگ و دو کیلئے

بنایا ہے:

﴿ومن رحمته جعل لكم اليل والنهار لتسكنوا فيه ولتبتغوا من فضله﴾ ''اور یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے تمہارے لئے رات اور دن کو (یکے بعد دیگرے) بنایا تا کہ تم (رات میں) سکون حاصل کر سکو اور (دن میں) اللہ کا فضل (روزی) تلاش کرو'' دن رات دونوں متعارض و متصادم نہیں ہیں بلکہ مونث و مذکر کی طرح یہ دونوں بھی ایک دوسرے کی مہم کو تکامل تک پہنچاتے ہیں۔

خداوند متعال نے مندرجہ ذیل آیات میں چاند ستاروں کو اپنی مخلوق کہا ہے:

﴿والشمس والقمر والنجوم مسخرت بامره الاله خلق والامر﴾ ''اور سورج اور چاند اور ستارے سب اس کے تابع ہیں آگاہ رہو! آفرینش اسی کی اور امر بھی اسی کا ہے'' (اعراف/ ۵۴) رعد ۲، ابراہیم ۳۳، نحل ۲۱، عنکبوت ۶۱، لقمان ۲۹، فاطر ۱۳، زمر ۵،

جدید علم افلاک میں اسے ''مجرہ'' کہتے ہیں: ستاروں کے ڈھیر یا جھرمٹ کو علمائے فلکیات مجرہ کہتے ہیں۔ ایک مجرہ کی شکل دوسرے مجرہ سے مختلف ہوتی ہے۔ ہر مجرہ میں ارب نجوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ اب تک کشف ہونے والے مجرات کی تعداد دس ارب مجروں تک پہنچ چکی ہے ہمارے سورج کی نسبت جس مجرہ سے ہے اسے مجرہ ''درب وتبانہ'' کہتے ہیں یہ ستارے آسمان پر غیر منظم طریقے سے منتشر نہیں بلکہ ایک دقیق اور باریک نظام کے تابع ہیں اور اللہ تبارک تعالی نے انہیں انسانوں کے لیے مسخر کیا ہے۔

بروج مجموعہ ستاروں کا نام ہے ان کی تعداد بارہ ہے زمین سورج کے گرد گردش کرتی ہوئی ۳۶۵ دن ۶ گھنٹے ۹ منٹ ۱۰ سیکنڈ میں سورج کے گرد گردش کو پورا کرتی ہے اس حوالے سے سورج کے ظاہری طلوع وغروب ہونے کی جگہ ہر مہینے میں بدل جاتی ہے گویا ہر دوسرے مہینے میں نئی مشرق میں طلوع ہوتا ہے اور نئی مغرب میں غروب ہوتا ہے اور اسی حوالے سے مہینے کا حساب کرتے ہیں اس طرح ایک مہینے کا تصور بنتا ہے وہ بارہ برج میں تقسیم ہوتا ہے اور اس طرح بارہ مہینے بنتے ہیں علماء نے کہا

ہے اب تک کشف ہونے والے مجروں کی تعداد سو ۱۰۰ ہے اور ہر مجرے میں سو ۱۰۰ استارے ہیں جس مجرے میں ہمارا استارا سورج آتا ہے اسے ''درب تبّانہ'' کہتے ہیں اتنے ستارے جو آسمان میں نظر آتے ہیں وہ بغیر ترتیب کے تقسیم نہیں ہے بلکہ ایک باریک حساب کے تحت تقسیم ہے جو انسان کے فائدے کے لیے چند لحاظ سے مسخر ہیں۔ مجمع البیان میں آیا ہے کہ سورۂ مبارکہ نور آیت نمبر ۶۰ میں لکھا ہے جہاں عورت اپنی محاصل کو ظاہر کرتی ہے اسے بروج کہتے ہیں کیونکہ بروج مادہ برج سے ہے برج کا اصل معنی ظاہر و بروز کے ہیں بروج حمام یعنی کبوتر کا گوسالہ۔ بروج سماء یعنی جگہ ،چاند بڑا استارہ۔

نحس اور سعادت میں ستاروں کا کردار

نحوست کیا ہے؟

نحس شوم نامبارک بدشگون زحمت وزیان ہوا کے گرد و غبار سے آلود تیز و تند ہوا کو کہتے ہیں۔ راغب اصفہانی نحس کے معنی افق پر نمودار ہونے والے اس سرخ رنگ کو کہتے ہیں جو پیتل کے مانند ہو۔ بغیر دھویں کے آگ کے شعلے کو نحس کہتے ہیں، نحس تانبے کو کہتے ہیں مغرب میں نمودار ہونے والی وہ سرخی جو تانبے کی مانند سرخ ہے۔ نحس سعادت کے خلاف ہے اس کی ضد ہے۔

سورۂ قمر آیت ۱۹ میں تند ہوا کو نحس کہا گیا ہے:

﴿انا ارسلنا علیهم ریحا صرصرا فی یوم نحس مستمر﴾ ''ہم نے ان کے اوپر تیز و تند آندھی بھیج دی ایک مسلسل نحوست والے دن میں''

﴿یرسل علیکما شواظ من نار و نحاس فلا تنتصران﴾ ''تمہارے اوپر آگ کا سبز شعلہ اور دھواں چھوڑ دیا جائے گا تو تم دونوں کسی طرح نہیں روک سکتے ہو'' (رحمن/۳۵) ﴿سخرها علیهم سبع لیال و ثمانیة ایام حسوما فتری القوم فیها صرعی کانهم اعجاز نخل

خاویۃ﴾ ''اور عاد کو انتہائی تیز و تند آندھی سے برباد کر دیا گیا۔ جسے ان کے اوپر سات اور آٹھ دن کے لئے مسلسل مسلط کر دیا تو تم دیکھتے ہو کہ وہ قوم بالکل مردہ پڑی ہوئی تھی جیسے کھوکھلے کھجور کے درخت کے تنے'' (حاقہ/۶،۷)

نحوست اور سعادت کلمات امیر المومنین کی روشنی میں

نحوست سعادت کی ضد ہے عرب حکماء عرفاء اور دانشمندوں کے ہاں چیزوں کی شناخت کا ایک طریقہ کسی چیز کو اس کی ضد سے پہچانا ہے۔

سعادت انسان کو خیر تک پہنچاتی ہے سعادت شقاوت کی ضد ہے۔ سعادت اس عمل یا معاونت کو کہتے ہیں جو خیر تک پہنچائے اسی سے پرندے کے پر کو اور انسان کے بازو کو بھی ساعد کہتے ہیں کیونکہ پر اڑنے میں مدد دیتے ہیں۔

سعادت کی شیرینی معلوم نہیں ہوتی جب تک نحس کی کڑواہٹ نہ چکھے (ق ۴۴۲۵)

نفوس آرزو ہیں عقل انکو نحوست سے بچاتی ہے (ق ۲۰۴۸)

جس نے اپنے نفس کا حساب کیا وہ سعادت مند ہو گیا (ق ۸۸۷)

جس نے اصلاح کی اپنے نفس کی اور امر کرنے کی کوشش کی وہ سعادت مند ہو گیا (ق ۸۴۴۶)

جس نے اپنے برداران کو مشقت میں ڈالا وہ سعادت مند نہیں ہو سکتا (ق ۹۴۸۵)

اطاعت خدا میں جلدی کرو سعادت مند ہو جاؤ گے (ق ۴۳۶۰)

کوئی شخص سعادت حاصل نہیں کر سکتا بغیر اقامہ حدود الٰہی کے اور کوئی شخص شقی نہیں ہو سکتا بغیر حدود الٰہی کے ضیاع کے (ق ۱۰۸۵۴) علماء کے ساتھ رہو سعادت مند بن جاؤ گے (ق ۴۷۱۷)

اہل فضل کے ساتھ نشت و برخاست کرو سعادت مند بن جاؤ گے (ق ۶۳۱۲)

علم کیساتھ عمل کرو سعادت مند بن جاؤ گے (ق ۶۴۷۹)

دنیا کی سعادتیں نحوست سے قریب ہیں (ق ۹۶۲۴)

اس شخص سے ملو جو تمہارے اور خدا کے درمیان واسطہ ہے تو سعادت مند ہو جاؤ گے (ق ۵۸۴۶)

غور وفکر کرو اپنے اندر بصیرت پیدا کرو وعظ ونصیحت سے عبرت حاصل کرو اپنی آخرت کیلئے زاد حاصل کرو سعادت مند ہو جاؤ گے (ق ۶۵۸۹)

بہترین سعادت دین کی بالا دستی ہے (ق ۲۸۶۹)

سعادت کی علامت عمل میں اخلاص ہے (ق ۱۲۳۱)

حق کے ساتھ رہو سعادت مند ہو جاؤ گے (ق ۶۴۸۹)

ایام سعادت اور نحوست

سعادت ونحوست دو ایسے مفہوم ہیں جن سے بشر اپنے ابتدائی دور سے لیکر دور حاضر تک خواہ عالم ہو یا جاہل اچھی طرح واقف وآشنا ہے سب ہی سعادت سے محبت کرتے ہیں اور اس کے حصول کیلئے کوشاں رہتے ہیں لیکن سعادت کیا ہے اور اس کے حصول کے راستے اور ذرائع کیا ہیں؟ نحوست وشقاوت کس چیز کا نام ہے اور اس سے فرار کی راہیں کیا ہیں؟ یہ بات ابھی تک واضح طور سے فیصلہ کن مرحلہ میں نہیں پہنچ سکی اسی طرح تمام مسائل سب کے لئے حل ہو جائیں یہ بات ممکن نظر نہیں آتی۔ بعض لوگ سعادت وشقاوت یا نحوست کو روح سے مربوط کرتے ہیں بعض کے نزدیک شقاوت (نحوست) کا سبب مادہ سے مربوط ہونا ہے بعض افراد سعادت کو صرف مادہ کے حصول اور کھانے پینے اور عیش ونوش کی فراوانی کو سمجھتے ہیں بعض سعادت کو حیوانی آزادی میں گردانتے ہیں جبکہ بعض افراد سعادت کو ہزاروں انسانوں کی بدبختی، شقاوت اور محرومیت میں دیکھتے ہیں کہ اگر سب مرجائیں تو انکے لئے سعادت ہوگی۔

ایام میں نحوست وسعادت اور اسکی حقیقت

کائنات میں بالخصوص انسان کی ذہنی، فکری اور جسمانی صلاحیتوں میں تفاوت واختلاف ناگزیر رہا ہے اکثر روایات اور آیات کثیرہ کے تحت دنیا میں حیات' امتحانی وآزمائشی ہونے کے سبب روزگار کبھی کسی کے حق میں ہے تو کبھی کسی کے' کسی کے یہاں ولادت تو کسی کے یہاں موت، کسی کے یہاں دولت کی فراوانی تو کسی کے یہاں فقر وفاقہ اور غربت۔

غیر خدا پرست لوگ یا ضعیف الایمان اور مادی جھکاؤ رکھنے والے اس اختلاف ودگرگونی سے دھوکا کھاتے ہیں کیوں کہ اسکی تفسیر وتوجیہ میں تواریخ اور جنتریوں میں یا بعض قدیم کتابوں میں موجود تواریخ نحس وسعد کو بعض دنوں کی طرف منسوب کیا گیا ہے بعض مخلوقات کی آواز اور حرکتوں کو نحوست کا سبب قرار دیتے ہیں اگر چہ کسی کے پاس تاریخ اور انکے دنوں کے نام اور نحوست کے بارے میں تشفی طلب اور باعث اطمینان دلیل وسند موجود نہیں' پھر بھی اکثر بیشتر لوگ، مومنین وموحد ین اور غیر موحدین' سبھی ان نحوستوں کے سامنے عاجز وناتوان نظر آتے ہیں

آیات قرآن اور روایات کی روشنی میں دنوں میں نحوست نہیں ہے۔ نحوست گرداننے کے بارے میں جو فعل وقوع پذیر ہوتا ہے اس کے بارے میں تحقیق کرنی چاہیے اسے کس نے نحس بنایا ہے اس میں نحوست کہاں سے آئی ہے اس نحوست کو پیدا کرنے کے لئے جتنے بھی عوامل ممکن ہوسکتے ہیں ہر ایک کے بارے میں تجزیہ وتحلیل کرنا چاہیے۔

دہرین اور منجمین ہی نہیں بعض مسلمان حتی بعض لباس روحانی یا مربی دین ومذہب بھی شدت اور انتہائی اہتمام کے ساتھ ایام سنہ کو انسان کے لئے دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں یعنی بعض ایام کو نحس، شوم اور نامبارک گردانتے ہیں اور بعض مخصوص اعمال انجام دینے سے منع کرتے ہیں کہتے ہیں ان دنوں میں اعمال انجام دیں گے تو برے نتائج کا سامنا ہوگا یہ شوم ہوگا۔ بعض ایام کو مبارک اور سعید

گردانتے ہیں لیکن اس کے باوجود بعض مخصوص اعمال کے لئے نامبارک قرار دیتے ہیں آگے جاکر ہم یہ دیکھیں کہ مختلف نقطہ ہائے نظر کے تحت جو ایام نحس گردانے جاتے ہیں انھیں نکال کر سال کے تین سو پینسٹھ ۳۶۵ دنوں میں سے کتنے دن خالص اور بابرکت باقی رہتے ہیں

جہاں تک دہرین کا تعلق ہے قرآن کریم کی سورہ جاثیہ آیت ۲۴ میں آیا ہے:

﴿وقالوا ماهى الاحياتنا الدنيانموت ونحيا ومايهلكنا الا الدهر﴾ ''اور وہ کہتے ہیں: دنیاوی زندگی تو بس یہی ہے (جس میں) ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں اور ہمیں صرف زمانہ ہی مارتا ہے'' ان کا عقیدہ ہے خدا کچھ نہیں جو بھی بدبختی 'شقاوت' اچھائی یا برائی ہے وہ زمانہ کرتا ہے یعنی ان کی اس منطق کے تحت کوئی بھی دن فی ذاتہ اچھا نہیں ہے کیونکہ وہی دن بعض کیلئے اچھا ہوتا ہے اور بعض کے لئے مصیبت کا دن ہوتا ہے دوسرے منجمین علم نجوم کے ذریعہ طلوع اور غروب کے حساب سے بعض ایام کو سعد اور بعض کو نحس قرار دیتے ہیں وہ بھی بعض اوقات پورے دن کو نحس قرار دیتے ہیں اور بعض اوقات صرف کسی شخص کے حوالے سے اس دن کو نحس بتاتے ہیں چنانچہ حضرت امیرؑ سے نہروان کی جنگ کے لئے جاتے وقت ایک منجم نے کہا اس سفر میں ستاروں کے حساب سے آپ کو فتح نہیں ہوگی بلکہ شکست ہوگی لہٰذا اس وقت اسے ملتوی کردیں آپؑ نے فرمایا اگر تمہاری بات مان لی جائے تو اس کا مطلب یہ ہوگا بندہ خدا سے مایوس ہو جائے اور تمہارا احسان مند ہو کہ تم انے اس کو بری گھڑی کا پتہ دیا پھر آپؑ نے فرمایا ''خبردار! اس کی بات نہ مانو۔ خدا کا نام لے کر نکل پڑو''۔

اس وقت ہمارا موضوع گفتگو دہرین کی منطق اور ان کے دعویٰ کی تردید کرنا یا منجمین کے دعویٰ کو رد کرنا نہیں بلکہ ہم یہاں ان وجوہات کو سمجھنے کی کوشش کریں گے جنکے تحت اہل اسلام قرآن وسنت کی پیروی کرنے والے اہل بیت اطہارؑ کی سیرت کو مشعل راہ اور نمونہ قرار دینے والوں نے سال کے دنوں کو نحس و مبارک میں تقسیم کیا ہے اور ان سے پوچھیں گے کہ اس کی کیا منطق ہے ہوسکتا ہے اپنے اس عمل کی توجیہ میں یہ لوگ قرآن کریم کی درج ذیل آیات کو پیش کریں:

﴿ فارسلنا علیھم ایحا صر صرا فی ایام نحسات ﴾ ''آخر کار ہم نے ان پر ایک تیز وتند آندھی منحوس دنوں میں بھیج دی'' (فصلت/۱۶) ﴿ انا ارسلنا علیھم ریحا صر صرافی نحس مستمر ﴾ ''ہم نے سرد تیز اور وحشت ناک آندھی ایک ایسے منحوس دن ان کی طرف بھیجی جو بہت طویل تھا'' (قمر/۱۹) ﴿ سخر ماعلیھم سبع لیال وثمانیة ایام حسوما ﴾ ''بنیادوں کو اکھاڑنے والی اس تیز آندھی کو سات راتوں اور آٹھ دن مسلسل ان پر مسلط رکھا'' (حاقۃ/۷) بظاہر ان آیات کو پیش کرتے ہوئے استدال کیا جاسکتا ہے خود قرآن فرماتا ہے سال میں کچھ ایام نحوست ہیں لیکن جب ان آیات کے شان نزول پر نظر کریں گے تو معلوم ہوگا یہ آیات قوم عاد پر گزرنے والے عذاب سے متعلق ہیں نہ کہ یہ عموی ہیں۔ ہوا یوں جب قوم عاد نے تکبر وغرور کیا اور حضرت ہودؑ کی نافرمانی کرتے ہوئے عذاب خدا کو چیلنج کیا تو خداوند عالم نے ان پر عذاب نازل کیا سورۂ حاقہ کی مزکورہ آیت سے پتہ چلتا ہے کہ وہ ایام جو قوم عاد کیلئے نحس تھے وہ پورا ہفتہ تھا دوسری بات یہ کہ جب عذاب نازل ہوا تو انہیں اس عذاب سے نجات نہیں ملی۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ان کے لئے عذاب نازل ہونے کے وقت سے ایک نہ ختم ہونے والا نحس دن شروع ہوا۔

بعض کا کہنا ہے جو چیزیں زمان تشکیل دیتی ہیں وہ کبھی کبھی انسان کے لئے شقاوت وبدبختی پیدا کرتی ہیں چنانچہ بہت سی کتابوں اور جنتریوں میں ہر مہینہ کے کچھ مخصوص ایام اور بعض نے ہفتہ کے بعض دنوں کو تمام کام کیلئے یا بعض کام کے لئے باعث شقاوت ونحوست قرار دیا ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں انسان کو یہ شقاوت ونحوست کہاں سے لاحق ہوتی ہے؟

عناصر ترکیبی زمان:

زمان کو وجود میں لانے والے عناصر یعنی سورج کی گردش چاند کی گردش یا زمین کی گردش ان سے شقاوت ونحوست پیدا ہوتی ہے؟

۱۔ سورج:

عناصر ترکیب زمان میں بنیادی کردار سورج کا ہے کیونکہ زمین پر سورج کی روشنی پڑنے اور نہ پڑنے سے دن رات پیدا ہوتی ہے اس دوران سورج کی دو حرکتیں ہیں ایک حرکت اپنے گرد ہے جو چھبیس دن میں پوری کرتا ہے دوسری حرکت اپنے تمام سیارات سمیت اپنے مجرے کے گرد گردش ہے دوسو میل ایک سیکنڈ کی رفتار سے ہے بعض کے نظر میں یہی نحس ہے۔ سورج کے گرد گھومنے والے سیاروں میں سے ایک سیارہ ہماری زمین ہے زمین کی اپنے محور کے گرد حرکت کے علاوہ اس کی ایک حرکت انتقالی بھی ہے اس حرکت انتقالی میں زمین اپنے مدار میں داخل ہوتے ہوئے بقول ماہرین فلکیات تین سو پیسٹھ ۳۶۵ دن میں سورج کے گرد ایک چکر مکمل کرتی ہے اس پوری ہونے والی گول مسافت میں کتنی ایسی جگہیں ہیں جہاں سے گزرتے ہوئے کسی وقت کسی جگہ کسی چیز سے تصادم مقابلہ یا ٹکراؤ ہوتا ہے یا اس سورج کا سایہ اہل زمین پر پڑتا ہے جسکی بنیاد پر اہل زمین کیلئے نحوست کا سبب بنتا ہو۔ ایسی کوئی بات نہ کسی آیت قرآنی میں ہے نہ کسی روایت میں اور نہ ہی کسی ماہر فلکیات نے بتائی ہے لہٰذا تمام اہل زمین کے لئے کوئی نحوست نہیں ہے، صرف چند گروہ ہی اپنے لئے ایسا سمجھتے ہیں غرض بذات خود سورج میں نحوست نہیں ہے بلکہ آیت قرآنی میں خداوند عالم نے سورج کو ہمارے لئے نعمت کے طور پر بیان فرمایا ہے اللہ نے اسے ہمارے فائدہ کے لئے بنایا ہے نہ کہ نقصان کیلئے

۲۔ چاند:

ساڑھے انتیس ۲۹ دن میں زمین کے گرد چاند ایک چکر پورا کرتا ہے تاریخوں میں جو نحوست بتائی گئی ہے وہ ستاروں کے بروج کے اعتبار سے ہے۔ مثلا چاند اس وقت اس برج کے دائرے سے گزرے گا تو یہ اچھا نہیں ہے نحس ہے بالخصوص برج عقرب سے گزرنے کو زیادہ خطرناک قرار دیا جاتا ہے حالانکہ چاند کی حرکت ہمارے حساب کے لئے ہے خداوند عالم نے اسے علامت ونشانی

کیلئے بنایا ہے اگر چاند کا اس خاص جگہ سے گزرنا طبیعی طور پر اہل زمین کے لئے نحوست کا باعث ہوتا تو تمام اہل زمین کے لئے نحوست ہونا چاہیے تھی جبکہ ایک مخصوص گروہ کے علاوہ دنیا کے باقی لوگ اس طرح نہیں سوچتے۔

۳۔ زمین:

زمین اپنے محور پر گردش کرتے ہوئے چوبیس گھنٹوں میں ایک دور پورا کرتی ہے لہٰذا اگر اس کی اپنی گردش میں نحوست ہے تو اسے گھنٹوں میں ہونا چاہیے نہ کہ دنوں میں یعنی دن نحس ہو رات نحس نہ ہو یا رات نحس ہو دن نحس نہ ہو جبکہ کسی نے ایسا نہیں کہا۔

۴۔ خود خدا:

کہتے ہیں کہ خداوند متعال نے خود نحوست پیدا کی ہے اس میں چند مفروضے ہیں:

ایک مفروضہ یہ ہے کہ مسرت اور نحوست کا الگ الگ خدا ہے جبکہ یہ ثنویہ اور مجوسیوں کا عقیدہ ہے ان کے علاوہ مجبرہ بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں یہ دونوں عقائد کثیر دلائل و براہین سے بالخصوص اہل تشیع کے نزدیک باطل ثابت ہو چکے ہیں بعض روایات اور اہل بیتؑ سے وارد دعاؤں کے مطابق خدا بجز خیر کچھ نہیں کرتا شر اس کی ذات سے دور ہے چنانچہ فلاسفہ کہتے ہیں جو منجانب اللہ صادر ہوتا ہے وہ وجود ہے اور جو د خیر محض ہے۔

۵۔ انسان:

اگر کوئی انسان خود اپنے لئے یا دوسرے کیلئے باعث نحوست ہے یعنی یہاں اس کا فاعل انسان ہے تو یہ نظریہ بھی متعدد وجوہات کی بناء پر باطل ہے مثلاً:

ا۔ کثیر آیات میں انسان کو خدا کا خلیفہ قرار دیا گیا ہے جسے خدا خود خلیفہ ہونے کا شرف بخشے اس میں نحوست کیوں پیدا کرے گا؟

۲۔ سورۂ مبارکہ بنی اسرائیل آیت ۷۰ میں ہے کہ خداوند عالم نے انسان کو کرامت و فضیلت بخشی

ہے: ﴿ولقد کرمنابنی ادم﴾ ''اور بتحقیق ہم نے اولادآدم کو عزت وتکریم سے نوازا''

۳۔ سورۂ عصر وسورۂ تین آیت ۶ میں خداوند عالم نے انسان مومن اور عمل صالح کرنے والے کو برائی اور نحوست سے مستثنیٰ کیا ہے:

﴿والعصر۔ان الانسان لفی خسر۔الاالذین امنواوعملواالصٰلحٰت وتواصوابالحق﴾ ''قسم ہے زمانے کی انسان یقیناً خسارے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جوایمان لائے اور نیک اعمال بجالائے اور جوایک دوسرے کوحق کی تلقین کرتے ہیں''

﴿الاالذین امنواوعملواالصٰلحٰت فلھم اجرغیرممنون﴾ ''سوائے ان لوگوں کے جوایمان لائے اور نیک عمل کرتے رہے پس ان کے لئے نے انتہا اجر ہے''

۴۔ خداوندعالم نے فرمایا جومیری ہدایت کی پیروی کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا نہ شقی ہوگا۔انسان کی فطرت میں شقاوت نہیں ہے بلکہ اگر کوئی شخص شقی ہے تو اس نے اس شقاوت کو اپنے لئے خود انتخاب کیا ہے۔نحوست وسعادت دونوں انسان کے فعل کا نام ہے فعلِ انسان جہاں اپنے لئے مفید ونقصان دہ ہے اسی طرح دوسروں پر بھی اثر انداز ہوتا ہے جیسے بعض افعال انسان اپنے لئے سعادت سمجھتے ہیں وہی دوسروں کیلئے نحوست ہوتا ہے جیسے جھوٹ'چوری'ڈاکے'رشوت وغیرہ۔ اگر فعل اچھا ہو تو اسے اعمال صالحہ اور حسنہ کہتا ہے اور جو بُرا کام انجام دیتا ہے اسے اعمال سیۂ اور خبیثہ کہتا ہے۔

معاشرہ میں نحوست کو،کون فروغ دیتا ہے؟

معاشرہ میں حاکم جور نحوست پھیلاتے ہیں چنانچہ حضرت امام موسیٰ بن جعفر صادقؑ نے فرمایا:

''تمام برائیوں کی جڑ امام جائر(ظالم) ہے''۔ (میزان الحکمت جلداول ۲۰ انقل ازکافی جلداول ۳۷۴)

دعائے شریف ندبہ اور دعاشریف افتتاح کے آخری فقرات بھی اس بات کے گواہ ہیں۔

دین اسلام میں آیات قرآن کی روشنی میں سعادت ونحوست یاشقاوت دونوں خود انسان سے منسوب

ہے سورۂ ہود آیات ۱۰۵ تا ۱۰۸ کے مطابق شقی جہنمی ہے اور سعید جنتی:

﴿فمنهم شقی و سعید۔ فاما الذین شقوا ففی النار لهم فیها زفیر و شهیق۔ خلدین فیها مادامت السموٰت والارض الا ماشآء ربك ان ربك فعال لما یرید۔ واما الذین سعدوا ففی الجنة خلدین فیها مادامت السموٰت والارض الا ماشآء ربك عطآءً غیر مجذوذ﴾ ''پھر ان میں سے کچھ لوگ بد بخت اور کچھ نیک بخت ہوں گے۔ جو بد بخت ہونگے وہ جہنم میں جائیں گے جس میں انھیں چلانا اور دھاڑنا ہوگا۔ وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے جب تک آسمانوں اور زمین کا وجود ہے مگر یہ کہ آپ کا رب (نجات دینا) چاہے بے شک آپ کا رب جو ارادہ کرتا ہے اسے خوب بجالاتا ہے اور جو نیک بخت ہوں گے وہ جنت میں ہوں گے جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے جب تک آسمانوں اور زمین کا وجود ہے مگر جو آپ کا رب چاہے وہاں منقطع نہ ہونے والے بخشش ہوگی'' صاحب المیزان نے اس آیت کریمہ کی تفسیر میں سعادت کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا: ''سعادت وہ ہے جو انسان کو کمال لذت تک پہنچانے میں مدد کرے خواہ یہ روحانی ہو یا جسمانی یعنی خیرات تک پہنچائے'' سورۂ طٰہ آیت ۱۲۳ میں فرمایا جو انبیاء کی ہدایت پر چلتے ہیں وہ شقاوت سے دور رہتے ہیں:

﴿فمن اتبع هدای فلا یضل ولا یشقی﴾ ''تو جو میری ہدایت کا اتباع کرے گا وہ نہ گمراہ ہوگا اور نہ شقی'' شقاوت دینوی یہ ہے کہ کوئی زندگی کی سہولتوں سے محروم رہے البتہ شاید یہی محرومی سعادت اخروی کا سبب بنے شقاوت اخروی بندے کا جنت سے محروم ہونا ہے، شاید اس کا سبب یہ ہو کہ وہ دنیا میں غیر محدود سعادت سے لطف اندوز ہوا۔ جبکہ کچھ افراد ایسے ہیں جنکے لیے دنیا و آخرت میں سعادت ہے۔ جیسا کہ امیر المومنین علیؑ نے محمد ابن ابی بکر کے نام ایک خط میں تحریر فرمایا وہ دنیا و آخرت دونوں میں سعادتوں سے مالا مال ہیں لیکن ایسی سعادت صرف انہیں انسانوں کو میسر آتی ہے جنھیں ایک نظام صالح اور رہبر صالح کے سائے میں زندگی گزارنی نصیب ہو۔

سب سے بڑی نحوست عمل انسان ہے

ان بیانات سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آئی کہ سب سے بڑی نحوست اور شقاوت یہ ہے کہ کوئی شخص اسلام کے بنائے ہوئے اصولوں پر عمل کرنے کے بجائے وہمی دنوں کی نحوست سے گریز کرے اور سعید دنوں کے انتظار میں بیکار بیٹھا رہے، سب سے بڑی بدبختی اور شقاوت یہ ہے انسان دنیا و آخرت دونوں کیلئے بے عمل رہے۔

ایام نحس وسعادت

فہرست:

دنیا بھر میں ملحد مشرک مسلمان غرض ہر گروہ کے نزدیک کچھ دن ایام نحس کے نام سے اور کچھ دن سعادت کے نام سے معروف ہیں چنانچہ ہم یہاں آپ کی خدمت میں مہینہ اور ہفتہ میں موجود ایام نحس وسعادت کو قدیم فرسودہ کتابوں اور نحس فروش جنتریوں کی پیش کردہ ایام نحس کی فہرست پیش کرنے سے گریز کرتے ہوئے ایک خلاصہ ونچوڑ پیش کر کے باقی قارئین کی عقل وشعور پر چھوڑتے ہیں۔ ہر مہینے میں نحس مطلق، نحس اکبر، قمر در اقرب، اس کے علاوہ دنوں کے نام جو ایک کام کیلئے اچھا دوسرے کام کیلئے بُرا قرار پانے کے بعد سرکاری اور علاقائی اور دینی تہواروں کو نکالنے کے بعد زندگی کے مسائل کے حل کیلئے کون سا وقت اور کون سا دن باقی رہ جاتا ہے

دنوں میں نحوست نہیں ہے

تفسیر نور الثقلین جلد چہارم صفحہ ۳۸۲ پر سورۂ یٰسین کی آیت ۱۸: ﴿قالو انا تطیرنا بکم﴾ ''انہوں نے کہا ہم تو تمہیں اپنے لئے فال بد سمجھتے ہیں'' کی تفسیر میں کتاب خصال سے حدیث نقل کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت علیؑ نے اپنے اصحاب کو دین و دنیا سے مربوط چار سو ۴۰۰ مسائل سکھائے جس میں آپؑ نے ان کو تین چیزوں سے گریز کرنے کی خاص طور پر ہدایت فرمائی۔

۱۔ تکبر ۲۔ تطیر (فال بد) ۳۔ تمنا

آپ نے فرمایا: اگر کوئی شخص تم سے کسی کام کے بارے میں تطیر کرے یعنی فال بد ادا کرے تو تم اس کی بالکل پروا مت کرو بلکہ نام خدا لے کر اس کام کو انجام دو۔

اگر کبھی اپنے اندر تکبر محسوس کرو تو اپنے خادم کے ساتھ کھانا کھاؤ اور اپنے گوسفند کا دودھ خود دوھو۔

اگر کسی چیز کے بارے میں دل میں تمنا پیدا ہو نفس گناہ پر آمادہ ہو تو سب کچھ چھوڑ کر خدا کی طرف راغب ہو جاؤ۔

کتاب روضہ کافی میں عمر بن حریز نے حضرت امام جعفر صادق سے نقل کیا ہے "تطیر یعنی فال بد وہ چیز ہے اگر آپ نے اسے آسان اور معمولی سمجھا تو یہ آسان اور معمولی ہو جاتا ہے اگر آپ نے اسے بڑا سمجھا تو یہ بڑا ہوتا ہے اور اگر آپ نے اسے کچھ بھی نہیں سمجھا تو یہ کچھ نہیں ہوتا" اسی طرح امام صادق سے ایک اور حدیث ہے آپ نے پیغمبرؐ سے نقل کیا کہ تطیر گناہ ہے اس کا کفارہ توکل ہے امام جعفر صادق نے پیغمبر اکرمؐ سے نقل کیا ہے "اسلام میں نہ دشمنی ہے نہ تطیر ہے اور نہ شوم ہے"۔

امالی سید مرتضیٰ صفحہ ۴۵ میں پیغمبر اکرمؐ سے نقل ہے آپ نے فرمایا۔ "زمانے (دھر) کو سب و شتم مت کرو برا بھلا مت کہو کیونکہ دھر خدا ہے" اس کی تاویل میں علماء نے فرمایا کیونکہ جو برائی یا شقاوت انسان کے لئے پیش آتی ہے اس میں زمانے کا کوئی کردار نہیں ہوتا، اس کائنات میں تصرف خدا کی تدبیر سے ہے۔ ایک اور تفسیر کے تحت علم الہدیٰ فرماتے ہیں ملحدین عرب اپنے اوپر نازل ہونے والے حالات واقعات مرض عافیت قحط سالی آرام و آسائش کی نسبت زمانے کی طرف دیتے تھے چنانچہ سورۂ جاثیہ آیت ۲۴ میں ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وقالو اماھی الا حیاتنا الد نیا نموت و نحیا وما یھلکنا الا الدھر ومالھم بذلک من علم ان ھم الا یظنون ﴾ "اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ صرف زندگانی دنیا ہے اسی میں مرتے ہیں اور اسی میں جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کر دیتا ہے اور انہیں اس بات کا کوئی علم نہیں ہے کہ یہ صرف ان

کے خیالات ہیں اور بس"

چونکہ وہ لوگ خدا کو مانتے تھے اور اچھائی و برائی کو زمانے کی طرف نسبت دیتے تھے خدا انکی رد میں فرماتا ہے زمانہ کچھ نہیں کرسکتا یہ فعل خدا ہے۔

سید رضی علم الہدی مجازات قرآن ص ۲۲۳ میں کنزل اعمال صفحہ ۲۳۵۰ سے اس حدیث کو نقل کرتے ہیں۔ عربوں پر جب مصیبتیں نازل ہوتیں نعمت' صحت' عافیت چھن جاتی، تو ایسے موقع پر وہ زمانے کی ملامت وشماتت کرتے ہوئے کہتے زمانے نے ہم سے انتقام لیا' بدلہ لیا۔

جاہلیت کے اس عقیدے اور منطق کے خلاف خداوند متعال نے فرمایا جو کچھ تمہارے ساتھ ہوا وہ زمانہ نے نہیں کیا دینے والا، کھینچنے والا، تغیر وتبدیل کرنے والا، روکنے والا اور کھولنے والا خدا ہے یہ باتیں جو تم کرتے ہو وہ جہالت پر مبنی ہیں۔

پیغمبرؐ سے مروی ہے: ﴿ لا تعادو الایام فتعاد لکم ﴾ "دنوں سے دشمنی مت کرو تمہارے ساتھ دشمنی ہوگی"۔

مجازات نبوی میں دن کے بارے میں ہے اسے برا بھلا نہ کہو۔ یہ نہ سمجھو یہ برائی اس دن سے مختص ہے کیونکہ دن تو زمین کی گردش سے وجود میں آتا ہے۔

کتاب معانی الاخبار تالیف شیخ صدوق ص ۱۲۳ میں عبداللہ ابن احمد موصلی نے سقر ابن ابی دلب سے اور انہوں نے امام علی الہادیؑ سے نقل کیا: امامؑ سے دریافت کیا گیا پیغمبر کی یہ حدیث کہ دنوں کے ساتھ دشمنی نہ کرو تمہارے ساتھ دشمنی ہوگی اس حدیث کا کیا مطلب ہے؟ امامؑ نے فرمایا کہ جب تک آسمان وزمین باقی ہیں دنوں سے مراد ہم ہیں، ہفتہ سے مراد رسول اللہ ہیں۔ اتوار سے امیر المومنینؑ۔ پیر سے حسنؑ وحسینؑ۔ منگل سے امام زین العابدینؑ۔ امام باقرؑ اور جعفر صادقؑ۔ بدھ سے موسیٰ بن جعفرؑ علی ابن موسیٰؑ' محمد ابن علیؑ اور ہم مراد ہیں۔ جمعرات سے حسن عسکریؑ اور جمعہ سے امام زمانہؑ مراد ہیں۔

لہٰذا اس حدیث کا مطلب یہ ہے اگر ان سے دنیا میں دشمنی کی تو تمہارے ساتھ آخرت میں دشمنی ہوگی۔

عالم بزرگوار شیخ عباس قمی نے مفاتیح الجنان میں اس حدیث کے تحت علی ابن بابویہ سے معصومینؑ سے منسوب ایام میں انکے لئے مخصوص زیارات نقل کی ہیں۔

تاریخ اور دنوں کی نحوست قرآن وسنت کے منافی ہے

۱۔ وسائل الشیعہ جلد ۱۱، حدیث نمبر ۱۵۰۱۹ میں امام صادق نے پیغمبر سے نقل کیا ہے کہ فال بد مت نکالو۔

حدیث نمبر ۱۵۰۲۰ میں امام جعفر صادق نے فرمایا کہ فال بد یا تطیر ایسی چیز ہے کہ اگر آپ نے اسے ہلکا سمجھا تو ہلکا ہوگا لیکن اگر سخت سمجھا تو سخت ہوگا اور اگر کچھ نہیں سمجھا تو کچھ بھی نہیں ہوگا۔

۲۔ حدیث نمبر ۱۵۰۲۱ میں امام جعفر صادق نے پیغمبرؐ سے نقل کیا ہے کہ تطیر گناہ ہے اس کا علاج توکل ہے۔

۳۔ حدیث نمبر ۱۵۰۲۲ میں ہے کسی نے ابوالحسن سے پوچھا کیا بدھ کے دن سفر کرنے والے واپس نہیں آتے؟ امام نے جواب دیا جو یہ کہتے ہیں بدھ کے دن سفر کرنے والے واپس نہیں آتے ہیں ان کی اس رائے اور عقیدے کے برخلاف وہ شخص ہر آفت و بیماری سے محفوظ ہے اور اس کی ہر حاجت روا ہے۔

حدیث نمبر ۱۵۰۲۳ میں پیغمبرؐ سے مروی ہے اگر تم نے فال بد کی تو اس کے برخلاف عمل کرو۔

۴۔ حدیث نمبر ۱۵۰۲۴ میں فرماتے ہیں کہ جب بھی دل میں وسوسہ پیدا ہوجائے فال بد پیدا ہوجائے تو کہو خداوندا! جو کچھ میرے دل میں وسوسہ پیدا ہو رہا ہے اس سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔

دراصل اس نحس کا زمان سے کوئی تعلق نہیں بلکہ نحوست خود انسان کے عمل میں ہے بعض انسان اپنے لئے ہمیشہ سعادت کو اپناتے ہیں اور بعض دن رات کی کوششوں اور جد وجہد سے شقاوت و بدبختی کو اپنی طرف کھینچتے ہیں ایسے افراد تنہا اپنے لئے شقی نہیں ہوتے بلکہ اکثر اوقات اپنے والدین اولاد اہل محلّہ علاقے ملک بلکہ پوری دنیا کے لئے شقی و بدبختی کا سبب بنتے ہیں۔

﴿ مااصاب من مصیبة فی الارض ولافیانفسکم الافی کتب من قبل ان نبر اهاان ذلك علی الله یسیر ﴾ ''یہ کوئی مصیبت دنیا میں آتی ہے نہ تمہاری جانوں میں مگر اس سے پہلے کہ ہم اس کو پیدا کریں وہ اک خاص کتاب میں لکھی ہوئی ہے یہ اللہ تعالیٰ کے لئے آسان ہے'' (حدید/۲۲) ملحدین برائیوں کو زمانے کی طرف نسبت دیتے تھے تو پیغمبرؐ نے انکی رد میں سورۂ جاثیہ آیت ۲۴ تلاوت کی:

﴿وقالو اما هی الاحیاتنا الدنیا نموت و نحیا و ما یهلکنا الاالدهر ومالهم بذلك من علم ان هم الا یظنون ﴾ ''اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ صرف زندگانی دنیا ہے اسی میں مرتے ہیں اور اسی میں جیتے ہیں اور زمانہ ہی ہم کو ہلاک کر دیتا ہے اور انہیں اس بات کو کوئی علم نہیں کہ یہ صرف انکے خیالات ہیں اور بس''

پیغمبرؐ نے فرمایا: زمانے کو سب وشتم مت کرو خدا خود زمانہ ہے۔

زمانہ کچھ نہیں کرتا جو کچھ اس کائنات میں کرتا ہے وہ یا خدا کرتا ہے یا بندے کا کسب ہے۔

امالی سید مرتضیٰ جلد ۲ صفحہ ۲۰۲ میں ایک حدیث ہے: ''زمانے کو برا نہ کہو خدا خود زمانہ ہے انسان پر پڑنے والی مصیبتیں (زمانہ کی وجہ سے نہیں) اس کی اپنی وجہ سے ہیں''۔

دنوں میں نحوست کہاں سے آئی

قدیم یونانی ستارہ شناسوں کے تحت سورج سال میں بارہ منزل سے گزرتے ہیں اور ہر ایک منزل طے کرنے میں ایک مہینہ لگتا ہے اس منزل میں موجود ستاروں کے اپنے اثرات ہیں جو ایک شخص یا ایک کام کیلئے اچھا ہے دوسرے کیلئے بُرا، اور ہر ایک منزل کیلئے ایک نام وضع کیا ہے جو اس وقت

کے بتوں کے نام سے منسوب ہیں۔ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ بروج سے مراد وہ بارہ منزلیں ہیں چنانچہ زیادابن منذر ابی الجاروت نے نقل کیا ہے جبکہ امام جعفر صادق علیہ السلام نے ان کے بارے میں کہا یہ جھوٹے' کافر ہیں ان پر خدا کی لعنت ہو۔

اس فرسودہ مفروضہ اور نظریئے کو بعض علماء اسلام نے بعض غیر معتبر احادیث اور بعض مفسرین نے آیات برج کی تفسیر سے جوڑ کر ان کی اس سعادت ونحس کی تائید کی ہے بعض علماء اور مومنین جو زندگی کے تمام شعبوں میں حتیٰ دینی سرگرمیوں میں بھی انکا تعلق تاریخ میلادی سے ربط رکھتے ہیں صرف شادی اور گھر بنانے کیلئے تاریخ قمری میں نحس وقمر در اقرب کی ضرورت کیوں پڑتی جبکہ بعض علماء اس عمل کو اپنی دینی فرائض وذمہ داریوں میں شمار کرتے ہوئے جنتری یا اس سے وابستہ کتابوں کو دیکھ کر نحس وسعادت کی تاریخ مقرر کرتے ہیں۔ سورج کا ان برجوں سے گذرنے میں ایک خطے سے نزدیک اور دوسرے سے دور ہونا ہے۔ اسی تناسب سے موسم، زراعت بھی متاثر ہوتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ محسوس حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں۔ تاہم ان ستاروں سے کسی انسان کیلئے سعادت اور کسی کیلئے نحوست قرار دینے کی کسی بھی حوالے سے کوئی منطق نہیں، جسطرح سردی گرمی اور فصل سب کیلئے ہیں تو پھر یہ ستارے کیسے ایک کے لئے سعادت اور دوسرے کیلئے نحوست بن سکتے ہیں:

۱۔ برج حمل: (۲۱مارچ تا ۲۱اپریل) سورج برج حمل میں ۹ مارچ کو داخل ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ہوا گرم ہو جاتی ہے اس میں حرارت آتی ہے اسکے ساتھ نباتات سرسبز ہو جاتے ہیں۔ ۲۱مارچ فصل ربیع میں داخل ہوتا ہے۔ ۲۳مارچ سے دن بڑھنا شروع ہو جاتے ہیں۔ ۴مارچ کو لیالی عجوز کہا جاتا ہے جو تین فروری سے ۴مارچ تک ہے۔ اس میں ہوائیں تیز چلتی ہیں بارش برستی ہے ان ایام کو حسوم کہتے ہیں۔

۲۔ برج ثور: (۲۲اپریل تا ۲۰مئی) سورج برج ثور میں ۸ اپریل کو داخل ہوتا ہے۔ اپریل میں

پھلوں کے تخم پیدا ہوتے ہیں سبزیاں اور نباتات قوی ہوتی ہیں ہوائیں چلتی ہیں چشمے جاری ہوتے ہیں اس مہینے میں بارش پھلوں کیلئے نقصان دہ ہوتی ہے لیکن اسکے برعکس نباتات کیلئے مفید ہوتی ہے۔

۳۔ برج جوزہ: (۲۱ مئی تا ۲۱ جون) سورج برج جوزہ میں ۹ مئی میں داخل ہوتا ہے اس مہینے میں ہوا خوشگوار ہوتی ہے پھلوں میں زردی آنا شروع ہو جاتی ہے اس موسم میں کھانا کم کھانا چاہیے۔

۴۔ برج سرطان: (۲۲ جون تا ۲۳ جولائی) سورج ۹ جون کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ اس موسم میں پھل پکنا شروع ہوتے ہیں اور اس ماہ کی ۲۱ تاریخ سے گرمی کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ گرمی میں شدت آتی ہے۔ ۳۰ جون سب سے بڑا دن اور سب سے چھوٹی رات ہوتی ہے۔ اس ماہ میں گرم چیزیں کھانے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

۵۔ برج اسد: (۲۴ جولائی تا ۲۳ اگست) سورج ۱۰ جولائی کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ اس ماہ میں پھل پک جاتے ہیں۔ خون میں حرارت بڑھ جاتی ہے آنکھوں کی بیماریاں پھیلتی ہیں۔

۶۔ برج سنبلہ: (۲۴ اگست تا ۲۳ ستمبر) سورج ۱۱ اگست کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ اس ماہ میں دن رات برابر ہوتے ہیں۔ اس ماہ میں جسم کے مسام کھل جاتے ہیں ہوائیں چلتی ہیں اور نزلہ زکام کی بیماری عام ہوتی ہے۔

۷۔ برج میزان: (۲۴ ستمبر تا ۲۳ اکتوبر) سورج ۱۰ ستمبر کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ اس ماہ میں دن رات موسم متعدل ہوتا ہے۔ ۲۱ ستمبر سے موسم خزاں کا آغاز ہوتا ہے۔ درختوں کے پتے زرد ہو کر گرنے لگتے ہیں۔

۸۔ برج عقرب: (۲۴ اکتوبر تا ۲۲ نومبر) سورج ۱۱، اکتوبر کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ اس ماہ میں حرارت کم ہو جاتی ہے۔ گندم اور جو کی کاشت شروع ہو جاتی ہے۔

۹۔ برج قوس: (۲۳ نومبر تا ۲۲ دسمبر) سورج ۱۱ نومبر کو اس برج میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس ماہ میں

دریاؤں کی موجوں میں حرکت آتی ہے حشرات اور پرندے چھپ جاتے ہیں۔
۱۰۔ برج جدی: (۲۳دسمبر تا ۲۰ جنوری) سورج ۱۰ دسمبر کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ اس ماہ میں درختوں کے پتے گر جاتے ہیں اور ۲۱ دسمبر سے شدید سردی کا آغاز ہوتا ہے۔ نزلہ و زکام کی بیماری عام ہوتی ہے۔ ۱۰ دسمبر کو سب سے بڑی رات اور سب سے چھوٹا دن ہے۔
۱۱۔ برج دلو: (۲۱ جنوری تا ۱۹ فروری) سورج ۹ جنوری کو اس برج میں داخل ہوتا ہے۔ مختلف قسم کی ہوائیں چلتی ہیں۔
۱۲۔ برج حوت: (۲۰ فروری تا ۲۰ مارچ) سورج سات فروری کو اس برج میں داخل ہوتا ہے دریا کی موجوں میں ہیجانی آتی ہے اسکے علاوہ پہاڑوں سے برف پگھلنا شروع ہو جاتی ہے۔

عبادتِ نیّرین

رب علیم وقدیرُ حی وابدی سے خلعت خلافت' اعزاز کرامت حاصل کرنے والے اس انسان نے اپنے معبود برحق کو چھوڑ کر اپنے سے پست یا اپنی جیسی مخلوقات کی پرستش شروع کی۔ جن مخلوقات کی انسان نے پرستش کی ان میں سے ایک سورج اور چاند ہے۔ ان دونوں سے وابستہ سیارات کو قدیم وجدید علم نجوم نے منظومہ شمسی کے نام سے یاد کیا ہے اس منظومہ شمسی کے بارے میں قدیم فیزکس میں ارسطو اور بطلیموس کے نظریات کے تحت منظومہ شمسی سورج کے علاوہ چھ اور ستاروں کو کہا جاتا تھا جو زمین کے گرد گردش کرتے ہیں یہ چاند (Moon)' زہرہ (Venus)' عطارد (Mercury)' مریخ (Mars)' مشتری (Jupiter)' زحل (Saturn) ہیں لیکن اٹھارویں' انیسویں اور بیسویں صدی میں تین اور ستارے کشف ہوئے ہیں ان میں سے ایک اورانس (Uranus) ہے جو ۱۷۸۱ میلادی کو ولیم ھرشیل (Wiliam Herschel) دوسرا ستارہ نپتون (Neptune) ہے اس سے پردہ ۱۸۴۶ کو فرانس کے فلکدان لفریر (Le Verier) نے اٹھایا۔ تیسرا ستارہ بلوتو (Pluto) ہے جسے توم باو

(C.Tombaugh) نے ۱۹۳۰ میں کشف کیا۔اب ان ستاروں کی تعداد نو ہوگئی ہے یہ سورج کے گر مختلف انداز میں گھومتے ہیں۔اس وقت ہمیں ان دو سیارے سورج اور چاند کو معبود بنانے اور اسکی پرستش کرنے کے بارے میں گفتگو کرنی ہے:

قدیم زمانے سے انسانوں نے سورج و چاند کے پرستش شروع کی اور ان کو اپنا معبود قرار دیا وہ اس بات کو بھول گئے کہ خدا ان کا معبود برحق ہے۔سورۂ فصلت آیت ۳۷ میں خداوند عالم نے فرمایا ہے کہ یہ دن رات اور سورج و چاند خدا کی نشانیاں ہیں ان کو سجدہ نہ کرو بلکہ سجدہ خدا کے لئے ہے۔جس نے سورج و چاند کو خلق کیا وہی سجدہ کا مستحق ہے:

﴿لاتسجدوا للشمس ولاللقمر واسجدوا الله الذی خلقھن﴾ ''اور سورج اور چاند کو سجدہ نہ کرو بلکہ اس خدا کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا ہے''

آیئے پہلے سورج کو دیکھتے ہیں جسے عربی میں ''شمس'' کہتے ہیں:

کلمہ شمس قرآنِ کریم میں تینتیس (۳۳) بار آیا ہے یہ مادۂ اشمہ اور شمہ سے لیا گیا ہے اس کی جمع شموس ہے شموس اس حیوان کو کہتے ہیں جو کہیں رکتا نہ ہو یعنی دائم الحرکت ہے اس کی جمع الشمس بھی ہے رجل شموس جس کی خصلت پائیدار نہ ہو غرض وہ مختلف تغیر و تبدل میں رہے اسے استقرار نہ ہو۔ناقع الشمس بھی اس حیوان کو کہتے ہیں جو اپنے سوار ہونے والے کے تابع نہیں رہتا۔

۱۔ چونکہ سورج بلندی اور حرارت کا حامل ہے لہٰذا اپنے کے اندر شدت تیزی، بلندی اور غلبہ کی وجہ سے بھی شمس کہلاتا ہے۔

﴿وسخرلکم الشمس والقمر دائبین﴾ ''جس نے سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں'' (ابراہیم/۳۳)

خداوند عالم نے قرآنِ کریم میں سورج کو ضیاء اور چاند کو نور کہا ہے دونوں کے معنی میں فرق ہے سورج کو سراج وہاج کہا ہے جبکہ چاند کو سراج منیر کہا ہے، سورج کو سراج وہاج کہنے کا مطلب یہ ہے کہ

یہ نور کے ساتھ اپنے اندر سے حرارت بھی دیتا ہے جبکہ چاند میں یہ صفت نہیں ہے۔

سورج ان ستاروں میں سے ہے جو متوسط ہیں دیگر ستارے جو اپنے آپ روشنی دیتے ہیں وہ اپنے اندر ذرات کی وجہ سے روشنی دیتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ سورج کی روشنی نکل کر ان ستاروں پر پڑتی ہے چاند ایک ایسی روشنائی دیتا ہے جو اپنی سطح پر ہے دوسرے کیلئے نہیں ہے۔

سورج اپنے پورے منظومہ شمسی کے اندر موجود تمام سیارات کے ساتھ اپنے مجرے کے گرد حرکت میں ہے وہ اپنے گرد موجود تمام سیاروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔

﴿وسخر الشمس والقمر کل یجری لاجلٍ مسمّٰی﴾ ''اور اس نے آفتاب و ماہتاب کو ایک قانون کا پابند بنایا اس سارے نظام کو ہر چیز ایک وقتِ مقرر تک کیلئے چل رہی ہے'' (رعد/۲)

لقمان/ ۲۹، روم/ ۸، احقاف/ ۳، زمر/ ۵، فاطر/ ۱۳

ہمارا مجرہ جو ایک لاکھ ملین ستاروں کا مجموعہ ہے سورج ان کا ایک گھرانہ ہے جس کی مساحت ہماری زمین سے ۱۰۹ گنا زیادہ ہے اور ۲۵۰ برابر حجم زیادہ ہے ۳۳۰ ہزار زمین کے برابر وزن ہے سورج کی دو حرکتیں ہیں ایک حرکت اپنے گرد ہے جو چھبیس دن میں پوری کرتا ہے دوسری حرکت اپنے تمام سیارات سمیت اپنے مجرے کے گرد گردش کرتا ہے جو دو سو میل ایک سیکنڈ کی رفتار میں ہے۔

سورج کی فضا آگ سے بھری ہوئی ہے سورج کے اوپر گرم گیس اور ذرات پائے جاتے ہیں وہاں متوسط درجہ حرارت ۵۰۰۰ ڈگری ہوتا ہے۔

سورج ایک ایسا جرم (جسم) ہے جو فضا میں ہے اور اپنی قدرت ناری کے ساتھ چمک بھی رکھتا ہے یہ روئے زمین کو دن میں اپنے نور سے روشنائی دیتا ہے اور رات کو چاند کے ذریعہ سورج کے نور کو ضیاء اور چاند کے نور میں چونکہ حرارت نہیں ہے اس لئے اسے سراج کہا گیا ہے۔

علماءِ فلکیات نے سورج کے حجم کو تیرہ کھرب مکعب فٹ زمین سے بڑا بتایا ہے سورج کی اپنے مرکز کے گردش کرنے کے بارے میں سورہ یٰسین/ ۳۸ میں آیا ہے:

﴿والشمس تجری لمستقرلها﴾ ''اور سورج اپنے مقررہ ٹھکانے کی طرف چلا جارہا ہے'' اس کی حرارت خط استواء پر بہت شدید ہوتی ہے اور وہاں سے فاصلہ کم ہوتے ہوئے یہاں تک کہ قطب شمالی اور جنوبی تک پہنچتے ہوئے نکتۂ انجماد ہو جاتا ہے جہاں سے برفانی علاقہ شروع ہوتا ہے۔

☆سورۂ یونس آیت ۵:

﴿ھوالذی جعل الشمس ضیآئوالقمرنورًا﴾ ''وہی ہے جس نے سورج کو روشن کیا اور چاند کو چمک دی''

سورج ہر چیز کو نور اور توانائی فراہم کرتا ہے۔ پانی کو بخارات میں تبدیل کرتا ہے تاکہ بارش برسائے جس سے تمام حیوانات اور نباتات سیراب ہو سکیں۔ سورج اپنے گرد گردش کرنے والے ستاروں کی ماں ہے زمین کا اپنے محور کے گرد گردش کرنے سے دن بنتا ہے۔

مندرجہ بالا آیت کے تحت سورج اور چاند دونوں ہمیں نور دیتے ہیں۔ لیکن ان دونوں میں ایک فرق ہے سورج جو نور دیتا ہے اسے ضیاء کہتے ہیں اور چاند کے نور کو روشنائی کہتے ہیں۔ چاند کا نور اسکا ذاتی نہیں ہے بلکہ یہ سورج کا مرہون منت ہے:

﴿ھوالذی جعل الشمس ضیآءً والقمرنورًا﴾

''اسی خدا نے آفتاب کو روشنی اور چاند کو نور بنایا ہے'' (یونس/۵)

سورج اور اسکی حرارت

جہاں پوری کائنات اس عظیم مخلوق کے نور سے استفادہ کررہی ہے۔ وہاں اس کے اور بھی فوائد و ثمرات ہیں جس نے عقول کو مبہوت کیا ہے۔ اس مخلوق کی ایک نعمت اسکی تپش و حرارت ہے۔ سورج ہمیں ہر لمحہ جو توانائی اور حرارت فراہم کر رہا ہے اسے اعداد و شمار کے حساب میں لانا ناممکن ہے لہٰذا علماء فلکیات اسے ایک مثال سے ہمارے سمجھنے کے لئے بیان کرتے ہیں کہ اگر پوری زمین کے برابر کوئلہ کا ایک ذخیرہ موجود ہو اور اسے ہم زمین کو حرارت فراہم کرنے کیلئے جلائیں تو وہ ۳۶ گھنٹے سے

زیادہ حرارت نہیں دے سکتے جبکہ سورج ہر سیکنڈ میں زمین کے ایک مربع سینٹی میٹر کو ۶۲ ارب انرجی دے رہا ہے ماہرین فلکیات کے مطابق سورج کے اوپر حرارت ۶ ہزار سینٹی گریڈ ہے۔ سورج سے جو حرارت انسان حاصل کر رہے ہیں اگر اسے رائج بجلی کی لاگت سے موازنہ کیا جائے تو ہر گھنٹہ کی قیمت ۱۷ ہزار ملین ڈالر بنے گی۔ اسی طرح اگر ہم سورج کی روشنی سے مستغنی ہونا چاہیں اور اسے مصنوعی طریقے سے پورا کرنا چاہیں تو ہمیں زمین پر بسنے والے انسانوں کیلئے دس ملین ۱۰۰ واٹ کے لیمپ روشن کریں تو یہ سورج کی روشنی کے برابر ہوگا۔

خداوند متعال نے سورج کی افادیت میں نور اور حرارت دونوں کو قرار دیا ہے۔ فرمایا ہم نے اسے سراج اور وھاج قرار دیا یعنی ایسا چراغ ہے جس میں نور اور حرارت دونوں موجود ہیں۔ اگر خدا کا یہ آسمانی چراغ اپنا کام چھوڑ دے تو کرہ زمین کو ایک خوفناک تاریکی اور سردی اپنی لپیٹ میں لے گی اگر سورج نہ ہوتا تو کرہ زمین پر زندگی کا وجود نہ ہوتا۔ لہٰذا خداوند متعال نے اسے اپنی واضح و آشکار نشانی کے طور پر متعارف کروایا ہے۔

۱۔ حرکت: اللہ تبارک وتعالیٰ نے منظومۂ شمسی میں موجود تمام ستاروں کو مستقل یا کسی دوسرے ستارے سے مربوط حرکت میں رکھا ہے ہر ستارے کی حرکت سے جو نتائج اور فوائد برآمد ہوتے ہیں ان میں سورج کا اپنا حصہ ہے۔

۲۔ سورج کے زمین سے قُرب وبُعد کی وجہ سے چار فصلیں پیدا ہوتی ہیں اور تمام سبزی جات اور پھلوں کی پکائی کا دار و مدار بھی اسی پر ہوتا ہے۔

۳۔ جب سورج ہمارے سر کے اوپر سے دور ہو جاتا ہے تو ہوا میں برودت آجاتی ہے، زمین پر سردی چھا جاتی ہے اس وقت زمین کے اندر حرارت قوی ہو جاتی ہے اس میں ہلکا سا بخار پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے زمین میں موجود دانے شگافتہ ہو جاتے ہیں اور جب سورج پلٹ کر ہمارے سروں کے اوپر آجاتا ہے تو سردی ختم ہو جاتی ہے اور ہوا معتدل ہو جاتی ہے تو وہ چیزیں زمین سے

باہر نکل آتی ہیں جب ہوا گرم ہوگی تو یہ سورج کے اثر سے ہوگی اور اس سے فصلیں پک جائیں گی اس طریقے سے زراعت اپنے کمال تک پہنچتی ہے اور پھل دینے کا دور آجاتا ہے زمین کی روزانہ حرکت کی وجہ سے نباتات پر سورج کا اثر محسوس ہوتا ہے زراعت وہیں ہوتی ہے اور نباتات وہیں پر اُگتی ہیں جہاں سورج کی روشنی یا اُس کی حرارت پہنچتی ہو۔

۴۔ بعض سبزی جات اور پھل ایک ملک میں پیدا ہوتے ہیں لیکن دوسرے بہت سے ملکوں میں پیدا نہیں ہوتے۔ اس کا سبب گرمی اور سردی میں فرق ہے اور گرمی اور سردی کا فرق سورج کی حرکت سے مربوط ہے مثلاً کھجور گرم علاقوں میں پیدا ہوتی ہے لیکن سرد علاقوں میں نہیں ہوتی اسی طرح لیموں اور کیلا بھی سرد علاقوں میں نہیں ہوتا بالکل اسی طرح بعض حیوانات ایک علاقے یا ایک ملک میں ہوتے ہیں لیکن دوسرے علاقوں میں نہیں ہوتے جیسے ہاتھی اور شیر ہندوستان میں پیدا ہوتے ہیں لیکن جن ملکوں میں ہندوستان کی نسبت کم حرارت ہو وہاں یہ ناپید ہیں۔

سورج کے دیگر فوائد

سورج کے روشنی اور حرارت کے علاوہ اور بھی فوائد ہیں جنکا شمار زندگی کی اولین ضروریات میں ہوتا ہے جنکے بغیر ہم چند منٹ تک زندہ نہیں رہ سکتے۔ وہ پانی اور آکسیجن ہے سورج کی گرمی سے دریاؤں اور سمندروں سے بخارات اوپر اٹھتے ہیں اور بارش کا باعث بنتے ہیں اور ان سے چشمے اور نہریں جاری ہوتی ہیں زمین سرسبز و شاداب ہوتی ہے:

﴿والقمر قدرنٰه منازل حتی عاد کالعرجون القدیم﴾

''اور چاند، اس کیلئے ہم نے منزلیں مقرر کردی ہیں یہاں تک کہ اُن سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے'' (یٰسین/۳۹)

۶۔ سورج کی رفتار چاند سے زیادہ ہے:

﴿لاالشمس ینبغی لها ان تدرك القمر﴾ ''نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا

پکڑے" (یٰسین/۴۰)

سورج زمانے کی ماں ہے

سورج' زمین اور چاند تینوں مل کر زمانہ پیدا کرتے ہیں، ان میں سے ہر ایک زمان کی تخلیق میں جداگانہ کردار رکھتا ہے لیکن زمین اور اسکا فرزند چاند دونوں سورج کے تابع ہیں اس سے یہ دونوں زندہ ہیں ان دونوں کے ثمرات کی برگشت اُسی کی طرف ہے اس حوالے سے اسے زمانے کی ماں کہنے میں کوئی قباحت نظر نہیں آتی ہے۔ زمین کے اپنے مدار کے گرد گردش کرنے سے دن رات پیدا ہوتے ہیں اور چاند کے زمین کے گرد گردش سے مہینے پیدا ہوتے ہیں ان دونوں کے ملکر سورج کے گرد گردش سے سال بنتا ہے لہٰذا ہمیں ان تینوں کے بارے میں جداگانہ بحث کرنے کی ضرورت ہے۔

زمین

زمین جسے قرآن میں "ارض" کہا ہے یہ کلمہ چار سو اکسٹھ (۴۶۱) بار مفرد کی صورت میں آیا ہے لیکن کلمہ "ارض" ہمیشہ ہر چیز کے نیچے کیلئے استعمال ہو ہے یہ ہمیشہ قرآنِ کریم میں آسمان کے مقابل میں بیان ہوا ہے اس کیلئے دو اور الفاظ بھی استعمال ہوتے ہیں:

۱۔ ثریٰ: ثریٰ نم دار مٹی کو کہتے ہیں چونکہ زمین میں یہی قابل کاشت زراعت ہوتی ہے:

﴿له مافی سمٰوٰت ومافی الارض ومابینهما وماتحت الثریٰ﴾

"جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان کے درمیان اور جو کچھ زمین کی تہہ میں ہے سب کا وہی مالک ہے" (طٰہٰ/۶) اسی مناسبت سے مال کو ثروت کہتے ہیں۔

۲۔ غبریٰ: غبریٰ اٹھتے اور بیٹھتے وقت اڑنے والی دھول یعنی غبار کے معنوں میں آتا ہے اور غبار کو گرد اس لئے کہتے ہیں کہ زمین کو ذرات کی صورت میں منتشر کرتا ہے:

﴿ووجوه یومئذٍ علیها غبرة﴾ "اور کچھ چہرے اس روز خاک آلود ہوں گے" (عبس/۴۰) اسی

مناسبت سے بچنے والے یا پیچھے رہ جانے والوں کو غابر کہتے ہیں:

﴿فانجینه واهله الاامراته کانت من الغٰبرین﴾ ''چنانچہ ہم نے لوط اور ان کے گھر والوں کو نجات دی سوائے ان کی بیوی کے جو پیچھے رہ جانے والوں میں سے تھی'' (اعراف/۸۳)

زمین کی بہت سی خصوصیات ہیں ان میں سے ایک خصوصیت اسکا بے شمار خزائن کا حامل ہونا ہے، اسی طرح زمین ہمارے اعمال کو ریکارڈ بھی کرتی ہے:

﴿یومئذٍ تحدث اخبارها﴾ ''اس دن وہ اپنے حالات بیان کرے گی'' (زلزال/۴)

ہم فرزندانِ زمین کیلئے سورج اور چاند کی کیا کیا خدمات ہیں اور ہماری زندگی پر ان دونوں کی کیا اثرات ہیں:

علمِ ھیئت ِقدیم میں زمین کو ثابت و جامد اور سورج و چاند کو زمین کے گرد گردش کرنے کا تصور تھا جبکہ دورِ جدید میں زمین کو سورج کے گرد گردش کرنے والے قرار دیا ہے لیکن قرآنِ کریم نے پندرہ سو (۱۵۰۰) سال پہلے سورج اور زمین دونوں کی گردش کی طرف خبر دی ہے جیسا کہ سورۂ یٰسین ۳۸ تا ۴۰ میں فرمایا ہے کہ یہ دونوں گردش میں ہیں:

﴿والشمس تجری لمستقرٍ لها۔ والقمر قدّرنٰه منازل حتی عاد کالعرجون القدیم۔ لاالشمس ینبغی لهاان تدرك القمر﴾ ''اور سورج اپنے مقررہ ٹھکانے کی طرف چلا جارہا ہے، اور چاند، اس کیلئے ہم نے منزلیں مقرر کردی ہیں یہاں تک کہ اُن سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے، نہ سورج کے بس میں ہے کہ وہ چاند کو جا پکڑے''

زمین اپنے مدار میں چوبیس گھنٹے میں ایک چکر پورا کرتی ہے اس سے شب و روز وجود میں آتے ہیں زمین کی گردش کے وقت اس کا ایک حصہ سورج کی طرف ہوتا ہے۔ جہاں دن ہوتا ہے اور دوسرا رُخ سورج کے مخالف میں ہوتا ہے جہاں رات ہوتی ہے۔

زمین نظام شمسی میں سورج کے گرد گردش کرنے والا وہ سیارہ ہے جسے تمام سیارات پر فخر و امتیاز

حاصل ہے کیونکہ یہ اشرف المخلوقات یعنی انسان کی ماں ہے۔ زمین کبھی تو انسان کو اپنے دامن میں پالتی ہے اور کبھی اسے اپنے پیٹ میں تحفظ دیتی ہے۔ یہ وہ صفت ہے جس سے دوسرے تمام سیارے اس سے محروم ہیں یہ زمین ہی ہے جسے سورج جیسا چراغ حاصل ہے۔ کہنے کو تو بہت سے لوگ اس زمین کے مالک اور بادشاہ بنے ہوئے ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے تمام انسان زمین کی اولاد ہیں ان میں سے بعض تو اولاد صالح ہیں اور بعض ناخلف۔ لیکن زمین کا مالک کہلانے والوں کو جلد ہی زمین نے اپنے اندر ہضم کر لیا یہ زمین وہ سیارہ ہے جس کی فضا زندگی سے بھرپور اور فرحت بخش وخوشگوار ہوا سے پر ہے، اس کے اندر قیمتی مال ودولت اور بے بہا خزائن پوشیدہ ہیں یہ زمین سورج سے ایک سو انچاس ملین پانچ لاکھ کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

زمین پر ہر جگہ سورج کی حرارت ایک جیسی نہیں ہوتی۔ خط استواء پر اسکی حرارت اپنی انتہا پر ہوتی ہے جبکہ اس وقت قطب شمالی وجنوبی میں اسکی حرارت گر جاتی ہے برف جم جاتی ہے۔ زمین کے محیط پر سورج کا نور جھکا ہوتا ہے۔ جب وہ خط استواء پر ہوتا ہے تو اس کا نور عمودی وستونی شکل میں نیچے آتا ہے وہاں اسکی حرارت انتہائی عروج پر ہوتی ہے۔ اس وقت قطب شمالی وجنوبی اور خط استواء کے درمیان حرارت مختلف ہوتی ہے۔ اس حرارت میں کمی بیشی کا دارومدار خط استواء یا قطب سے قربت کی مناسبت پر ہوتا ہے۔ اس حوالے سے حیات انسانی وحیوانی اور نباتاتی تینوں کے لیے مناسب ہوا ہر جگہ مختلف ہوتی ہے۔ ہر فصل حرارت کی مناسبت سے مناسب پھل دیتی ہے۔ یہاں دن رات کے لمبا اور کوتاہ ہونے کو بھی مدنظر رکھا جاتا ہے۔

زمین کی شکل کروی ہے:

اس دور میں زمین کی شکل کا کروی ہونا بدیہات میں شمار ہوتا ہے۔ اس کے لئے دلیل وبرہان قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔ زمین کی حرکت دو قسم کی ہے۔

۱۔زمین کی اپنے گرد حرکت

۲۔زمین کی سورج کے گرد حرکت

زمین چوبیس گھنٹوں میں اپنے گرد حرکت کا ایک دورانیہ مکمل کرتی ہے۔اسے یوم ارضی کہتے ہیں۔ اس حرکت میں زمین ایک ہزار چھ سو چوہتر کلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے خط استواء پر چلتی ہے۔زمین کی اپنے گرد چوبیں گھنٹوں کی حرکت سے دن رات پیدا ہوتے ہیں جیسے: نباء ۱۰،۱۱، یونس ۶۷ اور فرقان ۴۷۔زمین کی اپنے گرد گردش سے دن رات کا پیدا ہونا اس بات کی دلیل ہے زمین کی شکل کروی ہے۔سورۂ زمر ۵، اعراف ۵۴، فرقان ۴۵ میں زمین کے کروی (گول) ہونے کا ذکر ہے:

﴿خلق السمٰوٰت والارض بالحق یکورالیل علی النھارویکورالنھارعلی الیل﴾ ''اسی نے آسمانوں اور زمین کو برحق پیدا کیا ہے وہی رات دن پر لپیٹتا ہے اور دن کو رات پر لپیٹتا ہے''

معرفت وقت: روئے زمین پر وقت معلوم کرنے کی خاطر طولی خط کو تین سو ساٹھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔یہ خط ایک قطب سے دوسرے قطب تک کھینچا گیا ہے۔

زمین کی سورج کے گرد گردش

اس حرکت کو حرکت انتقالی کہتے ہیں۔اس حرکت میں زمین نو سو چالیس ملین کلومیٹر کا فاصلہ 365.14 دن میں مکمل کرتی ہے۔اس حرکت میں زمین جس مدار میں حرکت کرتی ہے وہ انڈے کی شکل میں ہوتا ہے۔سورج کے گرد گردش کرتے وقت زمین کی رفتار متغیر ہوتی ہے یہ گہرائیوں میں تیز اور اونچائیوں پر آہستہ چلتی ہے۔زمین اپنے مدار میں مغرب سے مشرق کی طرف چلتی ہے۔

زمین کی دوسری حرکت زمین کا سورج کے گرد ایک چکر پورا کرنا جس میں بارہ مہینے لگتے ہیں اسی طرح زمین بارہ مہینوں کی گردش اپنی جگہ چار حصوں (موسموں) میں تقسیم ہوتی ہے خریف، شتا، ربیع، سیف۔ہر فصل کیلئے آسمان میں اپنا ایک ستارہ ہوتا ہے اور ہر ایک نقطے پر ایک برج فلکی ہوتا ہے۔

قمر:

کسی چیز میں موجود سفیدی کو قمر کہتے ہیں چاند میں موجود سفیدی کی وجہ سے ہی اسے قمر کہا جاتا ہے جیسے حمار القمر یعنی سفید گدھا یاتقمر ته چاندرات کو آیا۔ لفظ قمار بھی اسی مادے سے ہی ماخوذ ہے قمار یعنی جوا کھیلنے والا۔ یہاں ایک لطیف بات ہے کہ زمانہ جاہلیت میں بھی جوا کھیلنا ایک قبیح عمل سمجھا جاتا تھا اسی لئے وہ چاندرات میں جوا کھیلتے تھے۔

چاند ہم سے ۳ لاکھ چوراسی ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر ہے:

چاند کے فوائد:

۱۔ مدوجزر: اس سے کبھی تو دریاؤں میں رجحان آتا ہے اور کبھی دریاؤں کا پانی گر جاتا ہے دریا کبھی ایک حالت پر نہیں رہتا یہ سب چاند کی روشنائی میں کمی بیشی سے ہی ہوتا ہے۔

۲۔ حیوانات کے جسم: حیوانات کے جسموں کا چاند کی روشنائی میں کمی بیشی سے گہرا ربط ہوتا ہے جب چاند کی روشنائی بڑھ جاتی ہے تو حیوانات کے بدن قوی اور گرم ہو جاتے ہیں اور روشنائی کم ہونے سے اُن کے بدن ٹھنڈے اور ضعیف وناتواں ہو جاتے ہیں جب چاند کی روشنائی بڑھتی ہے توانکے بدن کی ظاہری رطوبت بڑھ جاتی ہے، اُس کا حُسن زیادہ ہو جاتا ہے اور جب چاند کی روشنائی کم ہو جاتی ہے تو رطوبت بدن کے اندر چلے جانے سے حُسن ماند پڑ جاتا ہے۔

چاند کی روشنائی بڑھنے سے زیادہ بال اُگتے ہیں اور تیزی سے بڑھنے لگتے ہیں اور چاند کی روشنائی کم ہونے سے بال اُگنے میں کمی آجاتی ہے۔

مہینے کی اول سے آخر تک جب چاند کا نور اور روشنائی بڑھ رہی ہوتی ہے تو حیوان زیادہ دودھ دیتے ہیں اسی طرح جب چاند کی روشنائی کم ہو رہی ہو تو اُن کے دودھ میں کمی آنے کے ساتھ انکے بند بھی ست پڑ جاتے ہیں۔

۳۔ چاند سورج کا تابع ہے:

﴿والشمس وضحھا۔ والقمر اذا تلھا﴾ ''سورج اور اس کی دھوپ کی قسم، اور چاند کی قسم جب وہ اس کے پیچھے آتا ہے'' (شمس/۱،۲)

مہینوں کا تعین چاند کی گردش سے ہوتا ہے

﴿ان عدة الشھور عنداللہ اثناعشر شھراً فی کتب اللہ﴾ ''کتاب خدا میں مہینوں کی تعداد اللہ کے نزدیک یقیناً بارہ مہینے ہے'' (توبہ/۳۶)

﴿یسئلونك عن الاھلة قل ھی مواقیت للناس والحج﴾

''لوگ آپ سے چاند کے (گھٹنے بڑھتے کے) بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجئے: یہ لوگوں کے لئے اور حج کے اوقات کے تعین کا ذریعہ ہیں'' (بقرہ/۱۸۹) ہمیں معلوم ہے اس کائنات میں زمین ہے، چاند، سورج اور ستارے ہیں۔ چونکہ یہ چیزیں ہمارے مشاہدے میں آتی ہیں اس لئے ہم کہتے ہیں یہ سب کائنات کا حصہ ہیں لیکن ان کے علاوہ بے شمار مجرے اور ستارے اور بھی موجود ہیں، لہذا کائنات میں تنہا یہی ایک سورج نہیں جو ہمیں دکھائی دیتا ہے بلکہ کئی سورج ہیں جو دور ہونے کی وجہ سے ہمیں دکھائی نہیں دیتے۔ غرض اگر ہم اسی سورج کا مشاہدہ کریں جو ہمیں دکھائی دے رہا ہے تو حیران کن صورت حال سامنے آتی ہے۔ بجلی کے ایک بلب کو روشن کرنے کیلئے جنریٹر یا بجلی گھر اور تاروں اور کئی قسم کے اسباب درکار ہوتے ہیں اور اس مشینری کو چلانے اسے نصب کرنے کیلئے ہزاروں لوگ حرکت میں ہوتے ہیں تب جا کر کہیں یہ چھوٹا سا قمقمہ روشن ہوتا ہے لیکن سورج کے اس نور کو اللہ تبارک وتعالی نے ضیاء کہا ہے ضیاء اس نور کو کہتے ہیں جس میں نور کے ساتھ حرارت بھی ہو کیونکہ چاند میں نور تو ہے لیکن حرارت نہیں یہی وجہ ہے آپ چاند کی روشنی میں بیٹھتے ہیں تو سائے کے محتاج نہیں لیکن سورج کی روشنی میں سائے کے محتاج ہوتے ہیں چاند وسورج وہ ستارے ہیں جو ہمارے لئے وقت کے ناپ تول کا ذریعہ ہیں زمانے کے مختلف حالات اور مختلف شکلیں ہیں لہذا اس

کی پیائش کیلئے مختلف موازین درکار ہیں ہمارے پاس ایک زمانہ دن رات ہے، صبح صادق وصبح کاذب ہے ظہر وعصر ہے اوراسی طرح عشاء ومغرب ہے یہ تمام اوقات سورج سے متعلق ہیں۔
مہینوں کے حساب کیلئے سورج کو اگر معیار قرار دیا جائے تو یہ معلوم نہیں ہوسکے گا کہ یہ مہینے کی ابتداء ہے یا وسط وانتہا ہے جبکہ اگر چاند کو معیار بنائیں تو یہ اشکال نہیں آتا اگر چاند ہلال کی صورت میں ہو تو اسکا مطلب ہے مہینہ کی ابتداء ہے اگر بدر کی صورت میں ہو تو مہینہ کا وسط ہے اور اسکے غروب ہونے سے پتہ چلتا ہے یہ مہینہ کا آخری حصہ ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلق کرنے سے پہلے اس کائنات کو آراستہ کیا ہے دنیا میں زمانے کے حساب کیلئے دقیق ترین ذریعہ قمری ہے دریا و خشکی دونوں کی مخلوق چاند سے مربوط ہے سورج کی نسبت چاند کے حساب سے جو سال بنتا ہے وہ گیارہ دن آٹھ گھنٹے کم ہوتا ہے اور ہر سال اس فرق کے نتیجے میں ہر ۳۳ سال بعد رمضان المبارک اپنی پہلی گردش پر آجاتا ہے۔قمری طریقہ سے روئے زمین پر بسنے والے مسلمانوں کیلئے حج کا مناسب موسم پیدا ہوتا ہے اسی طرح سورج روزانہ طلوع ہوتا ہے تو خداوند عالم نے نماز کو سورج سے مربوط کیا ہے اور اس وجہ سے ہم چوبیس گھنٹوں میں نماز کے اوقات کا تعین کرسکتے ہیں جبکہ چاند سے نماز کے اوقات کا تعین نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ایام محاق میں چاند کو نہیں دیکھ سکتے۔اس لئے اگر نماز کو چاند سے مربوط کیا جاتا تو بہت سی نمازیں چھوٹ جاتیں کیونکہ پورے ماہ میں چاند پر فرق پڑتا ہے جبکہ سورج کے طلوع ہونے سے دن کا آغاز ہوتا ہے اور اسے دیکھنے کیلئے کسی مشقت و باریک بینی کی ضرورت نہیں ہوتی۔نماز ارکان دین میں سے ہے جو کبھی ساقط نہیں ہوسکتی۔اس لئے خداوند متعال نے اسے سورج سے مربوط کیا ہے اس طرح پوری کائنات میں ہر لحہ خدا کی عبادت کی جاتی ہے۔

چاند کے مہینوں میں فرق:

چاند زمین کے گرد گردش میں سورج کے مقابل میں انتیس (۲۹) دن بارہ (۱۲) گھنٹے چوالیس

(۴۴) منٹ لیتا ہے چونکہ یہ حساب اتنی دقیق صورت میں ہے کہ ہر شخص کیلئے میسر نہیں کہ وہ مہینے کی ابتداء اور انتہا کو معلوم کریں تو اہل تقویم نے ایک مہینہ انتیس (۲۹) دن اور ایک مہینہ تیس (۳۰) دن کا قرار دیا ہے۔

چاند کے مہینے کبھی ۲۹ اور کبھی ۳۰ دن کے ہوتے ہیں تین مہینے متصل ۲۹ دن کے بھی ہوتے ہیں چاند جب نکلتا ہے تو دھاگے کی مانند ہوتا ہے پھر بڑھ کر افق پر نمودار ہوتا ہے ہر دن چالیس سے پچاس منٹ دیر سے نکلتا ہے یہاں تک کہ ۱۵ تاریخ کو مکمل ہوتا ہے مشرق سے نکلتا ہے اور یہ سورج کے غروب ہونے کے موقع پر پیدا ہوتا ہے پھر ہر دن دیر سے طلوع ہوتا ہے اور کم ہوتا جاتا ہے مہینے کی آخر میں پھر دھاگے کی مانند ہو جاتا ہے۔

پھر ایک یا دو دن نظروں سے غائب ہو جاتا ہے اس کے ظہور میں کم یا زیادہ ہونے اور غائب ہونے سے چاند کے مہینے کے اول و آخر دنوں کا پتہ چلتا ہے۔ اسی پر شریعت میں اعمال و عبادات مرتب ہوتے ہیں:

اور سورۂ رحمٰن میں فرماتے ہیں کہ سورج اور چاند دونوں سے زمانہ پیدا ہوتا ہے زمین کی گردش کے بارے میں مندرجہ ذیل آیات ملاحظہ فرمائیں:

﴿الشمس والقمر بحسبانٍ﴾ ''سورج اور چاند (مقررہ) حساب کے تحت ہیں'' (رحمٰن/۵)

جبکہ سورۂ بقرہ آیت ۱۸۹ میں آیا ہے:

﴿قل ھی مواقیت للناس والحج﴾

''کہہ دیجئے: یہ لوگوں کیلئے اور حج کے اوقات کے تعین کا ذریعہ ہیں''

﴿فمن شھد منکم الشھر فلیصمہ﴾ ''لہٰذا جو شخص اس مہینہ (رمضان) میں حاضر رہے اس کا فرض ہے کہ وہ روزہ رکھے'' (بقرہ/۱۸۵) بقرہ ۱۸۹

﴿ان ربکم اللہ الذی خلق السمٰوٰت والارض فی ستۃ ایام﴾ ''یقیناً تمہارا رب وہ اللہ ہے جس

نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا'' (یونس/۳)

منازل قمر

چاند زمین کے گرد گردش کرتے ہوئے بہت سی منازل سے گذرتا ہے۔ سورہ یٰسین ۳۹:

﴿والقمر قدرنہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم﴾ ''اور چاند، اس کیلئے ہم نے منزلیں مقرر کر دی ہیں یہاں تک کہ اُن سے گزرتا ہوا وہ پھر کھجور کی سوکھی شاخ کے مانند رہ جاتا ہے''

﴿والقمر نوراً وقدرہ منازل لتعلموا عدد السنین والحساب﴾ ''اور چاند کو چمک دی اور اس کی منزلیں بنائیں تا کہ تم برسوں کی تعداد اور حساب معلوم کر سکو'' (یونس/۵)

۱۔ منزل : برج حمل......منطقہ نجم سرطان

۲۔ منزل : برج حمل......منطقہ بطین

۳۔ منزل : برج ثور......منطقہ نجم ثریا

۴۔ منزل: برج ثور......منطقہ نجم دبران

۵۔ منزل: کولبۃ الجبار......منطقہ ھقعہ

۶۔ منزل: برج توامین......منطقہ نجم ھنعہ

۷۔ منزل: برج توامین......منطقہ نجم مرزم ذراع مقبوضہ

۸۔ منزل: برج سرطان......منطقہ نجم نثر

۹۔ منزل: برج سرطان منطقہ نجم اسد

۱۰۔ منزل: برج اسد......منطقہ نجم رقبہ

۱۱۔ منزل: برج اسد......منطقہ نجم زبرہ

۱۲۔ منزل: برج اسد......منطقہ نجم صرفہ

۱۳۔ منزل: برج عذراء...... منطقۂ نجم العوا

۱۴۔ منزل: عذراء...... منطقۂ نجم اعزل

۱۵۔ منزل: برج عذراء...... منطقۂ نجم خفر

۱۶۔ منزل: برج میزان...... منطقۂ نجم عقرب

۱۷۔ منزل: برج عقرب...... منطقۂ نجم کلیل

۱۸۔ منزل: برج عقرب...... منطقۂ نجم قلب

۱۹۔ منزل: برج عقرب...... منطقۂ نجم شولہ

۲۰۔ منزل: برج قوس...... منطقۂ نجم نعائم

۲۱۔ منزل: برج قوس...... منطقۂ نجم قلادہ

۲۲۔ منزل: برج قوس...... منطقۂ نجم سعد ذابح

۲۳۔ منزل: برج قوس...... منطقۂ نجم سعد بلع

۲۴۔ منزل: برج قوس...... منطقۂ نجم سعود

۲۵۔ منزل: برج قوس...... منطقۂ نجم اخبیہ

۲۶۔ منزل: برج قوس...... منطقۂ نجم فرغ

۲۷۔ منزل: برج قوس...... منطقۂ نجم منکب فرس

۲۸۔ منزل: برج قوس...... منطقۂ نجم حوت

چاند مذکورہ بالا اٹھائیس (۲۸) منزل سے گزرتا ہے اگر مہینہ تیس دن کا ہے تو دو دن محاق میں رہتا ہے اگر انتیس (۲۹) دن کا ہے تو ایک دین محاق میں رہتا ہے اس وقت انتہائی باریک زرد اور قوس کی شکل میں کھجور کی سوکھی شاخ کی مانند نظروں میں آتا ہے۔

﴿وجمع الشمس والقمر﴾ ''اور سورج چاند ملا کر ایک کر دیے جائیں گے'' (قیامت/۹)

﴿الشمس والقمر بحسبان﴾ ''سورج اور چاند (مقررہ) حساب کے تحت ہیں'' (رحمٰن/۵) یونس ۵، انعام ۹۶۔ ان تین آیات میں خداوند متعال نے سورج اور چاند کو ہماری زندگی کے اوقات اور زمانے کی کم و کیفیت کی طرف نسبت دی ہے۔ علماء فلکیات کے مطابق چاند اپنے محور کے ساتھ ساتھ زمین کے گرد بھی گردش کرتا ہے اور ایک ماہ میں اپنا چکر پورا کرتا ہے۔ اس وقت سورج کی شعائیں اس کے نصف حصہ پر پڑتی ہیں جبکہ باقی حصہ تاریک رہتا ہے۔ جو حصہ سورج کے سامنے ہے وہ مہینہ کے آخر میں محاق میں جاتا ہے اس وقت ہم چاند کو نہیں دیکھ سکتے۔ یہ وہ وقت ہے جب چاند زمین اور سورج کے درمیان ہوتا ہے۔ پھر یہ آہستہ آہستہ اوپر کی طرف نکلنا شروع ہوتا ہے اور ہمیں اس کا کچھ حصہ دکھائی دینے لگتا ہے اس وقت یہ حلال کی صورت میں ہوتا ہے۔ پھر یہ اور بڑھتا ہے اور اسے ہم بدر کی صورت میں دیکھتے ہیں اس وقت زمین سورج اور چاند کے درمیان میں ہوتی ہے اس وقت اس کا روشن چہرہ ہماری طرف ہوتا ہے۔

زمان: دن رات کی حرکت کا نام زمانہ ہے زمین اپنے گرد ایک رات اور ایک دن میں گردش پوری کرتی ہے اس طرح سورج کے گرد حرکت پوری کرنے سے سال بنتا ہے۔ دن اور رات خداوند عالم کی دو نشانیاں ہیں رات کے ذریعہ دن کی روشنی کو مٹایا اور دن کو دیکھنے کے قابل بنایا تاکہ انسان اپنے کسب و معاش میں نکلیں۔ دن رات کے اختلاف سے سالوں مہینوں اور دنوں کا حساب سمجھ سکتے ہیں۔ زمانے کی اکائی زمین کی اپنے اور سورج کے گرد حرکت سے بنتی ہے۔ شمسی سال کا تعین زمین کا سورج کے گرد ایک پورا چکر لگانے سے ہوتا ہے جو کہ تین سو پینسٹھ (۳۶۵) دن میں مکمل ہوتا ہے جبکہ عطارد سیارہ جو کہ سب سے نزدیک ہے اٹھاسی (۸۸) دن میں اپنا ایک چکر پورا کرتا ہے اور پلوٹو جو سب سے دور کا سیارہ ہے جس کی رفتار سب سے کم ہے اس کی گردش سورج کے گرد دو سو پچاس (۲۵۰) سال میں پوری ہوتی ہے۔

سورج اپنے نور اور روشنی سے ہماری معاونت کرتا ہے جس کی وجہ سے ہم دن میں اپنے کسب معیشت کا بندوبست کرتے ہیں، اس میں حرارت ومفید قسم کی شعائیں ہیں جو ہماری زراعت کو نمو بخشتی ہیں اور پھلوں کو پکانے میں معاون ہیں۔

چاند جس کی خداوند عالم نے منازل معین کی ہیں یہ ہر دن ایک منزل طے کرتے ہوئے زمین کے گرد گردش کرتا ہے جس کا مدار سورج وزمین کے درمیان ہے، ایک مہینے میں اس کی مختلف شکلیں تبدیل ہوتی ہیں جس سے مہینے اور دن کا پتہ لگاتے ہیں اور اس سے روزے، حج اور عبادات وغیرہ کے اوقات معلوم کرتے ہیں سورج وچاند میں زمین پر زندگی گزارنے والوں کیلئے کثیر منافع ہیں جو کہ خدا کی نشانی نعمت اور فضل وکرم ہے۔ سورج اور چاند مستقل حرکت میں ہیں اور یہ ایک خاص مدار سے نکلتے نہ گذشتہ زمان میں اس میں کوئی تغیر آیا ہے اور نہ حال میں کوئی تبدیلی دیکھنے میں آتی ہے یہ ہمیشہ اسباب زندگی کو فراہم کرتے ہیں، درحقیقت خدا نے انھیں مسخر کیا ہے۔ سورہ ابراہیم کی آیت ۳۳ میں آیا ہے کہ وہ ہمیشہ بدستور دقیق اندازے میں طلوع وغروب کرتے ہیں:

﴿وسخرلکم الشمس والقمر دآئبین﴾ ''سورج اور چاند کو تمہارے لئے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جارہے ہیں''

خداوند متعال نے زمان کو عام انسانوں کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر عام وخاص کیلئے ایک سادہ محسوس شناخت کے ذریعے وضع کیا ہے۔

۱۔ دن ورات: دن ورات گرچہ زمین کے گردش سے پیدا ہوتے ہیں لیکن انکا حساب سورج کے طلوع وغروب سے وابستہ ہے پانچ وقت کی نماز بھی سورج کی طلوع وغروب سے مربوط ہے۔

۲۔ مہینے: اجتماعی، سیاسی اور بعض دینی عبادات چاند سے وابستہ ہیں چاند ہی وہ واحد پہچان ہے جسے ہر خاص وعام ان پڑھ، پڑھے لکھے درک کرسکتے ہیں کہ مہینے کا آغاز اور اختتام کب ہوتا ہے لہذا شریعت نے مہینے کو چاند سے مربوط کیا ہے۔

۳۔ موسم: گرمی، سردی زمین سے وابستہ ہے زمین اپنی حرکت وضعی اورانتقالی کے ساتھ (۲۳.۵) اپنی گردش میں جھکاؤ رکھتا ہے جس سے وہ قطب شمالی، جنوبی اور خط استوا سے قرب وبعد پیدا ہوتا ہے اس سے زمین پر سورج کی حرارت پر فرق پڑتا ہے یہاں سے اہل زمین کیلئے سال بھر میں موسم بدلتے رہتے ہیں اسکی چار فصل بنتی ہیں چنانچہ اسی کو ملحوظ نظر رکھتے ہوئے پیداوار کیلئے تقسیم بندی کی جاتی ہے۔

غرض زمان کی تینوں صورتیں منظومہ شمسی کے تینوں سیاروں سے وابستہ ہیں جو ایک دوسرے سے بے نیاز نہیں ہیں۔

اگر ہم اصحاب کہف کی مدت قیام کو چاند کے حساب سے معلوم کرنا چاہیں تو یہ مدت تین سو نو سال بنتی ہے چنانچہ یہود نے ختمی مرتبتؐ سے سوال کیا یہ تین سو سال سمجھ میں آ گئے لیکن یہ تین سو نو سال کیسے بنتے ہیں تو پیغمبر اکرمؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا شمسی حساب سے تین سو سال اور قمری حساب سے تین سو نو سال ہی بنتے ہیں۔ دین اسلام میں حکمت قرآن کے تحت مہینوں کو چاند سے مربوط کیا گیا ہے اگر حج کے مہینے کو سورج سے مربوط کیا جاتا تو یہ ایک ہی موسم میں آتا، اگر گرمی میں ہوتا تو سرد علاقوں کے لوگوں کیلئے مشکلات پیدا ہوتی اور اگر سردیوں میں ہوتا تو گرم علاقوں کیلئے مشکلات ہوتی۔ لیکن چاند سے مربوط ہونے کی وجہ سے حج ہر موسم میں آتا ہے اور یوں ہر علاقے کے رہنے والے اسے برداشت کر لیتے ہیں۔ اسی طرح اگر شعائر اسلام نماز، روزہ وحج کو اگر شمسی وقمری دونوں سے مربوط کیا جاتا تو عجیب تضاد پیدا ہوتا مثلاً اذان کو ہی لے لیں۔

﴿والشمس والقمر حسبانا﴾

''اسی نے چاند اور سورج کے طلوع وغروب کا حساب مقرر کیا'' (انعام/۹۶)

﴿الشمس والقمر بحسبان﴾ ''سورج اور چاند ایک حساب کے پابند ہیں'' (رحمن/۵)

۴۔ سورج اور چاند دونوں ہمارے حساب کیلئے ہیں:

﴿یسئلونك عن الاھلة قل ھی مواقیت للناس والحج﴾

''لوگ آپ سے چاند کے (گھٹنے اور بڑھنے کے) بارے میں پوچھتے ہیں کہہ دیجئے: یہ لوگوں کیلئے اور حج کے اوقات کے تعین کا ذریعہ ہیں'' (بقرہ/۱۸۹) نساء/۱۵۳، توبہ/۳۶، اسراء/۷۸

۵۔ سورج تعین اوقات نماز ہے:

﴿اقم الصلوۃ لدلوك الشمس الی غسق الیل وقران الفجر﴾ ''آپ زوال آفتاب سے رات کی تاریکی تک نماز قائم کریں اور نماز صبح بھی کہ نماز صبح کیلئے گواہی کا انتظام کیا گیا ہے'' (اسراء/۷۸)

منظومہ شمسی: ہماری منظومہ شمسی مجرح تبانہ کا ایک حصہ ہے یہ اپنی جگہ نو سیاروں اور ۵۳ چاندوں سمیت سورج کے گرد گردش کرتے ہیں ذیل میں ہم ہر ایک سیارے اور اس کے سورج کے ساتھ فاصلہ کا ذکر کریں گے۔

۱۔ عطارد: یہ سورج سے متوسط فاصلے پر واقع ہے یہ ۳۶ ملین میل کے فاصلے پر ہے یہ ۸۸ دن میں سورج کے گرد گردش پورا کرتا ہے اس کا کوئی چاند نہیں ہے یہ چاند سے بھی چھوٹا سیارہ ہے اس کی اپنے گرد کی گردش اور سورج کے گرد گردش ایک ہی ہے۔

۲۔ زہرہ: اس کا بھی چاند نہیں ہے اور سورج سے متوسط فاصلے پر واقع ہے۔ سورج سے ۲.۶۷ ملین فاصلہ پر ہے یہ ۲۲۵ دن میں اپنا دورہ مکمل کرتا ہے یہ حجم اور کثافت کے حوالے سے زمین کے برابر ہے

۳۔ مریخ: یہ بھی سورج سے متوسط فاصلے ۱۴۱ ملین میل دور ہے وہ ۶۸۷ دن میں سورج کے گرد اپنا دورہ مکمل کرتا ہے مریخ کے دو چاند ہے۔

۴۔ مشتری: مشتری بھی سورج سے ۴۹۳ ملین میل کے فاصلے پر ہے وہ اپنا دورہ ۱۱ سال ۹ مہینے میں مکمل کرتا ہے مشتری منظومہ شمسی میں سب سے بڑا سیارہ ہے اسکے لیے ۱۶ چاند کشف کیے ہیں۔

۵۔ زحل: یہ بھی سورج سے ۸۸۶ میل کے فاصلے پر ہے یہ اپنا دورہ ۲۹.۵ سال میں پورا کرتا ہے

یہ حجم کے لحاظ سے مشتری کے بعد بڑا سیارہ ہے اس کے لئے علماء نے ۲۰ چاند کشف کیے ہیں

۶۔ اورانس: اورانس بھی سورج سے ۲۸۳۷ملین میل کے فاصلے پر ہے وہ ۸۴ سال میں سورج کے گرد اپنا دورہ پورا کرتا ہے اس کے ۱۵ چاند ہیں۔

۷۔ پلٹون: تقریباً ۱۴۴ سال قبل کشف ہوا ہے یہ سب سے جمیل وحسین زرد رنگ کا سیارہ ہے۔ یہ سورج سے ۴۵۰۰ملین میل کے فاصلے پر ہے زمین کے ۳۰ برابر گنا ہے یہ ۱۶۵ سال میں ایک دورہ مکمل کرتا ہے اس کے ۱۸ چاند ہیں سب سے بڑے چاند کو ترایتون کہتے ہیں۔

۸۔ پلوٹو: یہ سورج سے ۳۶۶۶ملین میل کے فاصلے پر واقع ہے یہ اپنا دورہ ۲۴۸ سال میں مکمل کرتا ہے یہ سب سے چھوٹا سیارہ ہے ابھی تک یہ ایک معمہ ہے یہ سورج کے گرد سب سے طویل مدارات پر چلنے والا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور جھوٹ:

جس نبی کی شان میں قرآن کریم نے فرمایا ابراہیمؑ صدیق تھے اس کے بارے میں تورات میں لکھا ہے جب حضرت ابراہیمؑ مصر میں داخل ہوئے تو چونکہ سارہ ایک حسن جمال کی مالک تھی لہذا حاکم مصر کی نظر سے بچانے کیلئے اپنی بیوی سے یہ کہا اگر تم سے میرے بارے میں پوچھے تو کہنا یہ میرا بھائی ہے اور میں کہوں گا یہ میری بہن ہے حضرت ابراہیمؑ نے خود جھوٹ بولا اور بیوی کو بھی جھوٹ بولنے کی دعوت دی ہے۔

پیغمبر اسلامؐ سے ایک روایت منسوب کی جاتی ہے کہ آپؐ نے فرمایا حضرت ابراہیمؑ نے اپنے دور نبوت میں تین جھوٹ بولے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ جب ابراہیم خلیلؑ نے بت خانے میں جا کر تمام بتوں کو توڑا اور کلہاڑی کو بڑے بت کے گلے

میں ڈال کر بت خانے سے نکل آئے تو لوگوں نے انھیں بلا کر پوچھا آپ نے ہمارے بتوں کو توڑا ہے تو آپؑ نے فرمایا میں نے یہ کام نہیں کیا بلکہ ان کے بڑے نے ایسا کیا ہوگا جبکہ بتوں کو تو آپ ہی نے توڑا تھا اس طرح آپؑ کا یہ کہنا "اس بڑے بت نے دوسرے بتوں کو توڑا ہوگا" یہ جھوٹ ہے۔

۲۔ جب قوم میلے میں جارہی تھی تو انھوں نے حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام سے کہا آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں تو حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کی طرف دیکھ کر فرمایا میں مریض ہوں جبکہ وہ مریض نہ تھے۔

۳۔ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام بابل سے نکل کر ارضِ کنعان اور وہاں سے آپؑ مصر کی طرف گئے تو آپؑ نے اپنی زوجہ سارہ سے کہا اگر یہ لوگ آپ سے پوچھیں آپ کون ہیں تو آپ جواب دیں میں ان کی بہن ہوں اور خود حضرت ابراہیمؑ نے بھی کہا کہ یہ میری بہن ہیں اسی طرح ایک اور موقع پر ارضِ "جرار" کے مالک سے بھی ایسا ہی کہا۔

اس طرح حضرت ابراہیمؑ نے تین جھوٹ بولے ہیں ہمارے ہاں ایک گروہ دین میں "دیدۂ دجالی" کا حامل ہے یعنی وہ دین کو صرف ایک آنکھ سے دیکھتے ہیں جیسے ان کی دوسری آنکھ بالکل اندھی ہو، شاید یہ لوگ اپنے کانوں کے سلسلہ میں بھی ایسے ہی ہوں یعنی ایک کان سے سنتے ہوں اور دوسرے سے بہرے ہوں ان لوگوں کی نظروں اور ان کے صفحۂ ذہن سے پیغمبر اسلام کی وہ مشہور و معروف حدیث غائب ہو جاتی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا میں تمہارے درمیان "دو گراں قدر چیزیں چھوڑے جارہا ہوں اور تم صرف اسی وقت گمراہی سے محفوظ رہ سکتے ہو جب تم ان دونوں سے تمسک رکھو، ان میں سے ایک وہ کتابِ خدا ہے جسے خود خداوند عالم نے لاریب کہا ہے اور دوسری سنتِ قطعیہ ہے" لیکن یہ لوگ نہ تو استدلال کیلئے اور نہ ہی روایات کی صحت و سقم کو جانچنے کے لئے قرآن سے تمسک کرتے ہیں گویا وہ صرف حدیث ہی کو سینے سے لگائے ہوئے ہیں جیسے ان

کے نزدیک حق و باطل میں تمیز کی یہی واحد اور قابل اعتماد کسوٹی ہے اس گروہ کے افراد جب یہ سنتے ہیں حدیث کے ضعیف اور جعلی ہونے کا خدشہ و احتمال رہتا ہے تو وہ فوراً بے قابو ہو جاتے ہیں اور کہتے ہیں اگر ایسا ہی ہے تو پھر آپ تمام حدیثوں کو پھینک دیں یعنی جب ان کے مطلب اور پسند کی حدیث ضعیف یا جعلی ہونے کی بنا پر مسترد ہو جائے تو حقائق کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی بجائے غصہ و ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

حدیث پیغمبر اکرم کی ہے اور پیغمبر عصمت کے مالک ہیں تو پھر کیوں وہ نبی جنھیں خدا نے اولی العزم پیغمبر کہا انھیں 'صدیق" ہے کیسے ممکن ہے وہ جھوٹ بولیں، چنانچہ جو لوگ حضرت ابراہیمؑ کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ انھوں نے تین جھوٹ بولے، اُن کی اس غلط سوچ و فکر اور غلط بیانی کی اصل وجہ انکا اسلام شناسی اور پیغمبر شناسی کے سلسلہ میں قرآن کریم کو بالکل اہمیت نہ دینا ہے بلکہ انھوں نے قرآن کو یکسر نظر انداز کیا ہے۔ انھوں نے جو دو آیات پیش کی ہیں ان میں پہلی آیت میں کسی بھی حوالے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جھوٹ بولنے کے بارے میں شائبہ تک نہیں ہوتا کیونکہ حضرت ابراہیمؑ نے فوراً قوم سے کہا 'بڑے بت نے کیا ہے اگر وہ بات کرے تو پوچھ لیں' یعنی تم جس بت کی پوجا کرتے ہو اور اُسے سب کچھ جانتے ہو اور مشکلات میں اسی کی طرف رجوع کرتے ہو اب جبکہ یہ مشکل بھی خود انھیں بتوں سے متعلق ہے تو تمھیں چاہیے کہ جب ان کا بڑا موجود ہے تو اسی سے پوچھو ان کے ساتھ یہ زیادتی کس نے کی ہے یہ ایک قسم کا طنز تھا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستوں سے کیا تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ نہیں کہا کہ میں نے یہ کام نہیں کیا ہے۔

جہاں تک دوسرے موقع کا تعلق ہے جب حضرت ابراہیمؑ نے میلے میں جانے سے انکار کے موقع پر ستاروں کی دیکھتے ہوئے فرمایا کہ میں مریض ہوں۔ (اس سلسلہ میں بعض کا کہنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اس وقت ایک طرح کے زکام اور کھانسی میں مبتلا تھے) یہاں ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس

زمانے کے لوگ جہاں ایک طرف بت پرستی میں غرق تھے وہاں وہ ستاروں کو بھی نفع ونقصان کا مالک سمجھتے تھے چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے انھیں انکے بتوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے ان کی بیوقوفی کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ میں روحانی طور پر بیمار ہوں میری روح مریض ہے۔

ابراہیمؑ سرزمین ملکِ جرار میں:

یہ علاقہ قارس اور شور میں واقعہ ہے شہر مصر سے عراق جائیں تو راستے میں ملکِ جرار نامی ایک آبادی ہے حضرت ابراہیمؑ جب یہاں پہنچے تو خوفزدہ ہوگئے یہاں کا بادشاہ ان کی زوجہ کی خاطر انہیں قتل کردے گا چنانچہ قتل سے بچنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے کہا یہ میری بہن ہے حضرت سارہ کی خوبصورتی کی وجہ سے بادشاہ نے انہیں جبری اٹھوالیا اور جب رات کو ان کے قریب جانا چاہا تو ایک بہت ہی خوفناک اور ڈراونا خواب دیکھا جس میں اسے کہا گیا تو اس عورت کی وجہ سے مر جائے گا۔
یہ قصہ تورات کا خودساختہ ہے جس کا قرآن کریم میں کوئی اشارہ تک نہیں ملتا اس قصہ کے خودساختہ ہونے کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ جب سارہ مصر میں تھیں تو ان کی عمر ستر سال تھی اور جس دور میں وہ سرزمین ابی مالک میں پہنچیں اس وقت ان کی عمر نوے سال تھی یہ ممکن نہیں وہ بادشاہ جو عیش نوش میں مستغرق ہو وہ کسی ایسی عورت سے عشق کرنے لگے جس کی عمر اسی نوے سال ہو گویا یہ قصہ انبیاء کے بارے میں تورات کے خوداساختہ قصص میں سے ہے جو انہوں نے نکاح محارم کو جائز قرار دینے کے لیے بنایا ہے اس قصے کے جھوٹے و من گھڑت ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے بادشاہ کو اس سے کیا فرق پڑتا ہے، کوئی عورت کسی کی بہن ہو یا بیوی، تیسری دلیل ابراہیمؑ کہ جنکے بارے میں اللہ تبارک نے فرمایا ہے ہم نے ان کو رشد و ہدایت اور عقل عطا کی ہے وہ ایسے ظالم و جابر حکمران کے شہر میں کیوں داخل ہوں جہاں ان کی عزت و ناموس کو خطرات سے دوچار ہونے اور ان کے قتل کا قوی امکان ہو۔

اس قصے کے خودساختہ ہونے کی چوتھی دلیل وہ بت شکن، نڈر وبیباک ابراھیمؑ جنہوں نے بت پرستی کو نیست و نابود کرنے کے لیے تاریخی مزاحمت و مقابلہ کی راہ اپنائی اور اس مزاحمت ومخالفت پر نارنمرود میں جانا گوارہ کرلیا۔ان کے لیے یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے وہ بغیر مزاحمت کے اپنی ناموس کو بادشاہ کے کارندوں کے ہاتھوں میں جانے دیں ان سوالوں کا جواب تکلفات اور مخدوش دلائل ہی سے دیا جاسکتا ہے گویا تمام دشمنان اسلام کے لیے ان سوالوں کا حقیقی سچا اور قابل قبول جواب دینا ممکن نہیں۔

قصۂ ابراھیم خلیل اللہ علیہ السلام

علماء ماہرین انساب کے تحت ابراھیمؑ کا نسب ابراھیم بن تارخ یا تسارخ بن باحور بن ساروغ بن راعو بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفخشذ بن سام بن نوح ہے۔

ماہرین علماء لغت عرب کے مطابق ابراھیم کلمہ عجمی ہے علماء انساب کی تحقیق کے مطابق آپ کے والد گرامی کا نام تسارخ ہے شیخ جامعۃ الازھر سید محمد طنطاوی اپنی کتاب القصص فی القران کے صفحہ ۱۱۷ پر آپ کے سلسلہ نسب کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں ابراھیم بن تارخ یا تسارخ بن ناحور بن ساروغ بن راعو بن فالغ بن عابر بن سام بن نوح علیہ السلام۔تسارخ کے ہاں تین بیٹے پیدا ہوئے ابراھیم، ناحور اور حاران اور حاران سے لوط علیہ السلام پیدا ہوئے۔حضرت ابراھیم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام کے درمیان تقریباً تین ہزار سال کا عرصہ ہے۔ حضرت ابراھیمؑ کے اس سلسلہ نسب کو اہل تاریخ نے اپنی کتب میں بیان کیا ہے اس طرح ان کے ذکر میں ہے حضرت ابراہیمؑ کے باپ تسارخ کی عمر جب ۷۵ سال ہوئی تو ان کے ہاں تین بچے پیدا ہوئے جنکے نام ابراہیمؑ، ناحور اور حاران تھے پھر حاران کے ہاں حضرت لوطؑ پیدا ہوئے ابراہیمؑ ناحور اور حاران کے درمیان پیدا ہوئے۔آپ تینوں کلدانیوں کی سرزمین بابل میں پیدا ہوئے حاران نے وہیں وفات پائی ان کے حالات کا ذکر تاریخ سیر و اخبار میں موجود ہے۔حافظ ابن عساکر لکھتے ہیں کہ تسارخ

اپنے بیٹے ابراہیمؑ اور اس کی زوجہ سارا اور ابراہیمؑ کے بھتیجے لوط بن حاران کے ساتھ سرزمین بابل سے سرزمین کنعان کی طرف آ گئے اور کنعان کے علاقہ حاران میں قیام پزیر ہو گئے وہیں ابراہیمؑ کے والد کا ۲۵۰ سال کی عمر میں انتقال ہوا حاران سے یہ لوگ بیت المقدس کی طرف منتقل ہوئے جو شام کا علاقہ تھا اہل شام بھی شمال کی طرف توجہ کر کے سات ستاروں کی پوجا کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ دمشق کے دروازوں پر ایک ستارے کا ہیکل نصب ہے جس کیلئے ستارہ پرست عید مناتے اور اپنی نذورات پیش کرتے تھے۔

اس وقت ابراہیم، ان کی زوجہ اور حضرت لوطؑ کے علاوہ روئے زمین پر جو لوگ آباد تھے وہ سب کافر تھے علماء اور ماہرین کے نزدیک حقیقی باپ کے نام کے تعین میں اختلاف ہونا ایک عادی اور متعارف سیرت ہے خاص طور پر جہاں زمانہ تاریخ نویسی ضبط احوال وغیرہ سے پہلے زمانہ سے متعلق ہو۔ اس حوالے سے بعض تاریخ و سیرت کے لکھنے والوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد کا نام ''آزر'' بتایا ہے جو اس زمانہ کے مشہور و معروف بت ساز تھے۔ ابراھیم علیہ السلام کی تمام کوششیں انھیں بت پرستی سے دور کرنے میں ناکام رہیں۔ اس لئے آخر میں انھوں نے اس سے برات کا اظہار کیا جبکہ بعض دیگر محققین اور ماہرین نے آپ کے باپ کا نام ''تسارخ'' بتایا ہے قرآن سے نام کا تعین کرنے میں محققین کو مشکل پیش آئی اور یہ اختلاف نظر اسی وجہ سے ہے اگر ہم خود آیات کو ایک دوسرے سے ملائیں تو شاید ہمیں اس سلسلہ میں قرآن کا نقطہ نظر معلوم ہو جائے۔

۱۔ بابل گہوارۂ بت شکن:

آپؑ کی جائے ولادت بابل جس کا ذکر سورۂ بقرہ آیت ۱۰۲ میں آیا ہے وہاں ایک علاقہ جس کا نام ''اوز'' تھا آپؑ پیدا ہوئے یہ جگہ عراق میں دجلہ وفرات اور کربلا و ہاشمیہ کے درمیان واقع ہے۔ حضرت نوحؑ کی کشتی یہاں رکی اور آپ نے یہاں قیام کیا یہاں سے ہی آپ کی نسل پھیلی، بابل کا شمار اس وقت سرسبز و شاداب اور نعمتوں سے پُر سرزمین میں ہوتا تھا زندگی کے وسائل کی فراوانی اور

کثرت مال و دولت کی وجہ سے اس وقت کے انسان بھی اخلاقی حوالے سے پست اور بری عادات میں غرق تھے اخلاق فضیلہ ان میں ناپید اور اعلیٰ اقدار کا فقدان تھا قرآن کریم نے جسطرح دیگر اقوام وملل کی نابودی کی علت عیش وعشرت، خدا سے غفلت، بت پرستی اور طاغوتوں کے سامنے خضوع کو قرار دیا ہے اسی طرح یہ قوم بھی مادی عیش وعشرت میں محو تھی ان پر ایک ظالم و جابر بادشاہ حاکم تھا جس کا نام نمرود بن کنان تھا، قصص قرآن و انبیاء کے تحت حضرت ابراھیم علیہ السلام جس طاغوت کے زمانے میں مبعوث ہوئے اور جس سے انھوں نے مقابلہ ومبارزہ کیا اسے نمرود کے نام سے یاد کیا جاتا ہے یہ کلمہ عبرانی ہے جس کا معانی بڑا طاقت اور قدرت مند کے ہیں یہ قوش بن حام بن نوح کا بیٹا تھا وہ شکار میں بڑا ماہر تھا ایک قول کے تحت اس نے بابل کو بنایا ہے چنانچہ اس کو ایک عرصے تک زمین نمرود کہا جاتا تھا سورہ بقرہ آیت ۲۵۸ میں اس کا نام لیے بغیر اس کی طرف یوں اشارہ کیا ہے کہ وہ شخص جس نے حضرت ابراھیمؑ سے اس کے رب کے بارے میں مناظرہ کیا:

﴿الم ترالی الذی حاج ابرٰھیم فی ربہ﴾ ''کیا آپ نے اس شخص کا حال نہیں دیکھا جس نے ابراہیم سے ان کے رب کے بارے میں جھگڑا کیا'' لیکن قصص انبیاء اور دیگر قصے کہانیوں میں نمرود کو بہت اونچا کر کے پیش کیا ہے لیکن سورہ بقرہ آیت ۲۵۸ سے پتہ چلتا ہے جتنا اس کے قدرت و توانائی اور سلطنت کے بارے میں بتایا جاتا ہے اسکی کیفیت ونوعیت وہ نہیں ہے لہذا قرآن کریم نے اس کے نام لینے سے گریز کیا اسی طرح جب حضرت ابراھیمؑ کو آگ میں پھینکنے کا فیصلہ کیا تو وہ فیصلہ بھی قرآن میں نقل ہے ''قوم نے کہا ہے'' اور یہ بھی ثابت نہیں ہے نمرود نے خود کو ''الٰہ'' کی جگہ پر پیش کیا جس طرح فرعون موسیٰ نے اپنے قوم سے کہا تھا:

﴿ماعلمت من الٰہ غیرك﴾ ﴿انا ربکم الاعلیٰ﴾

طاغوت مجہول: قرآن حکیم نے اس سرکش وطاغی انسان کا نام بتانے سے گریز کیا ہے۔ تاکہ آنے والی نسلوں پر یہ بات واضح وروشن ہو جائے کہ نمرود اپنی سلطنت وحکومت اور تمام تر طاقت و

قدرت کے باوجود ارادۂ ومشیت الٰہی کے مقابلے میں ابراھیم خلیلؑ کے قاطعانہ دلائل و براہین کے سامنے ایک مجہول الحال انسان ہے اور جو بھی جب بھی دین حقیقی کے مقابلے میں آئے گا اور اس پر عمل سے گریز کے بہانے تراشے گا، وہ نمرود کی طرح بے نام ونشان ہو جائے گا اور قدر ومنزلت کی بجائے تاریخ اسے ایک قابل نفرت اور نا قابل ذکر انسان کے طور پر متعارف کروائے گی۔

قرآن کریم کی سورۂ بقرہ آیت ۲۵۸ میں اس بادشاہ کی طرف یوں اشارہ کیا گیا ہے: ''اے محمدؐ: آپ نہیں جانتے اس شخص کو جو ابراھیمؑ کے ساتھ اپنے ہی خالق اور وجود باری تعالی کے بارے میں مناظرہ پر اتر آیا''۔ قرآن نے ایک اشارے کے ساتھ اس کی ایک صفت بیان کی ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ اپنے دور کا بادشاہ تھا۔ قرآن نے فرمایا اللہ رب العزت نے اسے ملک وسلطنت اور دولت عطا کی۔ حضرت ابراھیم علیہ السلام سے جو سوال کیا، وہ انتہائی سادہ اور واضح تھا ایک بادشاہ کا ابراہیم علیہ السلام جیسی عقل ومنطق و برہان سے بات کرنے والی ہستی سے ایسا سوال کرنا جس کا جواب ایک عام اور سادہ انسان یہاں تک کہ طفل مکتب سے بھی پوشیدہ نہیں، اس کی جہالت وسفاحت اور غرور وتکبر کی علامت ہے چنانچہ اللہ نے اپنے کلام میں اس کے سوالیہ فقرے کا ذکر کرنا بھی مناسب نہ سمجھا، ابراھیم علیہ السلام کے جواب سے معلوم ہوتا ہے اس نے ابراھیم علیہ السلام سے پوچھا تمہارا رب کون ہے تو ابراھیمؑ نے جواب دیا وہ جو تمام موجودات کو موت اور حیات دیتا ہے وہی میرا رب ہے۔ دیگر موجودات الٰہی کے برعکس موت وحیات دو ایسی پیچیدہ مخلوقات ہیں ،جدید علمی دور کے محققین بھی علمی انکشافات کے بلند بانگ دعوے کرنے کے باوجود اس حقیقت سے آشنا نہ ہو سکے۔ ہر چیز کی برگشت مٹی ہے اور مٹی میں حیات نباتاتی کیسے آئی، پھر حیات نباتاتی کے اندر حیات حیوانی کیسے پیدا ہوگئی، حیات حیوانی میں حیات انسانی کیسے اور کس طرح پیدا ہوئی، علمائے جراثیم اور مائیکروشناس ان انتہائی چھوٹی اور آنکھ سے نظر نہ آنے والی چیزوں کو کشف کرتے ہیں لیکن مائیکروسکوپ سے نظر آنے والی یہ مخلوق کیسے پیدا ہوئی اور اس میں یہ حیات کہاں سے آئی،

ان کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں۔ اسی طرح جب ایک ہنستا کھیلتا چلتا پھرتا انسان دیکھتے دیکھتے موت کی آغوش میں چلا جاتا ہے تو یہاں سوال پیدا ہوتا ہے اسے موت کیسے آئی اور کس طرح انسانی جسم سے حیات کا خاتمہ ہوتا ہے اسکی گہرائیوں میں جانے والے بھی اس سے نابلد ہیں انسانی جسم سے روح نکلنے کے بعد جب اس کا جسم بے حس وحرکت ہو جاتا ہے تب دوسرے انسانوں کو پتہ چلتا ہے اسے موت لاحق ہوگئی ہے لیکن موت اسے کہاں سے آئی، کیسے آئی اور اسکی روح جسم سے کیسے جدا ہوگئی یہ بات ابھی تک معمہ ہے۔

حضرت ابرہیم علیہ السلام کے مقابل کھڑے ہونے والے طاغوت نے خود کو موت وحیات پر قادر وقابض ثابت کرنے کیلئے ایک انسان سزا یافتہ جسے سزائے موت سنائی گئی تھی کو آزاد کر کے یہ دعویٰ کیا وہی ہے کہ جو دوسروں کو زندگی دیتا ہے اور پھر ایک آزاد اور غیر قصوروار انسان کو تلوار کی کاٹ سے قتل کرنے کے بعد یہ دعویٰ کرنے لگا اس کے مرنے سے یہ ثابت ہوگیا کہ میں جسے چاہتا ہوں موت دیتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں زندگی وحیات بخشتا ہوں وہ بے وقوف بادشاہ تو تھا مگر اس پر یہ آسان سی بات بھی واضح نہیں موت اور قتل میں لا متناہی فرق ہے اس نے تو ایک شخص کو قتل کیا جس کے نتیجے میں اسے موت لاحق ہوئی۔ اگر کوئی قاتل یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ موت دینے پر قدرت رکھتا ہے تو اسے چاہیے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ وہ کسی کو قتل کرنے یا قتل کروانے کے بغیر جب کہتا ہے کہ فلاں کو موت آجائے تو اسے موت آجاتی ہے جو موت دینے پر قادر ہو وہ تو تعدی وتجاوز اور جسمانی اذیت کے بغیر جسم سے روح کو جدا کر لیتا ہے جب نمرود نے چشم بندی اور زبان بندی سے قتل کو موت دکھانے کی کوشش کی تو حضرت ابراھیم علیہ السلام نے احتجاج کا رخ موڑتے ہوئے اس سے کہا میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے اگر تو اپنے دعوے میں سچا ہے تو اسے مغرب سے طلوع کر کے دکھا۔

اسکی نظر میں انسان ایسے تھے جیسے ایک چوپان کی نظر میں اس کے مال مویشی۔ یعنی ہر انسان اس

کے نزدیک ایک حیوان کی حیثیت رکھتا تھا لہذا یہ جب چاہتا اپنے استفادہ کی خاطر اسے ختم کر دیتا۔
ابراہیمؑ وہیں مبعوث بہ رسالت ہوئے اس کی تائید آیات قرآنی سے ملتی ہے کیونکہ آپ کی جائے بعثت بت و بت پرستی کے انتہائی عروج کی جگہ تھے لہذا آپ نے دعوت کا آغاز بتوں کے مخالفت سے کیا اس کے بعد آپؑ وہاں سے ہجرت کر کے بیت المقدس کی طرف گئے اور بیت المقدس سے آپؑ نے سرزمینِ مقدس مکہ مکرمہ کی طرف ہجرت کی اور وہاں آپؑ نے کعبۂ بیت اللہ کی تعمیر نو کی۔
افرادی عناصر یعنی آپ کی آغازِ بعثت سے لے کر اختتام تک جن افراد سے تعلق ہوا انکو دو گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

پہلا گروہ: جو آپ کی نبوت کے حامی یا مدافع تھے جن کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے:
(۱) لوطؑ، (۲) سارا، (۳) اسماعیلؑ، (۴) اسحاقؑ، (۵) ملائکہ

دوسرا گروہ: کہ جنھوں نے آپ کی رسالت کی بھرپور مزاحمت کی جیسے ۱۔ آزر، ۲۔ نمرود

ابراہیم علیہ السلام کی بتوں کے خلاف سرد جنگ سے بت شکنی تک:

حضرت ابراہیمؑ فطرت سلیم کے مظہر جلی تھے جب ان کی نظریں فطرت سلیم کے خلاف چہروں پر پڑی آپؑ نے توحید پرستی کی جگہ بت پرستی کو دیکھ کر سب سے پہلا خطاب جس سے کیا وہ آپؑ کے چچا تھے آپؑ نے اپنے چچا سے کہا آپ ایسی چیزوں کی کیوں پرستش کرتے ہیں جو نہ سن سکتی ہیں نہ دیکھ سکتی ہیں جو کام آپ کر رہے ہیں یہ درحقیقت شیطان کی پرستش اور رحمن کی نافرمانی ہے، مجھے خوف ہے کہ خدا اپنے عذاب کی لپیٹ میں آپ کو نہ لے لے۔ جیسا کہ سورۂ مریم کی آیت ۴۲:
﴿اذ قال لابیہ یا بت لم تعبد ما لا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنک شیئا﴾ ''جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا اے ابا آپ اسے کیوں پوجتے ہیں جو نہ سننے کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ دیکھنے کی اور نہ ہی آپ کو کسی چیز سے بے نیاز کرتا ہے''۔

ترجمہ: ''اور تحقیق ہم نے ابراہیم کو پہلے ہی سے عقل کامل عطا کی تھی اور ہم اس کے حال سے واقف و باخبر تھے۔ جب انھوں نے اپنے باپ (چچا) اور اپنی قوم سے کہا: یہ مورتیاں کیا ہیں جن کے گرد تم جمع رہتے ہو؟۔ کہنے لگے ہم نے اپنے باپ دادا کو ان کی پوجا کرتے پایا ہے۔ ابراہیم نے کہا: یقیناً تم خود اور تمہارے باپ دادا بھی واضح گمراہی میں مبتلا ہیں۔ وہ کہنے لگے: کیا آپ ہمارے پاس حق لے کر آئے ہیں یا بیہودہ گوئی کر رہے ہیں؟۔ ابراہیم نے کہا: بلکہ تمہارا رب آسمانوں اور زمین کا رب ہے جس نے ان سب کو پیدا کیا اور میں تم سب پر اس بات کا گواہ ہوں اور اللہ کی قسم! جب تم یہاں سے پیٹھ پھیر کر چلے جاؤ گے تو میں تمہارے ان بتوں کی خبر لینے کی تدبیر ضرور سوچوں گا۔ چنانچہ ابراہیمؑ نے ان بتوں کو ریزہ ریزہ کر دیا سوائے ان کے بڑے (بت) کے تاکہ اس کی طرف رجوع کریں۔ وہ کہنے لگے: جس نے ہمارے معبودوں کا یہ حال کیا ہے یقیناً وہ ظالموں میں سے ہے۔ کچھ نے کہا: ہم نے ایک جوان کو ان بتوں کا (برے الفاظ میں) ذکر کرتے ہوئے سنا ہے جسے ابراہیمؑ کہتے ہیں۔ کہنے لگے: اسے سب کے سامنے پیش کرو تاکہ لوگ اسے دیکھ لیں۔ کہا: اے ابراہیم! کیا ہمارے معبودوں کا یہ حال تم نے کیا ہے؟ ابراہیم نے کہا: بلکہ ان کے اس بڑے (بت) نے ایسا کیا ہے سو اس سے پوچھ لو اگر یہ بولتا ہو۔ یہ سن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور کہنے لگے: حقیقتاً تم خود ہی ظالم ہو۔ پھر انھوں نے اپنے سروں کو نیچے کر لیا (اور ابراہیمؑ سے کہا:) تم جانتے ہو کہ یہ نہیں بولتے۔ ابراہیمؑ نے کہا: تو پھر تم اللہ کو چھوڑ کر انھیں کیوں پوجتے ہو جو تمہیں نہ کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان؟۔ تف ہو تم پر اور ان معبودوں پر جنھیں تم اللہ کو چھوڑ کر پوجتے ہو کیا تم عقل نہیں رکھتے؟۔ وہ کہنے لگے: اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو اسے جلا دو اور اپنے خداؤں کی نصرت کرو۔ ہم نے کہا: اے آگ! ٹھنڈی ہو جا اور ابراہیم کیلئے سلامتی بن جا اور انھوں نے ابراہیمؑ کے ساتھ اپنا حربہ استعمال کیا لیکن ہم نے خود انھیں ناکام

بنا دیا'' (انبیاء/۵۱ تا ۷۰)

ابراہیم علیہ السلام کے سوالیہ انداز میں بیک وقت استفہام، اعتراض اور باطل کا مذاق اڑانا شامل تھا ابراہیم علیہ السلام ابھی ایک تازہ نوجوان ہیں اس اجتماع میں واحد و یکتا ہیں لیکن اپنی عقل و فراست سے ان لوگوں سے ایک ایسا سوال کرتے ہیں کہ پوری قوم حیران و سرگرداں ہوتی ہے اور بہانہ سازی پر اتر آتی ہے ابراہیم علیہ السلام نے اپنے سوال سے انکی عقل و فکر کو چیلنج کیا اور اپنے اس مختصر جملہ میں آپ نے چند نکات اٹھائے:

۱۔ اپنے ہاتھ سے بنائے ہوئے اس پتھر کے سامنے تم خضوع و خشوع اور شکستگی میں کیوں جھکے پڑے ہو۔ اس پتھر کی کیا حقیقت اور قدر و قیمت ہے۔

۲۔ یہ پتھر تمہاری زندگی میں کیا مثبت کردار رکھتا ہے۔

۳۔ یہ پتھر دوسرے پتھروں کی بہ نسبت جنکی تم پوجا نہیں کرتے کن امتیازات کا حامل ہے، کونسے اسرار اسکے اندر پوشیدہ ہیں اسکی موجودہ شکل و صورت اس کی اپنی پیدا کردہ ہے یا اسکے بنانے والے تم ہو ایک عابد اور معبود میں کیا رشتہ ہونا چاہیے اسی طرح معبود عابد کی زندگی میں کیا کردار رکھتا ہے یہ وہ مختصر سوالات ہیں جو ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قوم سے کیے اور انھیں جنبش دی۔

جواب قوم:

قوم کے تجربہ کار اور اہل حل و عقد نے اس نوجوان کے حکمت سے پُر سوالات کا ایک ہی احمقانہ جواب دینے پر اکتفاء کیا اور وہ بھی جو عقل و منطق سے عاری اور وجدان سے کوسوں دور تھا انھوں نے کہا ہم اس عمل کے فلسفہ و حکمت سے آگاہ نہیں ہم نے صرف اپنے آباؤ اجداد کو انکی پرستش کرتے اور انکے سامنے خاضع ہوتے ہوئے پایا ہے ہمارے بزرگان انکی تقدیس و احترام کرتے تھے۔ اور انھوں نے ہی ہمیں اس سنت کو زندہ رکھنے کی وصیت کی ہے لہذا ہم ایک اولاد صالح و مطیع و فرمانبردار کا کردار ادا کرتے ہوئے ان کی پوجا کرتے ہیں ہمیں یہ حق نہیں پہنچتا کہ اپنے آباؤ اجداد کی سیرت

سے روگردانی کریں ابراھیم علیہ السلام نے قوم کا یہ احمقانہ جواب سننے کے بعد انھیں ایک جاہل قوم قرار دیا اور کہا تم اور تمہارے آباؤ اجداد سب کھلی گمراہی میں ہیں۔

قوم نے ابراہیم علیہ السلام سے کہا تم یہ باتیں ہوش وحواس میں کر رہے ہو یا ہمارے ساتھ مذاق کر رہے ہو ابراھیم علیہ السلام نے بغیر کسی عذر خواہی خوف و پریشانی کے واضح انداز میں ان سے کہا تمہارا رب وہی ہے جس نے زمین و آسمان کو خلق کیا اور میں اسکی گواہی دیتا ہوں اور یہ بت جنکی تم پوجا کرتے ہو یہ تمہارے خدا نہیں یہ کیسے ممکن ہے ایک جامد پتھر جسے تم نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے تمہارا خدا ہے۔ خدا کی قسم میں تمہارے بتوں کے بارے میں سوچوں گا چنانچہ ایک تقریب کے موقع پر جب پورا شہر خالی تھا ابراھیم علیہ السلام بت خانے میں گئے اور بڑے بت کے علاوہ تمام چھوٹے بتوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تا کہ ابتدائی مرحلہ میں لوگوں کے اذہان میں یہ بات آئے اس بڑے بت نے چھوٹے بتوں کو توڑا ہے کیونکہ بت پرستوں کے عقیدہ کے مطابق یہ بت نفع ونقصان کا بت تھا لہذا یہ لوگ بڑے بت کی طرف رجوع کریں گے اور جواب نہ ملنے پر ان کے اندر ایک منفی سوچ پیدا ہوگی یا یہ حضرت ابراھیم علیہ السلام پر الزام لگائیں گے کیونکہ آپ ہی وہ واحد شخصیت تھے جو ان بتوں کے خلاف تھے ابراھیم علیہ السلام یہ یقین رکھتے تھے کہ الزام انھی پر آئے گا لیکن آپ پہلے مرحلہ میں بڑے بت کی سلامتی سے ان کے اذھان کو جھنجوڑنا چاہتے تھے۔

ابراھیم علیہ السلام اپنا کام مکمل کرنے کے بعد اپنی پناہ گاہ میں چلے گئے لوگ جب بت پرستی کی مراسم ادا کرنے کی خاطر بت خانے میں آئے تو انھوں نے ایسا منظر دیکھا جو انکی غیرت وحمیت کو جوش دلانے والا تھا لہذا وہ درد بھرے لہجے میں اس واقعہ پر ایک دوسرے سے گفت وشنید کرنے لگے انکی مقدسات پر یہ جرم وجنایت کس نے کیا ہے سب نے کہا جو بھی ہو جس نے یہ کام کیا وہ ظالم ہے اور ہم اسے اسکے انجام تک پہنچائیں گے کیونکہ اس نے ہمارے خداؤں کے ساتھ جسارت کی ہے لہذا ہمیں اس مجرم کی تلاش کرنی چاہیے۔ اسی دوران ایک گروہ نے کہا سنا ہے اس شہر میں ایک

نوجوان جسکا نام ابراھیمؑ ہے وہ ہماری بت پرستی کو مسترد کرتا ہے اور بت پرستی کرنے والوں کو گمراہ اور رجعت پسند قرار دیتا ہے واحد وہی شخص ہے جو اس جرم و جنایت کا مرتکب ہو سکتا ہے لہٰذا ہمیں اپنی تمام تر توجہ کو اسکی طرف مرکوز کرنا چاہیے سب لوگوں نے کہا اسے اجتماع کے سامنے لایا جائے اور جو عمل اس نے کیا ہے وہ سب کے سامنے اسکا اقرار کرے۔ چنانچہ ابراھیم علیہ السلام کو پکڑ کر اس اجتماع کے سامنے لایا گیا اور ان سے سوال کیا گیا کہ آپ نے ہمارے بتوں کے خلاف یہ جسارت کی ہے کیونکہ تم ہی واحد وہ شخص ہو جو بت پرستی نہیں کرتے کیونکہ ممکن نہیں جو شخص بت پرستی کرے وہ بتوں کی اہانت بھی کرے۔

ان سوالات کے جواب میں ابراھیم علیہ السلام نے ایک ایسا جملہ ارشاد فرمایا تاکہ انکے اذہان کو جھنجوڑیں اور انہیں اپنے گریبان میں جھانکنے پر مجبور کریں آپ نے کہا یہ کام اس بڑے بت نے انجام دیا ہے کیونکہ یہ ہی تنہا باقی بچا ہے اور یہ اس بات کی دلیل ہے یہ کارنامہ اس نے انجام دیا ہے اور یہ دوسروں کی نسبت زیادہ طاقت ور بھی دکھائی دیتا ہے لہٰذا جسطرح تم مجھ سے سوال کر رہے ہو اسی طرح اس سے پوچھو تاکہ یہ تمہیں جواب دے سکے ابراھیم علیہ السلام اس طریقہ سے ان کے عقیدے سے ٹکرائے اور ان سے گفتگو کو آگے بڑھایا جب آپ نے بت پرستوں سے کہا کہ وہ اس بت سے کشف حقیقت دریافت کریں تو بت پرست اپنے ضمیر کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور اپنے بتوں کی عجز و ناتوانی ان پر عیاں ہوئی اور خود کو عقل و منطق اور وجدان کے سامنے ناتواں پایا تو کوئی پناہ گاہ تلاش کرنے لگے۔ کیونکہ بڑے بت کو جھٹلانے میں انکے عقیدہ کا بطلان تھا اور وہ اس سے دستبردار ہونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ انھیں اپنی غلطی پر اصرار ہی کرنا تھا لہٰذا وہ بت سے سوال کرنے کی بجائے دوبارہ ابراھیم علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا ہم جانتے ہیں یہ بت بات نہیں کر سکتے لہٰذا ہم کیسے بڑے بت پر الزام لگائیں پس اگر کوئی مجرم ہے تو وہ صرف تم ہی ہو۔

منطق واستدلال کی جنگ:

قدیم زمانے سے لیکر عصر حاضر تک اہل حق اور باطل کا یہ دستور رہا ہے وہ ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہونے اور خونی جنگ چھیڑنے سے پہلے سرد جنگ کا آغاز کرتے ہیں۔اور مخالف کو کمزور کرنے کے بعد خونی جنگ کے مرحلہ میں داخل ہوتے ہیں اہل باطل کا یہ وطیرہ رہا ہے وہ ہمیشہ سے مختلف تہمتوں اور بہانوں سے نئے نئے مسائل پیدا کر کے اہل حق کے خلاف رائے عامہ ہموار کرنے اور ان کے خلاف بے بنیاد جواز ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں چنانچہ پندرھویں صدی کے تیسویں اور چوبیسویں سال میں امریکہ نے گیارہ ستمبر کے واقعہ کے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے نام سے امت اسلامی کو اس حادثہ کا ذمہ دار قرار دیتے ہوئے ان کے خلاف پہلے سرد جنگ اور پھر جلد ہی خونی اور تباہ کن جنگ کا آغاز کیا، مسلمانوں کے دو ملکوں پر یکے بعد دیگرے قبضہ کیا اس جنگ میں امریکہ نے ہزاروں مسلمانوں کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کیے جبکہ اس کے برعکس اہل حق کا یہ طرز عمل نہیں ہوتا وہ ہمیشہ سے جھوٹ افتراء اور تہمتوں سے گریز کرتے چلے آرہے ہیں وہ حقائق کو روز روشن کی طرح عیاں کرتے ہیں اور عقل و منطق اور وجدان سے استدلال کرتے ہیں۔لوگ انکے سامنے قائل ہوں یا نہ ہوں وہ کسی بھی صورت دوسرے فریق کو اپنے قہر و غضب کا نشانہ نہیں بناتے اور ہر صورت میں لوگوں کی عزت جان و مال کے تحفظ کی کوشش کرتے ہیں لیکن اہل باطل مخالف فریق کے ناکردہ جرائم کو بہانہ بنا کر اور اہل حق کو حق گوئی سے باز رکھنے کی دھمکی کے ساتھ ساتھ دردناک عذاب کی سزا بھی سناتے ہیں تاریخ بشریت میں اس طرح کے کئی ایک تلخ اور ظلم سے بھر پور ادوار ہو گزرے ہیں کہ جنھیں سن کر ہر درد دل انسان غم واندوہ کی کیفیت میں مبتلا ہو کر آنسو بہانے پر مجبور ہوتا ہے۔

حضرت ابراہیم خلیل اللہ بھی ایسی ہی ایک روداد کا حصہ ہیں کہ جنھوں نے بت پرستی کے خلاف عقل و منطق اور استدلال سے جنگ کا آغاز کرتے ہوئے سب سے پہلے اپنے چچا آزر جو بت پرستی

میں مشہور تھے ان سے ان کلمات میں جواب طلبی کی:

﴿اذ قال لابیہ یا بت لم تعبد ما لا یسمع ولا یبصر ولا یغنی عنك شیئا﴾ ''جب انہوں نے اپنے باپ سے کہا اے ابا آپ اسے کیوں پوجتے ہیں جو نہ سننے کی اہلیت رکھتا ہے اور نہ دیکھنے کی اور نہ ہی آپ کو کسی چیز سے بے نیاز کرتا ہے'' (مریم/۴۲) ﴿یابت انی قد جاء نی من العلم ما لم یاتك فاتبعنی اھدك صراطا سویا﴾ ''اے ابا تحقیق میرے پاس وہ علم آیا ہے جو آپؑ کے پاس نہیں آیا پس آپ میری بات مانیں۔ میں آپ کو سیدھی راہ دکھاؤں گا'' (مریم/۴۳) ﴿قال ھل یسمعونکم اذ تدعون﴾ ''ابراہیمؑ نے کہا جب تم انھیں پکارتے ہو تو کیا یہ تمھاری سنتے ہیں'' (شعراء/۷۲) ﴿او ینفعونکم او یضرون﴾ ''یا تمہیں فائدہ یا ضرر دیتے ہیں'' (شعراء/۷۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب میں آزر نے کہا:

﴿قال اراغب انت عن الھتی یا برھیم لئن لم تنتہ لا رجمنك واھجرنی ملیا﴾ ''اس نے کہا اے ابراہیم کیا تو میرے معبودوں سے برگشتہ ہو گیا ہے اگر تو باز نہ آیا تو میں تجھے ضرور سنگسار کروں گا اور تو ایک مدت کے لیے مجھ سے دور ہو جا'' (مریم/۴۶)

ابراہیم اور بتوں کا توڑنا:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب تمام تر دلائل و براہین پیش کرنے کے بعد بت پرستوں سے منفی رویہ کا سامنا ہوا تو ابراہیمؑ نے خدا سے قسم کھا کر کہا تمہارے یہاں سے جانے کے بعد میں تمہارے ان بتوں کی جن کی تم پرستش کرتے ہو بندوبست کروں گا:

﴿وتاللہ لاکیدن اصنامکم بعد تولوا مدبرین﴾ ''اور خدا کی قسم میں تمہاری غیر موجودگی میں ضرور تمہارے بتوں کی خبر لوں گا'' (انبیاء/۵۷)

اس وقت کے لوگ سال میں ایک دفعہ ایک میلے کا اہتمام کرتے تھے اس میں آزر نے ابراہیم

کو بھی شرکت کی دعوت دی تو ابراہیمؑ نے ستاروں کی طرف دیکھ کر کہا میں مریض ہوں اور ابراہیم تنہا گھر میں رہے جب سارا شہر خالی ہوگیا تو چپکے سے گھر سے نکلے بتوں کو آراستہ دیکھا جن کے سامنے تقرب کی خاطر انواع واقسام کے کھانے رکھے تھے ابراہیمؑ نے مزاح اور اہانت سے ان سے خطاب کیا تم لوگ کھاتے کیوں نہیں ہو؟ اور بات کیوں نہیں کرتے ہو یہ کہہ کر اپنے ہاتھ میں موجود کلہاڑی سے بڑے بت کے علاوہ تمام کو پاش پاش کیا:

﴿فتولوا عنه مدبرین۔فراغ الیٰ الهتهم فقال الا تاکلون۔مالکم لا تنطقون﴾

''ان کے پیچھے وہ چپکے سے ان۔کے معبودوں کے مندر میں گھس گیا اور بولا آپ لوگ کھاتے کیوں نہیں ہیں؟ کیا ہوگیا ہے آپ لوگ بولتے کیوں نہیں؟اس کے بعد ان پر پل پڑا اور سیدھے ہاتھ سے خوب ضربیں لگائیں'' (صافات/۹۰تا۹۳) ﴿فجعلهم جذٰذًا الا کبیرًا﴾ ''اس نے ان کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا اور صرف ان کے بڑے کو چھوڑ دیا'' (انبیاء/۵۸) صرف ان کے بڑے بت کو رکھا اور اس کے کندھے پر کلہاڑی کو رکھا یہ بتانے کیلئے کہ اس کو غصہ آیا ہے کہ اس کے ساتھ چھوٹے بتوں کو کیوں رکھا ہے جب وہ لوگ عید سے واپس آئے تو اپنے بتوں کا یہ حال دیکھا غصہ میں آ کر کہا:

﴿قالوا من فعل هذا بالهتنا﴾ ''کہنے لگے ہمارے خداؤں کا یہ حال کس نے کر دیا؟'' (انبیاء/۵۹)

اگر یہ لوگ عقل رکھتے تو ان کیلئے یہ کافی تھا جو کچھ ان کے بتوں کے ساتھ ہوا تھا جن کی وہ پوجا کرتے تھے اگر وہ خدا ہوتے تو اپنے دفاع کر سکتے لیکن انھوں نے جہالت ونادانی، بے وقوفی، گمراہی اور غرور پر قائم رہتے ہوئے کہا کہ ہمارے خداؤں کے ساتھ جس نے یہ سلوک کیا ہے یقیناً وہ ظالمین میں سے ہوگا: ﴿انه لمن الظلمین﴾ ''بڑا ہی ظالم تھا وہ'' (انبیاء/۵۹)

ان میں سے بعض نے کہا کہ اس کا نام ابراہیم علیہ السلام ہے:

﴿قالوا سمعنا فتیً یذکرهم یقال له ابراهیم﴾ ''بولے ہم نے ایک نوجوان کو ان کا ذکر کرتے

سنا تھا جس کا نام ابراہیمؑ ہے" (انبیاء/۶۰) وہ ہے جس نے بتوں کو توڑا ہے اس کو لوگوں کے سامنے لائیں تا کہ لوگ دیکھیں کہ وہ کیا کہتا ہے یہی مقصد ابراہیم خلیل اللہ تھا کہ سب لوگ جمع ہو جائیں اور تمام بت پرستوں کے سامنے یہ بات کریں اہل حق ہمیشہ اپنا مدعٰی اجتماع عام میں پیش کرتے ہیں جس طرح حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو کہا تھا کہ یہ پروگرام عید کے دن رکھو:

﴿قال موعدکم یوم الزینة﴾ "موسیٰؑ نے کہا جشن کا دن طے ہوا" (طٰہٰ/۵۹)

جب سب جمع ہوئے تو انھوں نے کہا اے ابراہیمؑ تو نے یہ کیا کیا ہے تو ابراہیمؑ نے کہا ان کے بڑے نے کیا ہے اس سے کیوں نہیں پوچھتے؟:

﴿قالواء انت فعلت هذا بالهتنا یا براهیم۔قل بل فعله کبیرهم هذا فسئلوهم ان کانوا ینطقون﴾ "کہا: اے ابراہیمؑ! کیا ہمارے معبودوں کا یہ حال تم نے کیا ہے؟ ابراہیمؑ نے کہا: بلکہ ان کے اس بڑے (بت) نے ایسا کیا ہے سو ان سے پوچھ لو اگر یہ بولتے ہوں" (انبیاء/۶۲ تا ۶۳)

حضرت ابراہیمؑ کا مقصد یہ تھا کہ یہ لوگ خود اس بات پر آجائیں کہ یہ تو بات نہیں کر سکتا اس سے کیا پوچھیں انھوں نے اپنے ضمیر سے ملامت کی اور ایک دوسرے سے کہا کہ ہم سب ظالم ہیں ان کیلئے کوئی محافظ کیوں نہیں چھوڑ کر گئے سب کے سر حسرت وندامت سے جھک گئے:

﴿فرجعوا الیٰ انفسهم فقالوا انکم انتم الظلمون۔ثم نکسوا علیٰ رئوسهم لقد علمت ماهؤلاء ینطقون﴾ "یہ سن کر وہ اپنے ضمیر کی طرف پلٹے اور (اپنے دلوں میں) کہنے لگے واقعی تم خود ہی ظالم ہو مگر پھر ان کی مت پلٹ گئی اور بولے تو جانتا ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں"

(انبیاء/۶۴،۶۵)

پھر انھوں نے سر اٹھائے اور ابراہیمؑ سے کہا یہ تو بات نہیں کرتا اس سے کیا پوچھیں۔اس وقت ابراہیم نے کہا کہ اس کی پرستش کرتے ہو جو نہ تمہیں فائدہ پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، آیا تم اس

چیز کی پرستش کرتے ہو جس کو تم نے خود اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے یہ کس طرح صحیح ہے کہ ایک مخلوق اپنی ہی مخلوق کے سامنے جھک جائے۔

جب ابراہیمؑ سے دلائل وگفتگو میں ہار گئے اور اُن سے کوئی بات نہ بنی تو وہ طاقت وقدرت سے متصل ہوئے تاکہ اپنے طغیان وسرکشی کی مدد کریں کہا کہ ایسی جگہ بنا دیں، اس میں آگ سلگائی جائے اور اس میں ابراہیم کو پھینک دیا جائے:

﴿قالوا ابنوا له بنیاناً فالقوه فی الجحیم۔ فارادوا به کیداً فجعلنهم الاسفلین﴾ ''انھوں نے آپس میں کہا کہ اس کیلئے ایک الاؤ تیار کرواور اسے دہکتی ہوئی آگ کے ڈھیر میں پھینک دو انھوں نے اس کے خلاف ایک کارروائی کرنی چاہی تھی، مگر ہم نے اُنہی کو نیچا دکھایا'' (صافات/ ۹۷ تا ۹۸) ﴿قال واحرقوه وانصروا الهتکم ان کنتم فعلین۔ قلنا ینار کونی برداً وسلماً علی ابراهیم۔ وارادوا به کیداً فجعلنهم الاخسرون﴾ ''انھوں نے کہا جلا ڈالو اس کو اور حمایت کرو اپنے خداؤں کی اگر تمھیں کچھ کرنا ہے ہم نے کہا اے آگ، ٹھنڈی ہو جا اور سلامتی بن جا ابراہیم پر۔ وہ چاہتے تھے کہ ابراہیمؑ کے ساتھ برائی کریں مگر ہم نے ان کو بری طرح ناکام کر دیا'' (انبیاء/ ۶۸ تا ۷۰)

اس کے تحت سب نے لکڑیاں جمع کرنی شروع کر دیں اور ایک عرصہ تک یہ لوگ لکڑیاں جمع کرتے رہے، یہاں تک کہ کہا جاتا ہے اگر کوئی عورت بیمار ہوتی تو وہ نذر کرتی تھی کہ اگر مجھے صحت ملی تو میں اتنی لکڑیاں ابراہیمؑ کو جلانے کیلئے جمع کروں گی ان تمام لکڑیوں کو ایک میدان میں جمع کیا اور آگ لگائی گئی پھر ابراہیمؑ کے ہاتھ پاؤں باندھ کر منجنیق میں ڈال کر اس آگ میں پھینک دیا گیا جب ابراہیم کو آگ میں پھینکا جا رہا تھا تو حضرت ابراہیمؑ کی زبان پر یہ دعا جاری تھے: ﴿لا الـٰه الا انت سبحانك رب العالمین لك الحمد ولك الملك لا شریك لك﴾۔

ہجرت حضرت ابراہیم خلیل اللہ:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے ضروری ہے ہم کلمہ ہجرت کے لغت اور قرآنِ کریم کی رُو سے اس معانی اور کم وکیفیت کے حوالہ سے آشنا ہو جائیں۔

ہجر جیسا کہ راغب اصفہانی نے کہا ہے ہجر و ہجران' انسان ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں یہ جدائی کبھی دل سے، کبھی زبان سے اور کبھی پورے بدن سے ہوتی ہے۔

طبرسی نے کہا ہجرت کا معنٰی ارتباط ہے قرآنِ کریم کی مندرجہ ذیل آیات میں ہجرت چھوڑنے اور ترک کرنے کے معنوں میں آیا ہے:

﴿واھجرنی ملیًا﴾ ''بس تو ہمیشہ کیلئے مجھ سے الگ ہو جا'' (مریم/۴۶) ﴿والرجز فاھجر﴾ ''اور گندگی سے دور رہو'' (مدثر/۵)

﴿واھجروھن فی المضاجع﴾ ''خواب گاہوں میں اُن سے علیحدہ رہو'' (نساء/۳۴) ہذیان کو بھی ہجر کہتے ہیں کیونکہ انصاف یہ ہے کہ اس کو چھوڑا جائے جیسا کہ قرآن کو چھوڑنے والوں کے بارے میں سورہ فرقان آیت ۳۰ میں آیا ہے:

﴿ھذالقران مھجورًا﴾ ''اس قرآن کو نشانۂ تضحیک بنالیا تھا''

ہجرت قلبی یعنی دل سے ارتباط یا دل سے ساتھ رہنے کو گوارا نہ کرے جیسا کہ انبیاءِ کرام بعثت سے پہلے دل نالان و ناراض کے ساتھ زندگی گزارتے تھے گویا وہ اس معاشرے میں ہوتے ہوئے دل سے ان سے جدا تھے چنانچہ زیارات کے فقرات میں آیا ہے کہ جاہلیت کی آلودگیاں انھیں مس نہیں کرتیں: ﴿عصمکم اللہ من الزلل﴾

ہجرت زبان (زبان سے دوری کا اعلان) چنانچہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے قوم سے کہا کہ میں تم سے دوری اختیار کرتا ہوں اور تمہارے اعمال سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔

ہجرت ترکِ جگہ جیسا کہ سورۂ نساء آیت ۱۰۰ میں آیا ہے:

﴿ومن یھاجر فی سبیل اللہ﴾ ''اور جو اپنے گھر سے اللہ اور رسول کی طرف ہجرت کیلئے نکلے''

جہاں معاشرہ کفر و شرک میں مبتلا ہو اور دینی اعمال پر ہر قسم کی پابندیاں ہوں اور انسان خدا کی طرف دعوت نہ کر سکتے ہوں اور اپنے دین پر بھی پابند نہ رہ سکتے ہوں تو ایسی صورت میں ہجرت واجب ہو جاتی ہے اور ان حالات میں ہجرت نہ کرنے والوں کو خدا کیطرف سے وعدۂ عذاب ہے:

﴿قالوا الم تکن ارض اللہ واسعۃ فتھاجروا فیھا فاولئک ماوٰھم جھنم﴾ ''کیا خدا کی زمین وسیع نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے؟ یہ وہ لوگ ہیں جن کا ٹھکانہ جہنم ہے'' (نساء/۹۷)

ایسی حالات میں پہلے اوسط اور آخر میں ہجرت کرنے والوں کے مراتب میں فرق ہے:

﴿والسٰبقون الاولون من المھاجرین والانصار﴾ ''وہ مہاجر و انصار جنھوں نے سب سے پہلے دعوتِ ایمان پر لبیک کہنے میں سبقت کی'' (توبہ/۱۰۰)

ہماری گفتگو حضرت ابراہیمؑ کی آخری ہجرت کے بارے میں ہے جیسا کہ قرآن میں آیا ہے:

﴿وقال انی مھاجر الیٰ ربی﴾ ''ابراہیم نے کہا میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں'' (عنکبوت/۲۶)

حضرت ابراہیمؑ نمرود کی آتش قہر و عذاب سے نجات حاصل کرنے کے بعد بابل چھوڑ کر سرزمین فلسطین شام کی طرف روانہ ہوئے۔ جس شہر کی شان میں خداوند عالم نے سورۂ انبیاء آیت نمبر ۷۱ میں تعریف کی ہے:

﴿ونجینٰہ ولوطًا الی الارض التی بٰرکنا فیھا للعٰلمین﴾ ''اور ہم ابراہیم اور لوط کو بچا کر اس سرزمین کی طرف لے گئے جسے ہم نے عالمین کیلئے بابرکت بنایا ہے'' (انبیاء/۷۱) اس طرح آیت سورۂ اسراء میں بھی تعریف کی ہے:

﴿سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ لیلًا من المسجد الحرام الی المسجد الاقصا الذی بٰرکنا﴾ ''پاک

ہے وہ جو لے گیا ایک رات اپنے بندے کو مسجد حرام سے دور کی اُس مسجد تک جس کے ماحول کو اُس نے برکت دی ہے'' (اسراء/۱)

اس سفر ہجرت میں حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ ایک قلیل گروہ بھی تھا:

﴿قد كانت لكم اسوةٌ حسنةٌ فى ابرٰهيم والذين معه﴾ ''تم لوگوں کیلئے ابراہیم اوران کے ساتھیوں میں بہترین نمونہ ہے'' سورہ ممتحنہ آیت نمبر۴ اور لوط بھی ساتھ تھے:

﴿فامن له لوط وقال انى مهاجر الىٰ ربى﴾ ''اس وقت لوط ان پر ایمان لے آئے اور کہنے لگے: میں اپنے رب کی طرف ہجرت کرتا ہوں'' (عنکبوت/۲۶)

صافات ۹۹، انبیاء ۷۱ سے ۷۳ تک اور خود انکی زوجہ محترمہ بھی انکے اس سفر ہجرت میں ساتھ تھیں لوط انکے بھائی کا بیٹا تھا اور انکا بھائی ناہور بھی ساتھ تھے۔ حضرت سارا انکے چچا حاران کی بیٹی تھی۔ دس سال بیت المقدس میں گزرنے کے بعد حضرت ابراہیمؑ اور سارہ جب وقت پیری میں پہنچے۔ تو خداوند عالم سے دعا کی جیسا کہ سورۂ مبارکہ صافات ۸۹ میں ہے سارا نے جو کہ یائسہ تھیں اپنے شوہر کو لاولد ہونے اور اس کرب و اضطراب میں دیکھ کر اپنی کنیز ہاجرہ کو انہیں ہبہ کر دیا چنانچہ خداوند کریم نے حضرت ہاجرہ کو اسماعیلؑ دیا۔ تو یہاں سے حضرت ابراہیمؑ حضرت ہاجرہ کی طرف متوجہ رہنے لگے۔

حضرت ابراہیم علیہ سلام اپنی قوم اور بابل کے بادشاہان کے عذاب اور مصیبتوں کو جھیلنے کے بعد خاص کر جب آپ کو منجنیقوں کے ذریعے آگ میں پھینکا گیا نجات پانے کے بعد حکم خدا سے شہر بابل چھوڑنے کا ارادہ کیا کیونکہ جس جگہ خدا کی عبادت و بندگی پر پابندی ہو اور ایک نبی کی دعوت کی کوئی اثر پذیری نہ ہو بلکہ وہاں دشمن کا غلبہ ہو تو اس جگہ سے حکم عقلی کے ساتھ حکم شریعت بھی ہے کہ ہجرت کریں حضرت ابراہیم علیہ سلام نے ہجرت سے پہلے یہ کلمات ارشاد فرمائے:

﴿وقال انى ذاهب الىٰ ربى سيهدين﴾ ''اور ابراہیم نے کہا: میں اپنے رب کی طرف جا رہا ہوں

وہ مجھے راستہ دکھائے گا'' (صافات/۹۹)

ابراھیم علیہ سلام کا بیت المقدس کی طرف سفر کرتے ہوئے شہر حران سے گذر ہوا جو عراق کے شمال میں موصل اور دیار مضر کے قریب واقع ہے یہاں کے لوگ ستارہ پرست تھے حضرت ابراھیم خلیل اللہ کو یہاں بھی ایک نئے انداز کی بت پرستی کا سامنا ہوا یہاں لوگ چاند ستاروں اور سورج کی پوجا کرتے تھے۔

ابراھیمؑ اور تعمیر بیت اللہ:

سورۂ مبارکہ ابراھیم سے پتہ چلتا ہے کہ بیت اللہ خدا کا یہ گھر حضرت ابراھیمؑ سے پہلے موجود تھے: ﴿ربنا انی اسکنت من ذریتی بوادٍ غیر ذی زرع عند بیتک المحرم﴾ ''پروردگار، میں نے ایک بے آب وگیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لابسایا ہے'' (ابراہیم /۳۷)

لیکن کب سے موجود ہے یہ قرآن سے ثابت نہیں ہے لیکن سورۂ بقرہ آیت ۱۲۷ سے واضح ہے اس بیت کی بنیاد کو اٹھانے والے حضرت ابراھیمؑ اور انکے معاون ان کے پہلے فرزند حضرت اسماعیل ہیں:

﴿واذ یرفع ابرٰھیم القواعد من البیت واسمٰعیل﴾ ''اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جب ابراہیم واسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے''

سورۂ ابراھیمؑ آیت ۳۷ سے واضح ہوتا ہے جس وقت حضرت ابراھیمؑ نے اپنے فرزند اسماعیل اور ان کی ماں ہاجرہ کو اس سرزمین مکہ میں لایا تو اس گھر کے کنارے پر چھوڑا اس وقت یہ گھر ہر قسم کی آثار آبادی سے خالی تھے وہیں پر ابراھیمؑ نے خدا کی درگاہ میں یہ دعا کی کہ لوگوں کے دلوں کو اس گھر کی طرف موڑ دے اور انہیں ثمرات وارزاق سے نوازیں:

﴿فاجعل افئدۃً من الناس تھوی الیھم وارزقھم من الثمرٰت لعلھم یشکرون﴾ ''لہٰذا تو کچھ

لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انھیں پھلوں کا رزق عطا فرما تا کہ یہ شکر گزار بنیں"
اس بیت کا ذکر قرآن کریم میں سولہ بار آیا ہے اس میں چند آیات میں خدا نے اس گھر کو اپنا گھر کہا ہے چند دیگر آیات میں لوگوں کا گھر کہا ہے اور چند آیات میں بغیر کسی نسبت سے اس کا ذکر آیا ہے اس گھر کی خصوصیت اس گھر کے بارے میں چند زاویے سے گفتگو ہے ایک اس گھر کی خصوصیات جن کا ذکر قرآن کریم میں سورۂ آلعمران آیت ۹۶ میں آیا ہے:

﴿ان اول بیتٍ وضع للناس للذی ببکۃ مبٰرکاوھدًی للعٰلمین﴾ "سب سے پہلا گھر جو لوگوں (کی عبادت) کیلئے بنایا گیا وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے جو عالمین کیلئے بابرکت اور راہنما ہے" جہاں اس گھر کے معمار حضرت ابراھیم خلیلؑ ہے اور ان کے معاون حضرت اسماعیل ذبیح ہے وہاں اس گھر کی مراسم عبادت کا معالم بھی ابراھیم خلیل ہیں ابراھیم خلیل کو قہرمان توحید کہا جاتا ہے شاید اس کی بنیاد پر ابراھیم کے توحید خداوندی کے راہ میں دعوت دینے میں سب سے زیادہ کردار ہے توحید کی راہ سے شرک وبت پرستی کے دور ختم کرنے کی کوشش میں نار نمرود میں گئے تمام بت اور بت پرستی کو ختم کرنے لوگوں کو توحید کے گرد گھومنے کے لیے اس گھر کو اٹھانے والے ابراھیم خلیل ہیں۔ لہٰذا خداوند عالم نے اس گھر کی مراسم عبادت کے معلم بھی ابراھیم خلیل کو بنایا ہے۔

حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ دونوں اس گھر کے معمار ہیں یہ گھر بہت پہلے موجود تھا لیکن بیت کی شکل میں نہیں تھا کیونکہ اس کی دیواریں منہدم تھیں جس کے بیت ہونے پر آیاتِ قرآنی شاہد وگواہ ہیں:

۱۔ روئے زمین میں سب سے پہلا گھر بندگانِ خدا کیلئے وہ ہے جو بکہ میں ہے:

﴿ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاوھدی للعٰلمین﴾ "بے شک سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کیلئے تعمیر ہوئی وہ وہی ہے جو مکہ میں واقع ہے" (آل عمران/۹۶)

۲۔ جب حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیل کو لائے تو یہیں اسی گھر کے کنارے پر رکھا جہاں کوئی

دیوار نہیں تھی:

﴿ربنا انی اسکنت من ذریتی بوادٍ غیر ذی زرعٍ عند بیتك المحرم﴾

''پروردگار، میں نے ایک بے آب و گیاہ وادی میں اپنی اولاد کے ایک حصے کو تیرے محترم گھر کے پاس لا بسایا ہے'' (ابراہیم/۳۷)

۳۔ خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کو اس گھر کا موسس و بنیاد رکھنے والا نہیں کہا بلکہ اس کے معمار یعنی تعمیر کرنے والے کہا ہے:

﴿واذ یرفع ابرٰھیم القواعد من البیت واسمٰعیل﴾ ''اور یاد کرو ابراہیم اور اسماعیل جب اس گھر کی دیواریں اٹھا رہے تھے'' (بقرہ/۱۲۷)

دعائے حضرت ابراہیم علیہ السلام:

اس گھر کی تعمیر کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے درگاہ خدا میں دعائیں کیں جو کہ درج ذیل ہیں:

۱۔ خداوندا لوگوں کے دلوں کو اس گھر کی طرف متوجہ کر:

﴿فاجعل افئدةً من الناس تھوی الیھم﴾ ''لوگوں کے دلوں کو اس کا مشتاق بنا'' (ابراہیم/۳۷)

۲۔ خداوندا یہاں بسنے والوں کو مختلف قسم کے ثمرات کے رزق سے نواز:

﴿وارزقھم من الثمرات﴾ ''اور انہیں کھانے کو پھل دے'' (ابراہیم/۳۷)

۳۔ خداوندا ہمارے اس عمل کو اپنی بارگاہ میں قبول فرما:

﴿ربنا تقبل منا﴾ ''اے ہمارے رب، ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے'' (بقرہ/۱۲۷)

۴۔ خداوندا ہم دونوں کو اپنی بارگاہ میں سر تسلیم ہونے والوں میں قرار دے:

﴿ربنا واجعلنا مسلمین لك﴾ ''اے رب، ہم دونوں کو اپنا مسلم (مطیع فرمان) بنا''

(بقرہ/۱۲۸)

۵۔ خداوندا اس گھر کو امن وامان قرار دے:

﴿ومن دخله کان امنا﴾ ''جو اس میں داخل ہوا وہ محفوظ ہو گیا'' (آل عمران/۹۷)

۶۔ خداوندا مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچائے رکھنا:

﴿واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام﴾ ''اور مجھے اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا'' (ابراہیم/۳۵)

۷۔ خداوندا مجھے نماز قائم کرنے والوں میں قرار دے:

﴿رب اجعلنی مقیم الصلوۃ﴾ ''اے میرے پروردگار مجھے نماز قائم کرنے والا بنا'' (ابراہیم/۴۰)

۸۔ خداوندا ہماری دعائیں اپنی درگاہ میں قبول فرما:

﴿ربنا وتقبل دعاء﴾ ''پروردگار میری دعا قبول کر'' (ابراہیم/۴۰)

۹۔ خداوندا مجھے اور میرے والدین اور تمام مومنین کو قیامت کے روز بخش دے:

﴿ربنا اغفرلی ولوالدی وللمؤمنین یوم یقوم الحساب﴾ ''پروردگار مجھے اور میرے والدین کو اور سب ایمان لانے والوں کو اس دن معاف کر دیجیو جبکہ حساب قائم ہوگا'' (ابراہیم/۴۱)

ابراھیمؑ اور مردوں کا زندہ ہونا:

سورۂ بقرہ کی آیت ۲۶۰ کے تحت حضرت ابراہیم نے اللہ تبارک تعالی سے درخواست کی میرے مالک مجھے دکھا دے تو مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے تو اللہ تعالی نے ان سے استفسار کیا' کیا تو اس پر ایمان نہیں رکھتا تو ابراھیم نے عرض کیا:

﴿قال بلی ولکن لیطمئن قلبی﴾ ''کہا: ایمان تو رکھتا ہوں لیکن چاہتا ہوں میرے دل کو اطمینان مل جائے'' تو خداوند عالم نے فرمایا تو چار پرندے لے اور انہیں اپنے سے مانوس کر لے اور پھر انہیں ذبح کر کے ان کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پر رکھ دے پھر انہیں ان کے نام سے پکار وہ یہ تیرے پاس دوڑے چلے آئیں گے اللہ تعالی ہر کام کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے اور اس کے ہر کام

میں حکمت بھی ہوتی ہے اس آیت کو پڑھنے کے بعد بہت سے لوگوں کے دلوں میں شکوک وشبہات پیدا ہوئے اور وہ سوچنے لگے کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے حضرت ابرھیمؑ جیسے اولوالعزم پیغمبر کو معاد پر ایمان نہ ہو۔ کسی انسان کے نزدیک کسی بات یا کسی عقیدے پر ایمان ہونے اور نہ ہونے کی کسوٹی سکون قلب ہے اگر سکون قلب نہیں تو وہ حالت شک میں ہے شک میں ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ وہ ایمان نہیں رکھتا ابراھیمؑ نے واضح کیا ہے کہ ایمان تو رکھتا ہوں مگر چاہتا ہوں میرے دل میں اطمینان پیدا ہوجائے تاکہ اس میں کسی قسم کے شک وشبہ کے نفوذ کی گنجائش باقی نہ رہے عقیدہ کو عقیدہ اسی لیے کہتے ہیں کہ انسان توحید، معاد اور نبوت جیسے مسائل کو دل سے گرہ باندھے تاکہ یہ ناقابل انحلال و انفقاق ہوجائے اور دل میں ایمان نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ دل ایمان سے خالی ہے یہاں پیدا ہونے والے شبہ کے ازالہ کے لیے اس مثال پر غور کریں کسی مریض کو شفا کے لیے ڈاکٹر نے ایک گولی دی، مریض اس گولی کو اس یقین کے ساتھ کھاتا ہے اس گولی کے کھانے سے اسے شفا مل جائے گی لیکن وہ گولی کس طریقے سے بنی ہے یہ بات اسے معلوم نہیں ہے اور وہ جاننا چاہتا ہے کہ یہ گولی کس طریقے سے بنی ہے حضرت ابراھیم کا ایمان کامل ہے اللہ تعالی قیامت کے دن مردوں کو دوبارہ زندہ کرے گا لیکن ابراھیم کو یہ علم نہیں ہے کہ اللہ تعالی مردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے لہٰذا کیفیت میں اطمیان حاصل ہونا تکمیل اعتقاد کے لیے ضروری نہیں ہے کیونکہ عقائد کا اثبات دلائل سے ہوتا ہے اور کیفیت کا اثبات عمل سے ہوتی ہے حضرت ابراھیمؑ نے خداوند متعال سے مزید دلائل کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ یہ دیکھنے کی درخواست کی کہ عملا مردے کس طرح زندہ ہوتے ہیں لہٰذا خدا نے ابراھیم کو حکم دیا وہ چار مختلف اقسام کے پرندوں کو اپنے سے مانوس کرنے کے بعد ذبح کریں اور ان کا ایک ایک ٹکڑا ایک ایک پہاڑ پہ رکھ دیں اور ذبح کرنے سے پہلے ہر ایک کو اچھی طرح پہچان لیں تاکہ ان کے زندہ ہونے پر یہ اشتباہ نہ ہو کہ کوئی دوسرا پرندہ آگیا ہے مفسرین نے لکھا ہے چاروں پرندے مختلف قسموں کے تھے ان میں ایک کوا تھا، ایک طاؤس، ایک دیق اور ایک کبوتر تھا ہر ایک کی شکل

دوسرے سے مختلف تھی خدا نے ابراھیمؑ سے کہا کہ ان چاروں کو اچھی طرح دیکھنے اور پہچاننے کے بعد ذبح کریں ہر ایک کا ایک ایک جز ایک ایک پہاڑ پر رکھ دیں پھر انہیں اپنے طرف بلائیں تو وہ زندہ ہو کر آپ کی طرف لوٹ آئیں گے۔ یہ طریقہ احیائے اموات ہے آیہ کریمہ سے یہ واضح نہیں ہوا کہ خداوند متعال نے ابراھیمؑ کو احیائے اموات کا یہ ایک ہی طریقہ بتانے پر اکتفاء کیا یا ابراھیم نے اسی ایک طریقے پر عمل کیا۔

خدا نے ابراھیمؑ کو اپنا خلیل انتخاب کیا:

خلیل مادہ خلل سے ہے خلل دو چیزوں کے درمیان فاصلے یا شگاف کو کہتے ہیں خلیل کی جمع خلال ہے جیسا کہ سورۂ نور آیت ۴۳ میں آیا ہے کہ بارش بادلوں کے بیچ سے نکلتی ہے:

﴿فترى الودق يخرج من خلاله﴾ ''پھر آپ بارش کے قطروں کو دیکھتے ہیں کہ بادل کے درمیان سے نکل رہے ہیں''

چنانچہ خداوند عالم پیغمبر اور مسلمانوں سے خطاب کر کے فرماتے ہیں منافقین تمہارے درمیان جھوٹی اور فتنے کی باتیں چھوڑیں گے۔ اس طرح اور جگہوں پر قرآن کریم میں یہ لفظ آیا ہے:

﴿لو خرجوا فيكم ما زادوكم الا خبالاً ولا اوضعوا خلالكم يبغونكم الفتنة﴾ ''اگر وہ تمہارے ساتھ نکلتے بھی تو تمہارے لئے صرف خرابی میں اضافہ کرتے اور تمہارے درمیان فتنہ کھڑا کرنے کیلئے دوڑ دھوپ کرتے'' (توبہ/۴۷) ﴿بعثنا عليكم عباداً لنا اولى باس شديد فجاسوا خلال الديار﴾ ''ہم نے اپنے زبردست طاقتور جنگجو بندوں کو تم پر مسلط کیا پھر وہ گھر گھر گھس گئے'' (اسراء/۵) اس مادے سے خلا مودت و دوستی کے معنی میں آتا ہے۔ صاحب مجمع البیان نے خلا کے معنی مودت خالص کیا ہے کیونکہ محبت و دوستی انسان کے دل کے وسط میں جگہ بناتی ہے یا نفس کو شگاف کر کے اس میں اثر رکھتی ہے۔ قرآن کریم میں یہ لفظ خلیل دوستی کے معنوں میں مندرجہ ذیل آیات میں آیا ہے:

﴿ولا خلة ولا شفاعة﴾ ''اور نہ دوستی کا فائدہ ہوگا اور نہ سفارش چلے گی'' (بقرہ/۲۵۴)

﴿ان یاتی یوم لا بیع فیه ولا خلال﴾ ''اس دن کے آنے سے پہلے جس میں نہ سودا ہوگا نہ دوستی کام آئے گی'' (ابراہیم/۳۱)

کافر منافقین اپنے لیے قیامت کے دن دوست نہ بنانے پر پریشان ہوں گے:

﴿یو یلتی لیتنی لم اتخذ فلانا خلیلا﴾

''ہائے تباہی! کاش میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوتا'' (فرقان/۲۸) نساء ۱۲۵

بعض دوست قیامت کے دن ایک دوسرے کے دشمن بنیں گے:

سورۂ زخرف آیت ۶۷، صاحب تفسیر کبیر شعراوی کہتا ہے اس آیت سے مراد یہ ہے کہ خداوند عالم نے حضرت ابراہیمؑ کو خصوصی طور پر دوستی کے لیے انتخاب کیا ہے۔ کیونکہ دوستی میں بہت سے افراد شریک ہو سکتے ہیں جب کہ خداوند عالم فرماتا ہے جب خلوت میں اپنے ساتھیوں سے ملتے ہیں:

﴿والله مخرج ما کنتم تکتمون﴾ ''لیکن جو بات تم چھپا رہے تھے اللہ اسے ظاہر کرنے والا ہے'' (بقرہ/۷۲)

خدا صابرین سے دوستی کرتا ہے:

﴿والله یحب الصٰبرین﴾ ''اللہ تو صابروں کو دوست رکھتا ہے'' (آلعمران/۱۴۶)

خدا محسنین سے محبت کرتا ہے:

﴿والله یحب المحسنین﴾ ''اور اللہ نیکی کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے'' (آلعمران/۱۴۸)

خدا عدالت کرنیوالوں کو دوست رکھتا ہے:

﴿وان حکمت فاحکم بینهم بالقسط ان الله یحب المقسطین﴾ ''اور اگر آپ فیصلہ کرنا چاہیں تو انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیں بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے'' (مائدہ/۴۲) لیکن خداوند عالم نے ابراہیم کا نام لے کر فرمایا کہ خدا نے ابراہیم کو اپنا

خلیل منتخب کیا ہے۔

شعراوی کہتے ہیں کہ کلمہ خلیل اس راستے کو کہتے ہیں کہ جو ریت میں ہوتا ہے جیسے ہم عربی میں مدک کہتے ہیں مدک ہمیشہ ایک تنگ راستہ ہوتا ہے چنانچہ جہاں دو انسان ایک ساتھ ایک ہی راستہ پر چلیں گے انھیں خلیل کہتے ہیں گویا دونوں ایک دوسرے میں گھس گئے ہیں اور ایک دوسرے کے خلل کو پرکھتے ہیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور مجادلہ ملائکہ:

دین اسلام جو کہ تمام انبیاء ومرسلین کا دین ہے یہ مسلمات فطری اور عقل کے اصولوں پر قائم ہے اس دینِ مبین میں زمان ومکان کے گزرنے سے تغیر وتبدل نہیں آتا اسی اصول کے تحت ہم یہاں حضرت ابراہیمؑ کے مجادلہ کا ذکر کریں گے۔

حضرت ابراہیمؑ کے دورانِ نبوت ورسالت میں کیے گئے چار مجادلوں کا ذکر قرآن میں آیا ہے:

۱۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے چچا آزر سے مجادلہ کیا ہے۔

۲۔ آپ نے اپنی قوم سے مجادلہ کیا ہے۔

۳۔ وقت کے بادشاہ نمرود سے مجادلہ

۴۔ ملائکہ سے مجادلہ کیا جب ملائکہ قوم لوط پر عذاب نازل کرنے کے لئے آئے تھے۔

یہاں پر ہم چوتھے مجادلے کے بارے میں گفتگو کریں گے:

حضرت ابراہیمؑ کے پاس تین مرد آئے تو حضرت ابراہیمؑ ان کی خدمت کی طرف متوجہ ہوئے کیونکہ آپ مہمان نوازی کو بہت پسند کرتے تھے اس لئے ایک صحتمند بچھڑا ذبح کیا اس کو کاٹ کر کباب بنا کر ان مہمانوں کے سامنے رکھا لیکن جب انھوں (مہمانوں) نے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھائے تو ابراہیمؑ ان کی طرف سے خوف زدہ ہو گئے اور ان سے سوال کیا تم کون ہو تو انھوں نے جواب دیا ہم خدا کے بھیجے ہوئے فرشتے ہیں ہم اہل سدوم وعمور پر عذاب نازل کرنے کیلئے

آئے ہیں۔ یہ قوم بحر میت کے قریب رہتی ہے جسے آجکل بحر لوط کہتے ہیں۔ ابراہیمؑ نے جب ان سے عذاب کی خبر سنی تو خوف زدہ ہوئے کہ اس عذاب کی زد میں لوط آئیں گے اس سلسلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ملائکہ سے گفتگو کی کہ شاید خداوند عالم ان پر رحم کرے، چنانچہ آیت میں آیا ہے کہ جب ابراہیمؑ سے خوف اتر گیا تو اس نے قوم لوط کے بارے میں ہم سے مجادلہ کرنا شروع کیا۔

یہ ملائکہ خبر عذاب کے ساتھ ایک بشارت بھی لے کر آئے تھے یعنی حضرت ابراہیمؑ کیلئے ایک عالم ودانا بچے کی خوشخبری لائے حضرت ابراہیمؑ نے کہا اس وقت خوشخبری دے رہے ہو جب میں اور میری بیوی یاس ومایوسی کو پہنچ چکے ہیں جب یہ خبر سارہ نے ملائکہ کی زبان سے سنی تو انھیں ہنسی آگئی کہ کیسی خبر دے رہے ہیں، یہ کیسے ممکن ہے کیونکہ ہم میاں بیوی دونوں بوڑھے ہیں، ملائکہ نے کہا کہ یہ امر خدا سے متعلق ہے خدا کسی چیز سے عاجز نہیں ہے ملائکہ نے انھیں اس خوشخبری کا معین وقت بتایا اور حضرت ابراہیمؑ کے گھر سے نکل کر صدوم وعمور کی طرف آئے جیسا کہ مندرجہ آیات میں آیا ہے:

﴿ولقد جآئت رسلنا ابرٰهیم بالبشرٰی قالوا سلمًا قال سلم فمالبث ان جآء بعجلٍ حنیذٍ۔ فلما را ایدیھم لاتصل الیه نکرھم واوجس منھم خیفة قالوا لاتخف انا ارسلنا الیٰ قوم لوطٍ۔ وامرتہ قآئمة فضحکت فبشرنھا باسحق ومن ورآء اسحق یعقوب......﴾ "اور جب ہمارے فرشتے بشارت لیکر ابراہیم کے پاس پہنچے تو کہنے لگے: سلام! ابراہیم نے (جواباً) کہا: سلام! ابھی دیر نہ گزری تھی کہ ابراہیم ایک بھنا ہوا بچھڑا لے آئے۔ جب ابراہیم نے دیکھا ان کے ہاتھ اس (کھانے) تک نہیں پہنچتے تو انہیں اجنبی خیال کیا اور ان سے خوف محسوس کیا فرشتوں نے کہا: خوف نہ کیجیے ہم تو قوم لوط کی طرف بھیجے گئے ہیں اور ابراہیم کی بیوی کھڑی تھیں پس وہ ہنس پڑیں تو ہم نے انھیں اسحاق کی اور اسحاق کے بعد یعقوب کی بشارت دی۔ وہ بولی: ہائے میری شامت! کیا میرے ہاں بچہ ہوگا جبکہ میں

بڑھیا ہوں اور یہ میرے میاں بھی بوڑھے ہیں؟ یقیناً یہ تو بڑی عجیب بات ہے۔ انھوں نے کہا: کیا تم اللہ کے فیصلے پر تعجب کرتی ہو؟ تم اہل بیت پر اللہ کی رحمت اور اس کی برکتیں ہیں یقیناً اللہ قابل ستائش، بڑی شان والا ہے۔ پھر جب ابراہیم کے دل سے خوف نکل گیا اور انھیں خوشخبری بھی مل گئی تو وہ قوم لوط کے بارے میں ہم سے بحث کرنے لگے بے شک ابراہیم بردبار، نرم دل، اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ (فرشتوں نے ان سے کہا) اے ابراہیم! اس بات کو چھوڑ دیں بے شک آپ کے رب کا فیصلہ آچکا ہے اور ان پر ایک ایسا عذاب آنے والا ہے جسے ٹالا نہیں جا سکتا" (ہود/ ۶۹ تا ۷۶، ذاریات ۲۴ تا ۳۱)۔

قصۂ ابراہیم میں عبرتیں:

۱۔ اگر انسان میں عقیدۂ حق نفوذ کر جائے تو یہ انسان کی فکر پر بھی حاکم ہوتا ہے اور اس کے دل کا احاطہ کرتا ہے ایسے حالات میں انسان کیلئے آگ تنور ہر قسم کی اذیت سے گزرنا آسان ہو جاتا ہے لیکن اس کے لئے عقیدہ سے برگشت ممکن نہیں ہوتی۔ حضرت ابراہیمؑ اس میدان میں اقوام و ملل کیلئے پہلی ضرب المثل چھوڑنے والوں میں سے ہیں۔

۲۔ حضرت ابراہیمؑ کا انقلاب بت و بت پرستی کی ایک گفتگو تک محدود نہیں تھا بلکہ یہ ایک انقلاب عملی تھا لہٰذا آپؑ نے بتوں کو پاش پاش کیا پھر اسی عمل کو ان سے گفتگو کرنے کا وسیلہ بنایا یہاں تک کہ انھیں ساکت و خاموش کیا بت پرست ان کے مقابلے میں انتہا پسندی اور قتل کرنے کی حد تک آگے بڑھے جس کے نتیجے میں حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینک دیا گیا۔

۳۔ حضرت ابراہیم اپنی گفتگو میں اپنے مدعا کو ثابت کرنے کیلئے کسی قسم کا طریقہ وضع کرنے میں نرمی و سہل انگاری سے کام نہیں لیتے تھے اسی طرح ستاروں کی مدد سے جب انھیں سمجھایا کہ آسمان کے ستارے خدا بننے کی صلاحیت نہیں رکھتے، اس گفتگو میں پہلے مرحلہ میں ان سے

برائت کا اعلان نہیں کیا بلکہ انھیں بت پرستی ثابت کرنے میں عاجز کیا اور کہا کہ کوئی بھی بت' پرستش کے لائق نہیں ہے۔

۴۔ حضرت ابراہیمؑ اس بات کے اہل تھے کہ جہاں خدا نے ان کی شان میں فرمایا کہ ہم نے اپنی دلیل ابراہیمؑ کو دی ہے تا کہ قوم کے مقابلے میں دلیل سے بات کرسکیں۔ حضرت ابراہیم ؑ نے وقت کے بادشاہ سے بغیر خوف و تردد کے بات کی جس سے بادشاہ کو دلائل میں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

۵۔ حضرت ابراہیمؑ رحمدل اور رقیق القلب تھے یہ چیز اس وقت ظاہر ہوئی جب آپؑ سے آزر نے کہا کہ ''تم اپنی دعوت سے باز نہ آئے تو تمھیں سنگسار کردیں گے ہم سے دور ہو جاؤ'' تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا: ابا جان! میرا سلام ہو آپ پر میں آپ کیلئے خدا سے مغفرت کی دعا کروں گا میرا خدا مغفرت کرنے والا ہے۔

۶۔ انسان جب حق پر ایمان لائے اور اسکا دل مطمئن ہو جائے تو اسکا نتیجہ اطاعت و بندگی ہے جب خدا نے حضرت ابراہیمؑ سے نیند میں بیٹے کی قربانی طلب کی تو ابراہیمؑ نے رضائے خدا کو مقدم رکھا اور بچے کو ساتھ لے کر میدان میں آگئے۔

۷۔ حضرت ابراہیمؑ بہت مہمان نواز تھے اپنے مہمانوں کی خدمت کرنے کیلئے گھر تک محدود نہیں بلکہ بیابان میں بھی مہمان نوازی کرتے تھے۔

۸۔ نفسِ ابراہیمؑ ہمیشہ تحقیق طلب تھا آپؑ ہمیشہ حقائق کو حقائق سے سمجھنا جانتے تھے لہٰذا آپؑ نے خدا سے درخواست کی انھیں ان حقائق سے آگاہ کیا جائے کہ مُردے کیسے زندہ ہوتے ہیں

۹۔ حضرت ابراہیمؑ اوامر خدا کو نافذ کرنے کیلئے ہمہ وقت تیار رہتے تھے:

﴿اذقال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العلمین﴾ ''اس کا حال یہ تھا کہ جب اس کے رب

نے اس سے کہا: مسلم ہو جا تو فوراً کہا میں مالک کائنات کا مسلم ہو گیا" (بقرہ/۱۳۱)

(کتاب قصص الانبیاء، تالیف عبدالوہاب نجار صفحہ ۱۱۶)

حضرت اسماعیل علیہ السلام کا ذکر قرآنِ کریم میں:

نام سورہ	سورہ نمبر	آیات نمبر
البقرة	۲	۱۲۵، ۱۲۷، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۰
آل عمران	۳	۸۴
النساء	۴	۱۶۳
الانعام	۶	۸۶
ابراهيم	۱۴	۳۹
مريم	۱۹	۵۴
الانبياء	۲۱	۸۵
ص	۳۸	۴۸

حضرت ابراھیمؑ سرزمین بابل کو چھوڑ کر اپنی بیوی سارا اور برادر زادے لوط کے ساتھ کلدانیوں کے شہر کی طرف گئے اور وہاں سے حران (فلسطین) کی طرف گئے حضرت ابراھیم اور حضرت سارا ایک عرصہ قناعین کے علاقہ میں رہے جب وہاں خشک سالی آئی تو مصر کی طرف رخ کیا اس وقت وہاں پر رعات عمالک ہیکسوس کی حکومت تھی۔ حضرت سارہ کی عمر ستر سال سے زائد تھی یعنی وہ بچہ جننے کے قابل نہیں تھیں۔ انھیں بادشاہ مصر کی طرف سے ایک کنیز دی گئی جسکا نام ہاجرہ تھی حضرت سارا نے حضرت ابراھیمؑ کی نسل کو ختم ہوتے اور خود کو بھی بانجھ پایا تو انھوں نے ہاجرہ کو ابراھیمؑ کو بخشا یہاں حضرت ابراھیمؑ نے درگاہ خدا میں دعا کی:

﴿رب هب لي من الصلحين﴾

''پروردگار! مجھے صالحین میں سے (اولاد) عطا کر'' (صافات/۱۰۰)

سورۂ مریم ۵۴ میں خداوند عالم نے اسماعیل علیہ السلام کو وعدہ کو سچ کر دکھانے والا کہا ہے:

﴿واذکر فی الکتٰب اسمٰعیل انه کان صادق الوعد و کان رسولاً نبیاً﴾ ''اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر کیجئے وہ یقیناً وعدے کے سچے اور نبی مرسل تھے''

حضرت اسماعیل کی ولادت کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے حضرت سارا کی خواہش پر آپ کے فرزند حضرت اسماعیل کو شہر بیت المقدس سے نکال کر سرزمین مکہ بیت اللہ کی جوار میں چھوڑ کر درگاہ خداوندی میں یوں دعا کی:

﴿ربنا انی اسکنت من ذریتی بوادٍ غیر ذی زرع عند بیتك المحرم ربنا لیقیموا الصلوٰة فاجعل افئدةً من الناس تهوی الیهم وارزقهم من الثمرٰت لعلهم یشکرون﴾ ''اے ہمارے پروردگار! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض کو تیرے محترم گھر کے نزدیک ایک بنجر وادی میں بسایا ہمارے پروردگار! تا کہ یہ نماز قائم کریں لہٰذا تو کچھ لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر دے اور انھیں پھلوں کا رزق عطا فرما تا کہ یہ تیرے شکر گزار بنیں'' (ابراہیم/۳۷)

اس وقت سرزمین مکہ میں نہ پانی نہ کوئی سایہ تھا ان کے پاس ایک بوری یا تھیلا رکھا جس میں کھجور اور تھوڑا سا پانی تھا ان دونوں کو چھوڑ کر ابراہیمؑ نے واپسی کی طرف توجہ کی تو ہاجرہ نے حضرت ابراہیمؑ سے کہا آپ کہاں جاتے ہیں آپ ہمیں ایسی وادی میں چھوڑ رہے ہیں جہاں نہ انسان ہے نہ کوئی چیز دو تین بار تکرار کیا لیکن ابراہیمؑ نے جواب نہیں دیا آخر میں ہاجرہ نے کہا یہ خدا کا حکم ہے تو ابراہیم نے کہا ہاں یہ خدا کا حکم ہے ہاجرہ نے کہا تو پھر خدا ہمیں ضائع نہیں کرے گا پھر ابراہیم واپس آ گئے ہاجرہ کی نظروں سے جب ابراہیم اوجھل ہونے لگے تو انھوں نے اس طرح دعا جیسا کہ سورۂ ابراہیم آیت ۳۷ ہاجرہ نے اپنے بچے کو دودھ پلایا وہ پانی بھی پلایا پانی ختم ہوا تو خود اور بچے کو پیاس لگ گئی۔

(قصص قرآن حماد عزاز صفحہ نمبر ۹۴)

حضرت اسحاق وحضرت اسماعیل علیہما السلام آیاتِ قرآن کی روشنی میں:

سورہ کا نام	سورہ نمبر	آیات نمبر
البقرة	۲	۱۴۰،۱۳۶،۱۳۳
آل عمران	۳	۸۴
النساء	۴	۱۶۳
الانعام	۶	۸۴
هود	۱۱	۷۱
يوسف	۱۲	۳۸،۶
ابراهيم	۱۴	۳۹
مريم	۱۹	۴۹
الانبياء	۲۱	۷۲
العنكبوت	۲۹	۲۹
الصافات	۳۷	۱۱۳،۱۱۲
ص	۳۸	۴۸

حضرت اسحاق علیہ السلام

آپ حضرت ابراھیم علیہ سلام کے دوسرے فرزند ہیں۔ حضرت ابراھیم اور حضرت سارہ جب بڑھاپے تک پہنچے اور انکی عمر ایسی تھی اب اور اولاد پیدا نہیں ہو سکتی۔ لیکن خداوند عالم نے انھیں اس وقت اولاد کی بشارت دی جیسا کہ سورہ ھود ۷۲ میں ذکر ہے:

﴿وامرته قائمة فضحكت فبشرنها باسحق ومن ورآء اسحق يعقوب﴾

"اور ابراھیم کی بیوی کھڑی تھیں پس وہ ہنس پڑیں تو ہم نے انھیں اسحاق کی اور اسحاق کے

بعد یعقوب کی بشارت دی"

ملائکہ جب قوم لوط کو غرق کرنے کیلیے آئے تو حضرت ابراھیم کے پاس گئے اور انھیں سلام کیا ابراھیم بہت مہمان نواز تھے لہذا فوراہی اٹھے اور انکے لیے بچھڑے کا بھنا ہوا گوشت لے کر آئے لیکن جب انھوں نے دیکھا کہ مہمان ہاتھ آگے نہیں بڑھا رہے تو پریشان ہوئے کیونکہ مہمان گھر میں آئے اور کھانا نہ کھائے اسکی کیا وجہ ہے۔ تو ملائکہ نے حضرت ابراھیمؑ سے فرمایا آپ پریشان نہ ہوں ہم خدا کی طرف سے قوم لوط کیلیے عذاب لیکر آئے ہیں۔ حضرت سارا جو دروازہ پر کھڑیں تھیں ہنس پڑیں کیونکہ انھیں خوشی ہوئی کہ ایسی قوم پر خدا کا عذاب نازل ہوگا لیکن جب انھوں نے انھیں اسحاق اور پھر یعقوب کے پیدا ہونے کی خوشخبری دی تو انھوں نے اپنے ہاتھ اپنے منہ پر مار کر کہا کیا میں جو ایک بوڑھی ہوں اور میرے شوہر بھی بوڑھے ہیں ہمارے ہاں اب اولاد پیدا ہوگی فرشتوں نے جواب دیا کہ تم خدا کی رحمت پر تعجب کرتے ہو۔ سورہ ھود ۶۹ سے ۷۳۔

اس حوالے سے سلسلہ انبیاء میں حضرت اسحاق اور یعقوب بھی ایک غیر عادی طریقہ سے پیدا ہوئے ہیں۔

ان آیات میں خداوند عالم نے حضرت اسحاق کو غلام علیم کا لقب دیا ہے:

﴿قالوا لاتوجل انا نبشرک بغلم علیم﴾ "کہنے لگے: آپ خوف نہ کریں ہم آپ کو ایک دانا لڑکے کی خوشخبری دیتے ہیں" (حجر/۵۳) ﴿وبشروہ بغلم علیم﴾ "اور انھیں ایک دانا لڑکے کی بشارت دی" (ذاریات/ ۲۸) صافات ۱۱۳،

سورہ ھود ۷۱ سے ثابت ہوتا ہے خداوند عالم نے حضرت ابراھیمؑ اور حضرت سارا کو حضرت اسحاق اور یعقوب کی بشارت دی ہے:

﴿ووھبنالہ اسحق ویعقوب﴾

"اور ہم نے ابراہیم کو اسحاق اور یعقوب عنایت کیے" (انعام/ ۸۵) ابراھیم ۳۵ سے ۴۱۔

فرزندانِ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام

حضرت ابراہیم خلیلؑ اپنے بڑھاپے کی عمر میں اولاد سے یاس و نا اُمیدی ہونے کے بعد جس کی تصریح قرآن کریم نے ان کے زبان سے نقل کیا ہے ان کا صاحب اولاد ہونا اور اولاد بھی ان کے دعاؤں کا ثمر ہونا یہ دونوں باتیں خدا پرستان اور خدا جویانوں کیلئے نمونۂ کامل ہے جس کی تفصیل بعد میں بیان کریں گے آیاتِ قرآن کریم کے مطابق خداوند عالم نے انھیں دو فرزندوں کی بشارت دی اور ان کے نسل سے ایسے انبیاء پیدا کئے ہیں جن سے روئے زمین کو توحید و خدا پرستی کی وزن ثقل کے ساتھ زینت بخشی ہے، یہ دونوں فرزند آپ کی الگ الگ بیویوں سے پیدا ہوئے ہیں ان دونوں زوجات کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے ورنہ صفحات ناقص رہیں گے۔

ان دونوں نبی اور نبی زاد کی حیات کو پیش کرنے سے پہلے ہر ایک کی والدۂ طاہرہ کی حیات کو پیش کریں گے۔

سارہ و ہاجرہ

ایک فرزند کی ماں ہاجرہ ہے کہا جاتا ہے ہاجرہ پہلی بیوی کی کنیزہ تھی انھوں نے اپنی کنیزہ کو اپنے شوہر کیلئے نسل کی خاطر انھیں ہبہ کیا۔ جس سے حضرت اسماعیلؑ ذبیح پیدا ہوئے اسی اسماعیل سے روئے زمین پر زیب و زینت مہر انبیاء پیدا ہوئے یہ اس زوجہ کیلئے باعث افتخار ہے لیکن یہ دوسری زوجہ پہلی بیوی (سارہ) کی ہبہ کردہ کنیزہ ہونے کے بارے میں قرآن کریم میں کوئی تصریح اشارہ نہیں ملتا لیکن جو سلوک حضرت ابراہیم خلیلؑ صاحب شریعت عظمیٰ کے مالک نے اس زوجہ کے ساتھ روا رکھا، اسے اپنے گھر بار اور وطن سے دور دشت بے آب و گیاہ زمین پر نومولود بچے کے ساتھ تن تنہا چھوڑا اس آیت کریمہ کے سراسر خلاف نظر آتا ہے جہاں خداوند عالم نے خطاب کیا ہے اگر بیوی کے درمیان عدالت نہیں کرسکتے ہو تو ایک بیوی پر اکتفا کرو۔ تو ابراہیم نے ایک کی خوشنودی کی

خاطر دوسری بیوی کو طلاق وزوجیت کے درمیان میں بغیر کسی سہارے چھوڑ اایسا کرنا ایک ادنی سے دیندار سے روانہیں بلکہ بے دینوں سے بھی روانہیں سمجھا جاتا۔ چہ جائے کہ ابراہیم خلیلؑ سے ہو لیکن نص آیہ قرآن کے تحت ابراہیم نے اس زوجہ کے ساتھ یہ سلوک کیا یقیناً ابراہیم اس زوجہ سمیت پہلی زوجہ کے احسان مند ہونگے۔اسی وجہ سے خداوندمتعال نے اپنے خلیل کو ان کی رضایت کا پاس رکھنے کا حکم دیا۔

پہلی زوجہ سارہ بنت حاران ابن باخور (حضرت ابراہیمؑ کے چچا) کی بیٹی ہیں جو حضرت ابراہیم کی دعوت توحید میں ان کے ساتھ تھی ایسے ہی جیسے حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے خاتم الانبیاءؐ کا ساتھ دیا۔ حضرت سارہ کی اس احسان مندی کی وجہ سے خداوندمتعال نے بیک وقت سارہ کی نسل سے دونبیوں کو پیدا کرنے کی بشارت دی یعنی حضرت اسحاق وحضرت یعقوبؑ، جبکہ حاجرہ کو اپنی احسان مندی فراموش نہ کرنے' اپنے شوہر خلیل رحمان کی اطاعت میں سرتسلیم ہونے پر ان کے فرزند اسماعیل کی اولاد سے خاتم الانبیاءؐ کو پیدا کیا۔ حضرت خدیجہ کو حضرت محمدؐ کی دعوت میں غربت کے عالم میں شریک دعوت بننے پر حضرت زہرا سلام اللہ علیہا اوران کے فرزندانِ عصمت وطہارت عنایت کئے۔

دونوں فرزندوں کے نام گرامی

۱۔ اسماعیل: اسماعیل کے نام سے قرآنِ کریم میں دو پیغمبروں کا ذکر ملتا ہے:

(۱) اسماعیل بن ابراہیم ہے جنکا ذکر قرآنِ کریم کے ان آیات میں آیا ہے:

﴿وعهدنا الیٰ ابرٰهیم واسمٰعیل ان طهرا بیتی للطّآئفین والعٰکفین والرّکّع السّجود﴾

''اورہم نے اورابراہیم اوراسماعیل پر یہ ذمہ داری عائد کی کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف' اعتکاف' رکوع اور سجدہ کرنے والوں کیلئے پاک رکھو'' (بقرہ ۱۲۵، ۱۲۷، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۴۰) آل عمران/۸۴، نساء/۱۶۳، ابراہیم/۳۹۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام وہ ہستی ہیں جنکا ذکر خداوند کریم نے اپنی کتاب میں حضرت ابراھیم خلیل کے ساتھ ساتھ کیا ہے:

﴿وعهدنا الیٰ ابراهیم و اسمٰعیل﴾ ''اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل پر یہ ذمہ داری عائد کی'' (بقرہ/ ۱۲۵، ۱۲۹، ۱۳۳، ۱۳۶، ۱۴۰)، آل عمران ۸۴، نساء ۱۶۳، انعام ۸۶۔

(۲) دوسرے اسماعیل انبیاءِ بنی اسرائیل میں سے تھے جنکا ذکر قرآنِ کریم کے ان آیات میں آیا ہے:

﴿واسمٰعیل والیسع ویونس ولوطًا و کلًا فضلنا علی العٰلمین﴾ ''اور اسماعیل، یسع، یونس اور لوط سب کو عالمین پر فضیلت ہم نے عطا کی ہے'' (انعام/ ۸۷) انبیاء/ ۸۵، ص ۴۸، ان آیات میں مذکورہ اسماعیل سابق آیات میں مذکور اسماعیل سے مختلف ہیں کیونکہ سابق اسماعیل ابراہیم کے فرزندوں میں سے ہیں وہ اولادِ یعقوب نہیں تھے بلکہ وہ حضرت یعقوب کے چچا تھے جبکہ سورۂ مریم کی آیات ۱ تا ۵۸ کے تحت آٹھ پیغمبروں کے بعد ذکر ہوا ہے یعنی ان چار انبیاء کی اولاد ہے

بعض نے دوسرے اسماعیل کا نام اسماعیل بن حزقیل کہا ہے۔ حضرت اسماعیل بن ابراہیم کو سورۂ مریم آیات ۵۴، ۵۵ میں ''صادق الوعد'' کہا ہے روایت میں اسے دوسرے اسماعیل قرار دیا ہے

بعض آیاتِ قرآنی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ نام کے دو پیغمبر تھے جن میں سے ایک وہ اسماعیلؑ بن حضرت ابراھیمؑ ہیں کہ جو ذبح ہوئے اور جنکا ہمیشہ ابراھیمؑ اور اسحاق کے ساتھ ذکر ہوا ہے اور ایک دفعہ صادق الوعد کہہ کر ان کا ذکر ہوا ہے لیکن سورۂ مبارکہ انعام کی آیات نمبر ۸۶۔۸۷ اور سورۂ مبارکہ ص آیت نمبر ۴۸ سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اور اسماعیلؑ بھی ہیں چنانچہ سورۂ مریم میں اسماعیلؑ کا انبیاء بنی اسرائیل کے ساتھ ذکر ہوا ہے حضرت اسماعیلؑ کی صفات قرآن کریم میں یوں بیان ہوئی ہیں سورۂ بقرہ آیت نمبر ۱۳۶ سورۂ عمران آیت نمبر ۸۴ اور سورۂ نساء آیت نمبر ۱۶۳ میں حضرت اسماعیلؑ کا حضرت ابراھیمؑ اور حضرت اسحاق کے درمیان ذکر ہوا ہے۔

۲۔ ''مرضی'' یعنی خدا ان سے راضی ہے:

﴿......وکان عندربه مرضیا﴾ ''......اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھے'' (مریم/۵۴،۵۵)

۳۔ صابرین میں سے ہیں:

۴۔ صالحین:

﴿انھم من الصٰلحین﴾ ''یقیناً یہ صالحین میں سے تھے'' (انبیاء/۸۶)

۵۔ حلیم:

﴿فبشرنٰه بغلٰم حلیم﴾ ''چنانچہ ہم نے انھیں ایک بردبار بیٹے کی بشارت دی'' (صافات/۱۰۱)

۶۔ اخیار:

﴿......وکل من الاخیار﴾ ''......یہ سب نیک لوگوں میں سے ہیں'' (ص/۴۸)

وفات حضرت ابراہیمؑ:

حضرت ابراہیمؑ کا قرآن کریم میں کثرت سے ذکر ہونے، ان کے اولی العزم اور عظیم المرتبت پیغمبر ہونے کے باوجود قرآن کریم میں کہیں بھی نہ تو ان کی تاریخ پیدائش کا کوئی ذکر ہے اور نہ ہی یہ بتایا گیا ہے انہوں نے اس دار فانی سے کتنے برس کی عمر میں کوچ کیا اگرچہ موجودہ تورات میں ان کی عمر ایک سو پچھتر (۱۷۵) سال بیان ہوئی ہے۔ لیکن تورات میں لکھا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ مکفیلہ مزرعہ عفرون بن صرصر الحتی میں حضرت اسماعیلؑ اور اسحاقؑ نے دفنایا یہیں پر سارہ بھی مدفن ہیں اعادبن ابراہیم ان کی بیوی کا نام قطوریٰ ہے ان سے یہ اولادیں پیدا ہوئی ہیں:

۱۔ زمران

۲۔ یقشان

۳۔ مدان

۴۔ مدیان

۵۔ یشبان

۶۔ شوخا

اس وقت فلسطین کی حبرون نامی جگہ میں دفن ہیں اس وقت اسے مدنیہ خلیل کہتے ہیں قرآن کریم میں حضرت ابراھیمؑ کی اولاد کے سلسلے میں صرف حضرت اسمعیلؑ و اسحٰقؑ کا ذکر ہے لیکن تورات میں لکھا ہے کہ ان کی اور بھی اولاد تھی۔

حضرت اسحاقؑ :

جیسا کہ آیات کریمہ میں آیا ہے حضرت ابراھیمؑ اور ان کی زوجہ جب اپنی عمر کی آخری دور میں داخل ہو چکے تھے اور حضرت سارہ کی عمر نوے سال ہو چکی تھی تو ان کے ہاں بچے کی ولادت کے آثار نمودار ہوئے اور بچے کی پیدائش کے بعد ان کی والدہ نے اسکا نام یضحق رکھا جسے عربی میں یضحق کہتے ہیں یعنی حضرت اسحاق کی والدہ نے ان کی پیدائش پر یہ تصور کیا جو بھی اتنے بوڑھے والدین کے ہاں بچے کی پیدائش کی خبر سنے گا، وہ اس خبر کو سن کر ہنسے گا اس لیے اس بچے کا نام اسحاق رکھا گیا جسے عبرانی میں یضحق کہتے ہیں اور اس کے عربی معنی یضحق یعنی ''ہنسنا'' ہیں۔

حضرت اسحاقؑ نے ایکسواسی (۱۸۰) سال کی عمر پائی۔ ان کی قبر مغارہ مدفیلہ میں ہے جسے آج کل مدینہ خلیل کہتے ہیں حضرت اسحاقؑ کا اسم گرامی سترہ بار قرآن کریم میں تکرار ہوا ہے لیکن ان کا نام ہمیشہ ہی حضرت اسمعیلؑ کے نام کے بعد آیا ہے جس وقت حضرت اسمعیلؑ قربان ہوئے، اس وقت حضرت اسحاق پیدا نہیں ہوئے تھے موجودہ تورات نے یہ کوشش کی ہے کہ سورہ صافات میں جس فرزند ابراھیمؑ کے ذبح کا ذکر ہوا ہے وہ اس کی بجائے حضرت اسحاقؑ کو ذبح ہوتے ہوئے دکھائیں اور لوگوں کے ذہنوں میں یہ بٹھانے کی کوشش کریں کہ حضرت اسمٰعیلؑ نہیں بلکہ حضرت اسحاق ذبح ہوئے تھے کیونکہ قوم بنی اسرائیل حضرت اسحاق کی نسل سے پھیلی ہے لیکن تمام قرآئن و

شواہد اور آیات قرآنی حضرت اسماعیلؑ کے ذبح ہونے کے بارے میں ہیں۔

☆ سیرت طیبہ ابراہیم بت شکن پر قلم اٹھاتے ہوئے سر شرم سے جھک جاتا ہے، کیونکہ جو رویہ حضرت ابراہیم خلیل نے بتوں اور بت پرستوں کے ساتھ اپنایا اسکی تاسی و پیروی کرنا ہمارے لئے مختلف وجوہات کے تحت ممکن نہیں۔ چنانچہ ہم ابراہیم خلیل اور انکے پیروکاروں سے اس کوتاہی پر معذرت پیش کرنے سے پہلے ان وجوہات کے بیان کو ضروری سمجھتے ہیں۔ جس بت پرستی کا ابراہیم خلیل اور دیگر انبیاء کرام کو سامنا تھا، وہ بت پرستی آج کل کی بت پرستی سے چندین حوالوں سے فرق رکھتی ہے۔

ا۔ اس وقت کے بت مختلف شکل وصورت میں ہونے کے باوجود ایک قدر مشترک کے حامل تھے۔ وہ سب مادے سے بنے تھے۔ جبکہ اس دور میں بتوں کی مختلف انواع واقسام ہیں۔ یہاں ایک بت سے جان چھڑانا اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کسی دوسرے بت سے وابستگی قائم نہ کی جائے۔

۲۔ اس وقت کے بت پرستوں نے کہا ہم اپنے بتوں سے دستبردار نہیں ہونگے، یعنی وہ بتوں کو بت سمجھتے تھے۔ جبکہ آج کل کے بت پرست اپنی بت پرستی کو عین دین خدا سمجھتے ہیں۔ ان کا دعوی ہے نہ یہ بت پرستی ہے اور نہ ہی وہ بت پرست ہیں۔ یہاں سوال ہے اگر کوئی ایسے حالات میں انکی مخالفت کرے تو وہ کونسی زبان اور لہجہ استعمال کرے گا۔

لہذا ہمارے لئے حضرت ابراہیم خلیل کا وہ فیصلہ سامنے رہ جاتا ہے، جہاں آپ نے فرمایا میں تم اور تمھارے بتوں سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں، میں اپنے رب کی طرف ہجرت کر رہا ہوں۔ لہذا اس وقت ندا توحید، عمل وزبان سے ممکن نہیں، ہم صرف دل میں ہی انکے خلاف نفرت رکھ سکتے ہیں، اسے لیکر اپنے گھروں کے تہہ خانوں میں بیٹھ سکتے ہیں۔ یہاں اگر کوئی کھلی فضاء کا خواہشمند ہے، تو اسے اس دنیا سے کوچ کرنے کیلئے خدا سے دعا گو ہونا چاہیے۔

کلمات اختتامیہ

اس کتاب شریف کے اختتامی کلمات میں سورہ مطففین کی آیت ۲۶ کے کلمہ ''ختام مسک'' سے متمسک ہوتے ہیں:

﴿ختمہ مسک، وفی ذلک فلیتنا فس المتنافسون﴾ جس پر مشک کی مہر لگی ہوگی اور سبقت کرنے والوں کو اس امر میں سبقت کرنی چاہیے''۔

ختام مسک ایک ایسے اختتام کو کہتے ہیں جس کا انجام طیب وطاہر خوشبو سے ہوتا ہے۔

ختام مسک وغیر مسک میں امتیاز وفرق رکھتے ہوئے خداوند عالم فرماتے ہیں، ختام مسک میں اہل اللہ مقابلہ ومسابقہ میں حصہ لیتے ہیں۔ اور اسی طرح ختام غیر مسک میں اہل دنیا حصہ لیتے ہیں۔ ختام مسک ایک ایسی خوشبو ہے جس کی تلاش میں اہل اللہ ہوتے ہیں۔ جیسا کہ سورہ اعراف آیت ۱۷۰ اور زخرف ۴۳ میں آیا ہے، ختام غیر مسک وہ اختتام ہے جو بدبودار ہے۔

اس کے مقابل میں ''ختام غیر مسک'' جسکا معنی دنیا طلبی ودنیاداری ہے۔ اس میں مقابلہ ومسالمہ کرنے والے اہل دنیا ہیں، ان کا مطلوب ومقصود عیش ونوش دنیا ہے۔ ان کی اڑان کی آخری منزل اور ہدف ونشانی زندگانی اہل مغرب ہے۔ اس مسابقہ میں شامل ہونے والوں کے وسائل وذرائع اور شرائط درج ذیل ہیں:

۱۔ مغربی زبان ۲۔ مغربی ٹیکنالوجی ۳۔ مغربی صنعت ۴۔ مغربی اقدار ۵۔ مغربی سکونت ۶۔ مغربی بینک اکاونٹ ۷۔ خود مغربی ہونا

ایسی شرائط میں سبقت لیجانے والے ہی اس مقابلے میں کامیاب قرار پاتے ہیں۔ اس مقابلہ

دنیا پرستی میں شریک ہونے والوں کا انجام قارئین نے دیکھا ہے، ان کے کھاتے میں سوائے چند دنوں کی خورد ونوش کے اور کچھ بھی نہیں آیا۔ مولا امیر المومنینؑ کے فرمان کے مطابق ان کی قیمت وہی ہے جو اس خورد ونوش کے ہضم ہونے کے نتیجے میں ظاہر ہوتی ہے۔ جہاں تک عزتِ نفس کا سوال ہے، تو اس سلسلہ میں تمام مسلمان دیکھ رہے ہیں جس شکست وریخت اور ذلت ورسوائی اور ناکامی سے یہ دوچار ہیں، یہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ وہ کس خامی کا شکار رہے ہیں، وہ کونسی غلطی ہے جس کا انہوں نے ارتکاب کیا، تاکہ اس کا تکرار نہ ہونے پائے۔ کیا زبان نہیں جانتے تھے، ٹیکنالوجی نہیں رکھتے تھے، صنعت نہیں رکھتے تھے، اقدار کا احترام نہیں کرتے تھے، بینک اکاونٹ نہیں رکھتے تھے، آخر وہ کونسی وجہ تھی جو انہیں شکست فاش ہوئی۔

اب دوسرے مقابلے کی بات کرتے ہیں جس کے میدان کی نشانی موت کے دہانے پر لگی ہوئی ہے۔ اور اس مقابلے کا عنوان رضا وخوشنودی ہے۔ اس مقابلے میں کامیابی کا اعلان آخرت میں ہوگا۔ اس مقابلے کیلیے درکار وسائل مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ زبان قرآن ۲۔ ایمان بہ آخرت ۳۔ خدا کی عدالت پر ایمان ۴۔ راہ انبیاء کی پیروی ۵۔ دنیوی زندگی میں قناعت۔

اہل مشرق گرچہ خود مسلمان نہ بھی ہوں لیکن جس قوم ونژاد کو وہ اپنی پہچان سمجھتے ہیں، اُسے اہل مغرب کسی طور پر بھی اپنے ساتھ مقابلہ ومسابقہ میں شرکت کا اہل قرار نہیں دیتے، مسلمان اگر ذرہ برابر بھی شعور وبصیرت اور غیرت وحمیت رکھتے ہیں تو انھیں چاہئے کہ وہ پیغمبر اکرمؐ کے فرمان مبارک پر عمل کرتے ہوئے پلٹ کر اپنے اسلام کی طرف آجائیں، مغربی دنیا کی طرف سے اپنے اوپر مسلط کی جانے والی اس خطرناک اور بے امان جنگ میں ان مورچوں

سے جہاد کو اپنا شعار قرار دیں۔

تمام مقامی و علاقائی اور اجنبی زبانوں کو اپنی زندگی کی لغت سے نکال کر صرف دو ہی زبانوں ''اردو'' اور ''زبانِ قرآن میں گفت و شنید کو فروغ دیں۔ اب تو یہاں کے مسلمانوں پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی چاہئے کہ وہ سر سید احمد کی پیروی کرتے ہوئے سعادت و کامرانی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ بلکہ انکی سعادت کا واحد ذریعہ قرآن و سنت کی پیروی میں مضمر ہے۔ لہذا انھیں چاہئے انکی روزمرہ لغات میں جہاں کہیں سر سید احمد خان کی زبان ہو اسکی جگہ کلماتِ قرآن کو جاگزیں کریں۔

بعثت انبیاء کے اہداف: سورۂ مبارکہ حدید ۲۵ میں بعثت انبیاء کے بنیادی اہداف کو ''قیام وبالقسط'' قرار دیا ہے: ﴿لقوم الناس بالقسط﴾ ''تاکہ لوگ عدل قائم کریں''

قیام مادۂ قوم سے ہے اس کلمہ کیلئے ماہرین لغتِ عرب نے چند معانی ذکر کیے ہیں، ایک کسی چیز کو ہمیشہ نظر میں رکھنا اور غفلت نہ برتنے کے معنوں میں آیا ہے سورۂ مائدہ آیت ۸ میں ہے کہ ہمیشہ خدا کو نظر میں رکھیں اور اپنے قیام کو خدا کیلئے مختص کریں:

﴿کونوا قوامین للہ شھدآء بالقسط﴾ ''اللہ کیلئے بھرپور قیام کرنے والے اور انصاف کے ساتھ گواہی دینے والے والے بن جاؤ''

چنانچہ سورۂ فرقان آیت ۶۷ میں آیا ہے کہ ہم نے اپنے دین میں قیم رہیں یعنی دستوار رو پا ئیدار اور راہِ راست پر رہیں ذرہ بھر انحراف نہ کریں۔

﴿وکان بین ذلک قواما﴾ ''بلکہ ان کے درمیان اعتدال رکھتے ہیں''

قسط: (ق س ط) ان تینوں حروفوں سے مرکب کلمہ قسط کے ارباب لغت نے کتب لغت میں دو متضاد معنی نقل کیے ہیں۔ (ق) کو زبر لگا کر پڑھنے کی صورت میں اس کلمہ کو ظلم

قرار دیا ہے یعنی دوسروں کے حقوق کو ہڑپ کرنا' تجاوز کرنا اور راہ حق سے انحراف کرنے کیلئے استعمال ہوا ہے چنانچہ اس معنی میں سورۂ مبارکہ جن کی آیت ۱۵ میں آیا ہے قاسطین جہنم کا ایندھن ہیں:

﴿وماالقاسطون فکانو الجهنم حطبًا﴾ ''اور جو منحرف ہو گئے وہ جہنم کا ایندھن بن گئے''

اس کلمہ کے ''ق'' کو زیر لگا کر پڑھنے کی صورت میں اس کے معنی عدالت خواہی' داد گیری' عدل وانصاف پسند ہونا' راہِ راست پر ہونا اور عدالت رواج دینے کے معنوں میں استعمال ہوا ہے چنانچہ اس معنی میں سورۂ حجرات ۹ میں آیا ہے:

﴿فاصلحوا بینهما بالعدل واقسطوا ان الله المقسطین﴾ ''ان کے درمیان عدل کے ساتھ صلح کرادو اور انصاف کرو یقیناً اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے''

خداوند عالم عدالت خواہی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے سورۂ اسراء ۳۵ اور سورۂ شوریٰ ۸۲ میں انھی معنوں کیلئے آیا ہے:

ان دو کلمات کے آیات کے مطابق معنی واضح ہونے کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ اس وقت ہم عالمی استعماری طاقتوں کے نرغے میں آ گئے ہیں، قوم ہود کیلئے آنے والے مہلک بادل ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں۔ یہ صورت حال حسب قرآنِ کریم ہمارے ہاتھوں کی کمائی ہے۔ پیغمبر اکرمؐ کی حدیث کے مطابق جب بھی ظلم وستم کی تاریکی رات کی مانند تمہارے اوپر چھا جائے تو تم قرآن کریم کی طرف رجوع کرو تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس روزگار کا ہمیں کیوں سامنا کرنا پڑا ہے۔ قرآنِ کریم میں ہمیشہ دو ایسے نجات دھندگان کی طرف رہنمائی کی گئی ہے، ایک کتاب خدا یعنی قرآن کریم اور دوسرا انبیاءِ کرام ہیں۔

انبیاءِ کرام کی سیرت طیبہ جو قرآن کریم میں موجود ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ ہمارے گزشتہ

قیام اللہ کیلئے نہیں تھے کیونکہ خدا کی راہ میں قیام کرنے والوں کیلئے وعدہ خدا ہے کہ وہ انکی صحیح راستہ کی راہنمائی کرے گا۔ہم اپنے گزشتہ قیاموں کی طرف توجہ کریں تو ان تین قیاموں میں دو قسم کے قیام ہمارے اوپر حاوی تھے۔ایک قسم کے قیام کا فقدان تھا،ہمارا ایک قیام جماعت اور قومیت یعنی قوم وملت کیلئے تھا اور دوسرا قیام تنظیمی ، یہ دونوں قیام قرآن کریم اور سیرت انبیاء سے اجنبی ہیں ۔قرآن کریم نے قیام قوم پرستی اور قیام تنظیمی کو شیطانی قیام قرار دیا ہے۔ قوم پرستی' عصبیت وجاہلیت کی نمائندگی کرتی ہے جبکہ تنظیم ان کی سربرآوردہ شخصیات کے نفس امارہ کی ترجمانی کرتی ہے۔ یہ دونوں آخر میں قیام شیطانی سے جاملتے ہیں، لہذا ہمیں قرآن اور سیرت انبیاء پر قائم رہنے کیلئے آنے والے دنوں میں ان دو شیطانی قیام سے اجتناب کرنے کی ضرورت ہے۔

قرآنی فتوی

تاریخ انبیاء میں ملتا ہے، مفاد پرستوں نے انبیاء کی دعوت میں مزاحم ہونے کیلئے ہمیشہ ان پر فتنہ سازی کی تہمت لگائی ہے۔ کیونکہ جب بھی کوئی نبی آتا تو معاشرہ دو گروہوں میں تقسیم ہوتا، ایک گروہ انبیاء کی دعوت کو قبول کرتا جبکہ دوسرا انکی مخالفت کرتا۔یہ تسلسل معاویہ کے دور میں بھی جاری رہا، یہاں تک کے جمعہ کے خطبوں میں حضرت علیؑ کو فساد وفتنہ پھیلانے والا قرار دے کر ان پر سب وشتم کرنے کو رواج دیا گیا۔اسی طرح جب امام حسین علیہ السلام نے قیام کیا تو یزیدی دسترخوان پر پلنے والوں نے آپ پر فتنہ پھیلانے کی تہمت لگائی۔لہذا باطل کو فروغ دینے والوں کی یہ سیرت ہے جو تسلسل سے جاری ہے۔ آج بھی اسے جدید فتوی کا نام دے کر فروغ دیا جارہا ہے،اہل بصیرت کو ان فتووں سے آگاہ رہنا چاہیے۔

مصادر و مآخذ کتاب انبیاء قرآن

مصادر و مآخذ کتاب انبیاء قرآن

تفاسیر اور قرآنیات

☆معجم المفهرس الفاظِ قرآن کریم	محمد فؤاد عبدالباقی
☆معجم المفهرس الفاظ القرآن الکریم	محسن بیدارفر
☆کشاف الموضوعی القرآن الکریم	دارالقرآن الکریم
☆معجم مفصل لمواضع القرآن	محمد خلیل عیستانی
☆المقطف من عیون التفاسیر	مصطفی الحصن منصوری
☆التفسیر التبیان	الشیخ طوسیؒ
☆التفسیر المجمع البیان	طبرسی
☆التفسیر الشبّر	سید عبد اللّٰہ شبّر
☆التفسیر الصافی	فیض کاشانی
☆التفسیر دُرِ المنثور	جلال الدین سیوطی
☆التفسیر الکبیر	علی امام فخرالرازی
☆الفسیر البیان	آیت اللّٰہ ابوالقاسم الخوئی
☆تفسیر المیزان۔	آیة اللّٰہ محمد حسین طباطبائی
☆تفسیر الفرقان	آیة اللّٰہ محمد صادقی تہرانی
☆التفسیر المنیر	الدکتور وھبہ الزحیلی
☆تفسیرِ الشعراوی	الشیخ محمد متولی الشعراوی

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆ایسر التفاسیر	ابوبکر جابر الجزائری
☆تفسیرفی ظلال القرآن	سیدقطب شہید
☆تفسیرجلالین	جلال الدین سیوتی
☆امالی سید مرتضی	سید مرتضی علم الہدیٰ
☆تفسیرالمنار	شیخ محمدعبدہ
☆صفوۃ التفاسیر	الصابونی
☆من وحی القرآن	السید محمد حسین الفضل اللہ
☆تفسیر نظم الدرر فی تناسب الآیات و السّو ر	البقا ئینی
☆تفسیر النور الثقلین	الشیخ عبد علی بن جمعۃ الحویزی
☆التفسیر البرہان	علامۃ بحرانی
☆تفسیر الوجیز	وھبۃ الزحیلی
☆تفسیرتفہیم القرآن	ابواعلیٰ مودودی
☆تفسیرنمونہ	آیت اللہ مکارم شیرازی
☆تفسیرموضوعی	آیت اللہ جوادآملی
☆تفسیرموضوعی	آیت اللہ مکارم شیرازی
☆تفسیرموضوعی	آیت اللہ جعفرسبحانی
☆من ہدی القرآن	آیۃ اللہ محمد تقی مدرس

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆تفسیر قرآن	محی الدین ابن عربی اندلیسی
☆تفسیر مبہمات القرآن	البلنسی
☆تفسیرالکاشف	علامہ جوادمغنیہ
☆تفسیر ابن بادیس	علامہ ابن بادیس
☆التفسیر و المفسّرون فی ثوبہ القشیب	آیت اللہ ہادی معرفت
☆تفسیروالمفسرون	دکتورمحمدحسین ذہبی
☆علوم القرآن عندالمفسرین	مرکزثقافہ والمعارف القرآنیہ
☆تفسیرنوین	بانوئ ایران
☆تفسیر بہ راہ ی	آیت اللہ مکارم شیرازی
☆تفسیر القرآن الکریم	محمد علی تسخیری و نعمانی
☆تفسیر ابن عربی	محی الدین العربی
☆نحو التفسیر موضوعی لسور القرآن الکریم	مہمد الغزالی
☆منہج البیان فی التفسیر القرآن	السید ابن حسن الرضوی
☆محاضرات فی تفسیر القرآن الکریم	سید اسماعیل الصدر
☆تسنیم تفسیر القرآن	آیت اللہ جواد آملی
☆زاد التفسیر	جمال الدین قریشی بغدادی
☆التفسیر و المفسرون	الدکتورمحمدحسین الذہبی
☆قواعد التفسیر	خالدبن عثمان السبت

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆تفسیر اسئلة القرآن المجید و اجوبتها	عبد القادر الرازی
☆تفسیرفتح القدیر	محمدعلی بن محمد الشوکانی
☆دانش نامہ قرآن	بهاالدین خرمشاهی
☆الکشاف عن حقائق عوامض التزیل	زمخشری
☆در سهیائی از علوم القرآنی	دکتر حبیب اللّٰہ طاهری
☆معجم مفردات الفاظ قرآن	راغبِ اصفهانی
☆معجم التعبیرات القرآنیة	محمدادریس
☆ قاموس قرآن	سید علی اکبر قرشی
☆فرهنگ نامه قرآنی	استان قدس رضوی
☆ترجمه قرآن کریم	علامہ شیخ محسن علی نجفی
☆ترجمہ قرآن کریم	علامہ جوادیؒ
☆ترجمہ قرآن کریم	ابو الأعلی مودودی
☆بررسی و ترجمه انفال	آیت اللّٰہ محمدی گلپایگانی
☆الحرکة الجهادیة فی سورة الناس	پاسدارش ۵۰ ص۶۷
☆ المدرسة القرآنیة	آیة اللّٰہ سید محمد باقر الصدرؒ
☆اسس الایمان فی القرآن	آیت اللّٰہ محمد الیزدی
☆الاتقان فی علوم القرآن	علامہ جلال الدین السیوطی
☆پرسش و پاسخهای قرآنی	محمدبن ابی بکررازی

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆منهاج الجدل	الدکتورزاهرعواض الالمعی
☆احکام القران	قاضی ابی بکر ابن عربی
☆فتوحات مکیه	محی الدین ابن عربی
☆الکون و الارض و الانسان فی القرآن العظیم	عبد الحمید
☆درسهایی از علوم قرآنی	دکتر حبیب اللّٰہ طاهری
☆روش شناسی تفسیر قرآن	محمود رجبی
☆علوم القرآن عند المفسرین	مرکز الثقافة و المعارف القرآنیه
☆فی ضلال القران	محمدجعفرالشس الدین
☆پژوهشی پیرامون تدبّردرقرآن	ولی اللّٰہ نقی پورفر
☆الاعجازفی نظم القرآن	الدکتور محمود السید شیخون
☆الانسان فی القرآن	عباس محمود عقات
☆ الحوار فی القرآن	آیت اللّٰہ فضل اللّٰہ
☆اسرارالآیات	صدر الدین شیرازی
☆التعریف والاعلام	عبدالرحمٰن السهیلی
☆الاشتراك اللفظی فی القرآن الکریم	محمد نور الدین المنجد۔
☆معجزة القرآن الجدیده بنیة الآیات و السور	عمر النجد
☆اسلوب دعوت فی القرآن	آیت اللّٰہ فضل اللّٰہ

نام کتاب	تالیف' جلد' شمارہ
☆الفرقان والقرآن	الشیخ خالدعبدالرحمٰن العک
☆القرآن فی السلام	السید محمد حسین طباطبائی
☆قرآن و عرفان و برھان	استاد حسن زادہ آملی
☆اطلس القرآن	الدکتور شوقی ابو خلیل
☆گنجینہ معارف قرآن	ابو الفضل فخر السلام
☆القرآن حکمۃ الحیاۃ	السید محمد تقی المدرسی
☆اسرر التکرار فی القرآن	عبدالقادر احمد عطا
☆البیان فی روائع القرآن	الدکتور تمام حسان
☆دراسات فی القرآن۔الکریم	الدکتورمحمد ابراھیم الحفناوی
☆النھی فی القرآن الکریم	الدکتور جمال ادین المصری
☆الکتاب و القرآن	الدکتور محمد شحرور
☆القواعد الحسان لتفسیرالقرآن	شیخ عبد الرحمن بن ناصر
☆موجزعلوم القرآن	الدکتوردائودالعطّار
☆درّۃ الرنزیل وغرۃ التّاویل	ابی عبداللّٰہ خطیب الا سکا فی
☆المدخل لعلم تفسیر کتابِ اللّٰہ تعالیٰ	ابی النّصر حدادی
☆ملاك التاویل	احمدبن زبیرالغرناطی
☆قواعدالتّدبرالامثل	عبدالرحمٰن حسن حبنکہ المیدانی

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆من وحی القرآن	آیة اللّٰہ محمد حسین فضل اللّٰہ
☆مجازات القرآن	شریف الرضی
☆معالم القرآن فی عوالم الاکوان	الشیخ احمدمحی الدین العجوز
☆۵۵۰ معمای قرآنی	محمد حسین قاسمی
☆التصویر الفنی فی القرآن	سید قطب
☆القرآن فی شہر القرآن	الدکتور عبدالحلیم محمود
☆شناخت قرآن	محمود رجبی، محمود اعراقی
☆التعریف و اعلام	عبد الرحمن السہیلی
☆من قضایا الاعلام فی القرآن	رمضان الاوند
☆سیر تحول قرآن و حدیث	علی فاضل عبد الرحمٰن انصادی
☆معرفت شناسی در قرآن	سید ہسین ابراہیمیان
☆فی رحاب اللّٰہ اضواء علی دعاء کمیل	عز الدین بحر العلوم
☆النہی فی القرآن الکریم	جمال الدین المصری
☆الفرقان و القرآن	الشیخ خالد عبد الرحمٰن العک
☆مجموعہ۔ سخنرانیہا و مقالات	کنفرانس تہقیقاتی و مفاہیم قرآن
☆القیامة بین العلم و القرآن	الدکتور داود سلمان السعدی
☆اعجاز قرآن	علامہ سید مہمد ہسین طباطبائی

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆قرآن باب معرفت اللّٰه	امام خمینیؒ
☆العلاقة الجنسية فی القرآن الكريم	محمد مهدی الاصفی
☆الظواهر الجغرافية بين العلم و القرآن	عبد العليم عبد الرحمٰن خضر
☆معطيات آية الموده	السيد مهمود الهاشمی
☆پایه ها ی اساسی شناخت قرآن	عبد الفتاح طباره
☆الكون والارض والانسان فی القرآن الكريم	رحا عبد الحميد عرابی
☆برهان قرآن	صدر الدين بلاغی
☆معيارها و عوامل تمدن از نظر قرآن	بنياد باقر العلوم
☆نقدی وبرسير تحول القرآن	علی الرضا صدر الدين
☆من الذرة الی المجرة	حمادة احمد العائدی
☆قرآن ثقل اکبر	سيد علی کمالی دزفولی
☆دراسات تاريخية من القرآن الكريم	محمد بيومی مهران
☆البرهان فی نظام القرآن	محمد عناية اللّٰه اسد سبحانی
☆الجنس فی التصور الاسلامی	محسن محمد عطوی
☆حول القرآن	آية اللّٰه الفانی الاصفهانی
☆قرآن در عصر فضا	دکتور سيد عبد الرضا حجازی
☆دستور الخلاق فی القرآن	دکتور محمد عبد اللّٰه دراز
☆الانحرافات الكبرىٰ	سعيد ايوب

نام کتاب	تالیف' جلد' شمارہ
☆اسالیب البیان فی القرآن	سید الجعفر الحسینی
☆قبس من نور القرآن الکریم	الشیخ محمد علی الصابونی
☆ملاحم القرآن	الشیخ ابراهیم انصاری
☆متشابهات القرآن و مختلفه	محمد بن علی شهر آشوب
☆قاموس القرآن	عبد العزیز سید الاهل
☆تلخیص البیان فی مجازات القرآن	سید شریف الرضی
☆مباحث فی علوم القرآن	الدکتور صبیح الصالح
☆الکشاف عن حقائق غوامض التنزیل	زمخشری
☆رحمة من الرحمٰن فی تفسیر و اشارات القرآن	محی الدین ابن العربی
☆حقائق هامة حول القرآن الکریم	سید جعفر جعفر مرتضی العاملی
☆سوگندهای قرآن	استاد جعفر سبهانی
☆زوال اسرائیل	شیخ اسعد بیوض التمیمی
☆ادیان آسمانی و مسئلة تحریف	سید مرتضی عسکری
☆لباب نقول فی اسباب النزول	جلال الدین عبد الرحمن السیوطی
☆درآستانه قرآن	وکتور محمود رامیار
☆نامه هدایت	دکتور محمد مهدی رکنی
☆الفصحی لغة القرآن	انور الجندی

نام کتاب	تالیف' جلد' شمارہ
☆آسمان وزمین و ستاره گان از نظر قرآن۔	آیت الله محمدصادقی
☆بشارت عهدین۔	------------
☆بشارات و المقارنات۔	------------
☆نهاية الكون بين العلم و القرآن	محسن عبد الصاحب المظفر
☆تفسير القرآن الكريم	صدر المتالهين
☆پژوهشی درباره قرآن و تاریخ آن	سيد محمد باقر حجتی
☆واژه های قرآن	سید حسین شفیعی دارابی
☆الايات العجاب فی رحلة الانجاب	حامد احمد حامد
☆عجائب القرآن	السيد الجميلی
☆وجوة قرآن	ابو الفضل حبيش بن ابراهيم تفلیسی
☆مباحث فی تفسير الموضوعی	الدكتور مصطفی مسلم
☆دراسات فی القرآن الكرين	علی مهمد الاصفی
☆من اشعه القرآن	محمد امين زين الدين
☆شگفتیها ازاعجاز در قرآن	الدكتور محمد جمال الدين فندی
☆کلید های فهم قرآن	علی رضا صدرلدینی
☆القرآن والا حوال المناخية	محسن عبدالصاحب المضفر
☆علوم طب فی القرآن۔	استاد خليل
☆تفسيرالآيات فی كتاب التكامل فی الاسلام	استاد احمدامين

نام کتاب	تالیف٬ جلد٬ شمارہ
☆رحلة المدرسية۔	آیت اللہ جوادبلاغی
☆سیر تحول قرآن و حدیث	علی فاضل عبدالرحمن انصاری
☆افسانہ تحریف قرآن	رسول جعفریان
☆رسالت قرآن	آیت اللہ جوادی آملی
☆آشنائی با قرآن	استاد مرتضی مطھری
☆علوم قرآن یا تفسیر موضوعی	آیت اللہ مرتضی حائری یزدی
☆علوم القرآن	السید محمد باقر الحکیم
☆السنن التاریخیة فی القرآن المجید	الشیخ الزکابی
☆بحوث فی تاریخ القرآن و علومه	ابو الفضل میر محمدی
☆الکون والانسان بین العلم و القرآن	بسام دفضع
☆اسرار الکوب فی القرآن	الدکتور داؤد سلمان السعدی
☆القرآن الکریم و روایات المدرستین	السید مرتضیٰ العسکری
☆شناخت شناسی در قرآن	آیت اللہ جواد آملی
☆بحوث فی اصول التفسیر و مناهجة	فهد بن سلیمان الرومی
☆منهج القرآن فی تطویر المجتمع	الدکتور محمد البهی
☆القرآن الکریم و التوراة و الانجیل و العلم	موریس بوکائی
☆سنتهائی اجتماعی در قرآن کریم	احمد حامد مقدم

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆سورۃ اعلی و زلزال	ملا صدرا
☆هدایت در قرآن	آیت اللّٰہ جواد آملی
☆قرآن و کتابهائی دیگر آسمانی	شهید سید عبد الکریم هاشمی نژاد
☆الی لقرآن الکریم	الامام محمود شلتوت
☆الظاهرة القرانیة	مالك بن نبی
☆الاعتذار محمد و القرآن	جان دیون پورت
☆المبادی العامة لی تفسیر القرآن الکریم	دکتور محمد حسین علی الصغیر ا
☆فرهنك رائد الطلاب	جبران مسعود
☆النظرية الاجتماعیه فی القرآن الکریم	ڈاکٹر زهیر العرجی
☆الاستشراق فی میزان نقد الفکر الاسلامی	ڈاکٹر احمد عبد الکریم سابح
☆تاریخ از دیدگاہ امام علیؑ	علامہ محمد تقی جعفری
☆استناد به قرآن کریم در کلام معصومینؑ	محمد تقی واحدیان
☆آیت های و هدایت هائی پیامبران	ابو القاسم تجری
☆تاریخ الانبیاء حماسه بت شگنان	عزیز اللہ کاسب
☆الظاهرة القرآنیه	مالك بن نبی

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ

ترجمہ و شروحات نہج البلاغہ

☆ شرح	محمّد عبده
☆شرح نهج البلاغه۔	ابو القاسم الخوئی علیه الرحمه
☆شرح نهج البلاغه .	ابن ابی الحدید
☆شرح نهج البلاغه	میثم بحرانی
☆شرح و ترجمه .	علامه محمد تقی جعفری
☆فی ضلال نهج البلاغه	علامه محمد جواد مغنیه
☆ترجمه	علامه ذیشان حیدر جوادی
☆ترجمه	علامه مفتی جعفر
☆قاموس نهج البلاغه	محمد علی شرقی
☆معجم نهج البلاغه	علامه محمد دشتی و محمد کاظم
☆ترجمه هنج البلاغه ۔	آیت اللّٰه ناصر مکارم شیرازی
☆ترجمه .	محمد جواد فاضل
☆الدلیل الی موضوعات نهج البلاغه	--------------
☆معجم موضوعی نهج البلاغه	--------------
☆مصادر نهج البلاغه	--------------
☆خوارج از دیدگاه نهج البلاغه	آیة اللّٰه نوری همدانی

نام کتاب	تالیف٬جلد٬شمارہ
☆فی رحاب نہج البلاغہ۔	آیۃ اللّٰہ شہید مرتضی مطھری
☆نظامِ حکم دالأرادہ فی نہج البلاغہ	مہدی شمس الدین
☆شرح نہج البلاغہ	آیۃ اللّٰہ منتظری
☆فرھنك آفتاب	حمیدمعادیخواہ
☆تصنیف نہج البلاغہ	لفیف بیضون
☆نہج البلاغہ	صبحی سالم
☆ترجمہ نہج البلاغہ	علامہ جوادی
☆ترجمہ ھنج البلاغہ	علامہ مفتی جعفر

دعاوعرفان

نام کتاب	تالیف٬جلد٬شمارہ
☆صحیفہ سجادیہء	امام زین العابدینؑ
☆سلوك عرفان	آیت اللّٰہ جواد ملکی تبریزی
☆شرح الصحیفہ السجادیہ	محمد باقر بن محمد شفیع الحسینی
☆شرح دعای صباح	آقا نجفی قوچانی
☆شرح دعای صباح	مصطفیٰ بن محمد ھادی خوئی
☆شرح دعاء الصباح	الحاج ملاھادی السبزواری
☆انیس اللیل در شرح دعای کمیل	شیخ محمد رضا کلباسی
☆سراج الصعود لیمعارج الشھود	محسن بینا

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆فصوص الحکم	محی الدین ابن عربی
☆نصوص الحکم برفصوص الحکم۔	آیت اللہ حسن زادہ آملی
☆ شرح دعاء مکارم اخلاق	استاد محمدتقی فلسفیؒ
☆شرح دعاء عرفہ	ملامحمد فاضل خراسانی
☆وصال العارفین شرح دعاء عرفہ	احمد زمرودیان
☆شرح دعاء ندبہ	--------------
☆ شرح دعاء افتتاح	--------------
☆عشق ورستگاری	--------------
☆فی رحاب دعاء افتتاح	آیۃ اللہ فضل اللہ
☆فی رحاب دعاء کمیل	آیۃ اللہ فضل اللہ
☆شرح زیارت جامعہ	آیۃ اللہ احمدالاحسائی
☆العرفان الاسلامی	آیۃ سیدمحمدتقی مدرسی
☆معرفت شناسی درعرفان	سیدحسین ابراھیمان
☆شرح دعاء جوشن کبیر	محمدعلی رامھر مزی
☆سلوک عرفان	آیۃ اللہ جوادملکی تبریزی
☆تازیانہ سلوک از	آیت اللہ استاد حسن حسن زادہ آملی
☆نور علیٰ نور۔	آیت اللہ حسن حسن زادہ آملی
☆اسماء اللہ الحسنیٰ	عبد اللہ بن صالح بن الغصن

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆اسماء اللہ الحسنی	دکتور حسن عز الدین
☆اسماء و صفات	شیخ عماد الدین احمد حیدر
☆اسماء اللہ الحسنی	محمد بن ابی بکر الزرعی دمشقی
☆شرح اسماء اللہ الحسنی	دکتورۃ حصۃ بن عبد العزیز الصغیر
☆اللہ اسم الاعظم	دکتور عبد اللہ بن عمر الدمیجی
☆القول الاسنی فی شرح اسماء اللہ الحسنی	مجدی منصور شوری
☆مقجم اسماء اللہ الحسنی	سید احمد محسب مرسی
☆کتاب الدعا	مصطفی عبد القادر عطا
☆فلاح السائل و نجاح المسائل	السید ابن طاؤوس
☆شرح الاسماء و شرح دعا الجوشن الکبیر	الحاج ملا ھادی سبزواری
☆کمیل محرم اسرار امام علیؑ	ناموس عرفان
☆اسماء الھی ازدیدگاہ قرآن و عرفان	رضا رمضانی گیلانی
☆اسماء اللہ الحسنی	عبد العظیم ابراھیم فرج
☆معرفت شناسی در عرفان	سید حسین ابراھیمیان
☆خواص الاسماء الحسنی و شرح معانیھا	ضیاء الدین الاعلیمی
☆فی رحاب اللہ اضواء اعلی دعاء کمیل	عز الدین بحر العلوم
☆الدعاء عند اھل البیت	محمد مھدی الآصفی

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆تصحیح الدعاء	بکر بن عبد اللّٰہ بن ابو زید
☆موسوعۃ لہ الاسماء الحسنی	الدکتور احمد الشرباصی
☆اصول النظام اجتماعی فی السلام	الامام محمد الطاہر بن عاشور
☆الاسلام بین العلماء والحکام	عبد العزیز البدری

کتب تاریخ وسیرت

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆احکام السرۃ و البیت المسلمہ	شیخ محمد متولی شعراوی
☆السیرۃ النبویہ۔	شیخ محمد متولی شعراوی
☆تشریع الاسلامی،مناھجہ و معاصرہ	سلمان العید،
☆الاسلام والتطور الاجتمائی۔	عبدالعالی المظفر
☆ابعاد عالمیۃ فی عقیدۃ الاسلامیۃ ، عبد الکریم	فکر اسلامی ش۸ص۱۷۳
☆الاسلام فی مشاکل المجتمعات الاسلامیۃ	دکتور محمد البھی
☆العودۃ الی الاسلام لمنہاج وحل لمشکلات	محمد سعیدرمضان البو طی
☆الثورۃ الاسلامیۃ عقباتھا و مکاسبھا	خطب ھاشمی رفسنجانی
☆طاغوت۔	محمود حکیمی
☆الحریۃ و الفکریۃ ،ادواتھا اطرھا	رئیس التحریر فکر اسلامی ش ۱۱
☆الحرکۃ الاسلامیۃ، ھموم و قضایا	آیۃ اللّٰہ فضل اللّٰہ
☆دورالشعار فی النظریۃ الاسلامیۃ	سید محمد باقر الحکیم فکر اسلامی

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆حداثة الفكر و متانة الطرح ،كلمة هيئة التحرير مجله فكر اسلامى ش١٧ ص٤	
☆تاريخية ،	هانى ادريس،مجله بصائر ش١١

معاجم وقوامیس

☆لسان العرب	ابن منظور
☆تاج العروس	--------------
☆المنجد	--------------
☆لسان للسان تهذيب لسان العرب	ابى الفل جمال الدين محمد بن مكرم
☆قاموس اللغات	--------------
☆قائد اللغات	--------------
☆انوار اللغات	--------------
معجم الموضوعات المطروقة	--------------
☆آئینه اردو لغت	--------------
☆اظهر اللغت	--------------
☆فیروز اللغت	--------------
☆حسن اللغت	--------------
☆فرهنك فرهنك رائد الطلاب	--------------
☆فرهنك آصفى	--------------

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆فرهنك عميد	--------------
☆لغات علمى	--------------
☆كشاف اصطلاحات	--------------
☆معجم فقه۔ جواهرى	--------------
☆كشاف الفنون	--------------
☆معجم و مؤلفين	--------------
☆موسوعة كشاف اصطلاحات	--------------
☆الفنون و العلوم	علامه محمد التحانوى

فرہنگ فرق ومذہب اسلامی وکتب عقائد شیعہ

☆فرهنكِ فرق شيعه اشكورى	--------------
☆فرق معاصر	--------------
☆قاموس المذاهب والاديان	حسين على حمد
☆دائرة المعارف الأسلاميه الشيّعه (١١ جلد)	حسن الأمين
	دارالتعارف للمطبوعات بيروت
☆الفرق بين الفرق	--------------
☆قاموس مذاهب واديان	--------------
☆معيارشرك فى القرآن	--------------

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆دراسات فی العقیده الأسلامیه	محمد جعفر شمس الدین دار المتعارف
☆تحلیل وحی از دیدگاه اسلام ومسیحیت	محمد باقر سعیدی روشن
☆دعوة التقریب بین المذاهب الأسلامیه	دارالجواد
☆فلسفه دین	محمد حسین زاده
☆عقلیات اسلامیه	محمد جواد مغنیه ۲ جلد دارالجواد
☆تمهید الاصول در علم کلام اسلامی	الشیخ محمد بن الحسن الطّوسی
☆الاسلام دروس فی اصوله و أحکامه	نخبة من الاساتذه
☆اصول العقیده فی التوحید و العدل ۲ جلد	السید مهدی الصدر دار الزهراء
☆معاد شناسی	آیة الله الطهرانیؒ
☆الله شناسی	آیة الله الطهرانیؒ
☆حقائق الاسلام و اباطیل خصومه	عباس محمود العقاد المکتبة العصریّه بیروت
☆ادیان معتقدات العرب قبل الاسلام	ڈاکٹر سیح دغیم
☆الفرق بین الفرق	عبدالقاهر بغدادی اسفرانی
☆نصرانیة و التبشر	توحید۴۷،۴۶ ص۲۲،۱۳۳
☆اصل اصول شیعه	آیت الله محمدحسین کاشف الغطاء
☆عقائدامامیه	آیت الله شیخ محمدرضامظفر
☆عقائدامامیه	آیت الله سیدابراهیم جنجانی

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ

☆شیعه دراسلام — آیت الله سیدمحمدحسین طباطبائی

☆عقائدامامیه — علامه جوادمغنیه

☆عقائد الأماميه الأثنیٰ عَشريَّة — آیت الله ابراهیم الزنجانی النجفی

۳ جلد مؤسّسه الوفاء بیروت

☆نهج الحق و كشف الصِّدْق لِلأمام الحسن بن یوسف العلامه الحلی

مؤسّسه دارالهجرة

☆مجموعه رسائل اعتقادی — علامه محمد باقر مجلسی

☆عقائد الاسلام من القرآن الكريم السید مرتضی العسکری — ۲ جلد

☆روح التَّشَيُّعْ — سماحة الشيخ عَبد الله نعمة — دارللفكر اللبنانى

☆درساتٌ فی عَقائِد الشِّیعة الامامیة السید محمد علی الحسنی العاملی

مؤسسه النعمان

☆العقائد الاسلاميه — محمد جواد مالك — مؤسسه البلاغ — بيروت

☆الإمامة من أبكار لْأفكار فی اصول الدين سيف الدِّين الآمدی

دارللکتاب العربی

☆الشیعه واهل بیتؑ — احسان ألهی ظهیر — اداره ترجمان السُّنَّة

☆الشيّعه والتشيُّع فِرَق وَ تاريخ — أحسان ألهی ظهیر — اداره ترجمان السُّنَّة

☆تاريخ الاماميّه وأسلافهم من الشيعه — الدّكتور عبد الله فيّاض

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
موسسه الاعلمی للمطبوعات	
☆أظهار الحق	رحمة الله بن خليل الرحمن الهندی دارالكتاب العلميه بيروت
☆شبهات حول الشيعه	عباس علی الموسوی
☆الأمامه فی ضوء الكتاب والسّنة	الشيخ مهدی السّماوی
☆السقيفه والخلافة	عبد الفتاح عبد المقصود مكتبه غريب
☆الشيعه فی الميزان	محمد جواد مغنيه دارالتعارف للمطبوعات
☆ الشيعه فی التاريخ	محمد حسين الذين مكتبه النجاح
☆ التشيع نشوؤه مراحِلُهُ مُقومات عبد الله الغُريفی	
☆جهاد الشيعه	الدكتور سميرة مختار الیثی دار الجيل بيروت
☆اليوم الموعود	محمد الصدر مكتبه الامام امير المؤمنين ايران
☆پاسخ شبهاتی پیرامون مکتب تشیع	عباس علی موسوی
☆الوحدة العقائديّة عند السُّنة والشيعه الدكتور عاطف سلام دارالبلاغه	
☆امام شناسی	آية الله الطهرانی
☆ولایت وعلم امام	مؤسسه انتشارات امیر کبیر
☆راهنما شناسی	آیت الله استاد محمد تقی مصباح یزدی
☆عقائدُنا	الدكتور محمد الصادقی مؤسسه الصادق بيروت
☆فی الضلال التشيّع	محمد علی الحسنی
☆امامت	استاد علامه حسن زاده آملی انتشارات قیام

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ

☆الخلافه والأمامة عبد الکریم الخطیب دارالمعرفة ـبیروت

☆تشیع در مسیر تاریخ دکتر سید حسین جعفری دفتر نشر فرهنگ اسلامی

☆کذّبوا علی الشیّعه

☆نشأت الشیعة الامامیه نبیله عبد المنعم داوود دارلمؤرخ العربی بیروت

☆پیرامون وحی ورهبری آیت الله جواد آملی

☆مذهب اهل بیتؑ (اردو ترجمہ) آیت الله عبدا لحسین شرف الدین موسوی

دارالتقافة الاسلامیة پاکستان

☆النص والاجتهاد آیت الله عبدالحسین شرف الدین موسوی

☆التشیع نشاته معالمه هاشم الموسوی مرکز الغدیر دراسات الاسلامیه

☆الانتفاضات الشیعه عبرالتاریخ هاشم معروف الحسنی دارالکتب الشعبیه بیروت

☆بین التصوف والتشیع هاشم معرف حسنی دارالقلم بیروت

☆الامامت و القیادة دکتور احمد عزالدین

☆رسالت القرآن دارالقرآن الکریم ش ۱ تا ۱۲ قم ایران

☆پژوهشهائی قرآنی ش ۱ تا ۸ـ ۲۳ تا ۲۶

☆مجله بینات ش،۱،۶،۹،۱۲ قم ایران

☆المعارج ش،۱،۸،۹،لبنان ش ۱۸ـ۱۹ـ۲۰

☆سیارۂ ڈائجسٹ قرآن نمبر ۱ـ۲ـ۳

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆ترجمان وحی	ایران
☆ترجمان القرآن	لاهور
☆مجله نقد و نظر	دفتر تبلیغات اسلامی قم
☆مجله ثقافة الاسلامية	رایزنی ایران دمشق ش ۱/ ۷۰
☆مجله الرصد	رایزنی جمهوری اسلامی ایران لبنان
☆کیهان اندیشه	---------------
☆مجله التوحید	سازمان تبلیغات اسلامی تهران
☆مجله المنطلق	لبنان
☆مجله البینات لبنان۔خطابات مصاحبات	آیة اللّٰه فضل اللّٰه
☆مجله نورالاسلام	جامعة المدرسین
☆مجله حوزه	ش۱۹، ۲۰، ۳۱، ۳۹، ۴۲تا۷۹، ۸۰
☆مجله مشکوة	مشهد
☆مجلات العربی	الکویت
☆رسالة الاسلام	کلیه اصول الدین بغداد
☆مجلاتِ النجف۔	نجف
☆مجلات۔ الاضواءِ النجف۔	نجف
☆الاعتصام۔سازمان تبلیغات اسلامی	ایران
☆نامه فرهنگ۔	وزارة ارشاد

نام کتاب	تالیف' جلد' شمارہ
☆نورالاسلام۔	موسسئہ امام حسینؑ لبنان
☆اخبارِ جنگ۔	راولپنڈی
☆اخبار نوائے وقت۔	راولپنڈی
☆مجلہ ثقافتِ اسلامیہ	رائیزنی جمھوری اسلامی ایران دمشق
☆مجلہ رسالت الثقلین	مجمع اہل البیتؑ ایران
☆مجلہ دارالتقریب	ایران
☆مجلہ رسالت الاسلام۔	دارالتقریب الاسلامی مصر
☆مجلہ فکرِ اسلامی	--------------
☆مجلہِ فکرِ جدید۔	لندن
☆مجلہ پاسدار۔	ایران
☆مجلہ فکروثقافت۔سوالات و جوابات	آیت اللّٰہ محمد حسین فضل اللّٰہ
☆مجلہ اندیشہ حوزہ	ش ۱ ص ۱۰۷
☆مجلہ کیہان اندیشہ	ش ۳۲ ص ۵۸۔۸٤
☆مجلہ کیہان اندیشہ	ش ١٦ ص۳۳،٤٧
☆مجلہ کیہان اندیشہ	ش ۱۷ ص ۳۷
☆مجلہ رسالہ تقریب	--------------

نام کتاب	تالیف' جلد' شمارہ

سماجیات وثقافت

☆نظام الحکم و الادارہ	محمدباقر شریف القریشی
☆نظام مجتمع والحکم	عبد الهادی فضلی
☆نظام الحکم و الادارہ	دکتور محمد نوری
☆نظامِ المالی فی الاسلام	محمد مهدی الآصفی
☆نظامِ التشریع فی الاسلام	محمد مهدی الآصفی
☆منهج التفسیر	صادقی م بصائرش۱۳،۱۲، ص۴۲
☆تکوین الاسرة فی السلام۔	الدکتور علی القائمی
☆نقشِ کتاب در تمدن و فرهنك اسلامی	--------------
☆اسلام و ایران	آیت اللہ شہید مرتضی مطهری
☆سیمای مسجد۔	رحیم نو بهار
☆مو سوعه سین و جیم۔	احمد سالم بادویلان
☆منهاج الرسل۔	السید احمد القبانچیی
☆علماء والمسئولیت تثقیف الامة	حسن الصفاء بصائر ش ۱۰ ص۶۵
☆نصرانية و التبشر	توحید۴۶،۴۷ ص۱۳۳، ۲۲
☆تاریخ الحرکة الاسلامیة المعاصرة فی العراق	الخطیب ابن النجف
☆صراع الارادات ،	سلیم الحسنی

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ
☆قضایا معاصرہ	ہاشمی نژاد
☆الثقافی الجدید مسالیہ و اثارہ	توحید ۱۶ ص ۱۸۱
☆الاسلام و الاسطورة	حسن الباش، مجلہ بصائر ش ۱۰
☆خصوصیة ثقافیة و مشکلات النخبة فی المغرب الاقصیٰ بقاریة	
☆الحیات ،	محمد رضا حکیمی
☆الامامت و القیادة	دکتور احمد عزالدین
☆الی و کلائنا فی البلاد	آیۃ اللہ مهدی حسینی شیرازی
☆کیف تدبیر الامور تحدید دین و احیائه و واقع المسلمین و سبیل الفهوض بهم،	ابو الاعلیٰ مودودی
☆الحوار فی الاسلام آیت اللہ محمد حسین فضل اللہ مجلہ منطلق عدد ۹۸	
☆الثقافة الرسالیة	احمد نائز
☆خطاب الاسلامی و تحدیة المتقابل	--------------
☆احزاب بعد از مشروطیت	پاسدار اسلام ش ۱
☆احزاب سیاسی پس از مشروطیت ،	پاسدار اسلام ش ۲
☆نقش کتاب در تمدن و فرهنگ اسلامی ،	ضیاء الدین
☆مفهوم التعلیم عند الغربیین ۹	--------------
☆الدعوة و الخطابة ،	علی عبد العظیم
☆علامہ شیخ غلام محمد ایک بے داغ قیادت امامیہ آرگنائزیشن بلتستان ریجن	

نام کتاب	تالیف، جلد، شمارہ

سیرت آئمہ اور حسینیات

☆الثورۃ الحسینیہ	محمد نعمه السماوی
☆الامام حسین فی مکه مکرمه	شیخ نبم الدین الطبسی
☆نگاه به حماسه حسینی۔	صالحی نجف آبادی
☆حماسه حسینی۔	آیة اللّٰه شهید مرتضی مطهریؒ
☆لؤلؤ مرجان	آیة اللّٰه نوری
☆فی رحاب الحسینؑ۔	آیة اللّٰه حسین فضل اللّٰه
☆طریقه کربلا۔	آیة اللّٰه حسین فضل اللّٰه
☆ثورۃ الحسینؑ یقظة الضمیر وتحریر الادارۃ	سید باقر الحکیم
	مجله فکراسلامی ش۱۶
☆تحریفات عاشورا۔	حجۃالاسلام و مسلمین آغاپیشوائی
☆الائمه الاثنیٰ عشر دراسة تحلیلة فی المنهج	راشد الراشد
☆حیاتِ فکری و سیاسی امامانِ شیعه۔	رسولِ جعفریان
☆الندوۃ۔	آیة اللّٰه سید محمد حسینِ فضل اللّٰه
☆مجاهدِ اعظم۔	علامه سید شاکر حسینِ امروهوئی
☆موسوعة مقتلِ الامامِ الحسینؑ۔	محمدِ عیسٰی آلِ میاکس
☆الفکر التربوی عند شهید ثانی	محمد تهامی ،مجله بصائر ش ۱۱
☆تاریخ غیب صغراء۔	آیة اللّٰه سید محمد صدر

نام کتاب	تالیف' جلد' شمارہ
☆سیرت آئمہ اثنیٰ عشر۔	استاد عادل ادیب
☆فی رحاب الاہلبیتؑ۔	آیۃ اللّٰہ حسین فضل اللّٰہ
☆میزاری شیرازی۔	سید محمود مدنی
☆سیمائی مسجد	رحیم نوبہار

☆ازمتہ المدرسۃ بین تصنیفات الحل واستراتجیہ الحل الاجتمائی

عدد۲،۳م۷۵الدکتور صیام المولیٰ ۴۹

☆حیات امام حسن علیہ السلام تالیف علامہ محمدباقرشریف قرشی

☆حیات امام حسین علیہ السلام	--------------
☆حیات امام زین العابدینؑ	--------------
☆حیات امام محمدباقرؑ	--------------
☆حیات امام موسٰی ابن جعفرؑ	--------------
☆حیات امام رضاعلیہ السلام	--------------
☆حیات امام علی نقی علیہ السلام	--------------
☆حیات امام حسن عسکری علیہ السلام	--------------
☆تاریخ غیبت صغریٰ	شہیدآیت اللہ سیدمحمدالصدر
☆تاریخ غیبت کبریٰ	--------------
☆یوم موعود	--------------
☆الزام الناصب	--------------

فہرست مضامینِ کتاب

انبیاءِ قرآن

موضوع | صفحہ

فہرست مضامین کتاب

عرضِ ناشر ---------- ۳
تمہید ---------- ۱۱
فلسفہ ضرورت بعثت انبیاءؑ ---------- ۱۵
نبوّت خاصہ ---------- ۱۹
نبی اور رسول میں فرق ---------- ۲۶
انبیاءؑ انسان و بشر ہیں ---------- ۳۱
تمام انبیاء اُمی ہیں ---------- ۳۵
انبیاءؑ اور علم غیب ---------- ۴۱
اقسام غیب ---------- ۴۳
ایمان بالغیب اور علم غیب ---------- ۴۹
خدا اور انبیاءؑ کے علم غیب میں بنیادی فرق ---------- ۵۲
حقیقت وحی ---------- ۵۴
وحی کے معنی ---------- ۵۶

موضوع	صفحہ
عصمت أنبیاءؑ کی دلیل	۶۲
۱۔ دلیل اعتماد	۶۲
۲۔ دلیل اخلاقی	۶۳
۳۔ دلیل اطاعت	۶۴
عصمت أنبیاءؑ	۷۱
حدود عصمت	۷۶
انسان سے گناہ سرزد ہونے کے اسباب و وجوہات	۸۲
عصمت انبیاءؑ کے خلاف قرآنی آیات سے استدلال	۸۴
معصوم اور غیر معصوم کی شناخت کیسے ممکن ہے؟	۸۹
عقیدہ عصمت کا تاریخی پس منظر	۹۱
تعداد انبیاء عقل ونقل کی روشنی میں	۹۴
حضرت آدم علیہ السلام	۹۹
آدم علیہ السلام اور نبوت	۱۰۳
قصہ حضرت آدم چند عناصر سے مرکب ہے	۱۰۶
حقیقت ملائکہ	۱۰۷
اقسام ملائکہ	۱۱۱
”جن“	۱۱۴

موضوع	صفحہ

"ابلیس" ---------- ۱۱۷

آدم نمونہ کامل انسان ---------- ۱۱۹

خلافت کی انواع ہیں ---------- ۱۲۰

اھداف و مقاصد خلافت ---------- ۱۲۱

تربیت گاہ سے اخراج ---------- ۱۲۴

حضرت ادریسؑ ---------- ۱۲۸

حضرت نوح علیہ السلام ---------- ۱۳۰

حضرت نوح آیاتِ قرآنی میں ---------- ۱۳۱

حضرت نوح علیہ السلام اور اُن کی دعوت ---------- ۱۳۳

قصہ حضرت نوح علیہ السلام ---------- ۱۳۶

معجزات حضرت نوح علیہ السلام ---------- ۱۳۹

قوم کو نوحؑ کا جواب ---------- ۱۴۴

حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ السلام ---------- ۱۴۷

مردہ مشرکین کیلئے مغفرت طلب نہیں کی جا سکتی ---------- ۱۵۶

والد حضرت ابراہیمؑ کا تعین ---------- ۱۵۶

ذبح عظیم کا فدیہ ---------- ۱۵۷

ارماں و آرزوں کی خاطر انسانی قربانی ---------- ۱۵۸

موضوع	صفحہ

قتل نفس ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۶۲

عبدالمطلب اور نذر ذبح فرزند ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۶۵

حضرت عیسیٰؑ کی قربانی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۶۷

حضرت ابراہیمؑ کا اپنے بیٹے حضرت اسماعیلؑ کو ذبح کرنا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۶۸

ذبیح، اسماعیلؑ ہے یا اسحاقؑ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۷۱

توحید اور شرک میں تصادم ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۷۴

تاریخ بت پرستی، بت سازی اور بتوں کو فروغ اور ترویج دینا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۸۰

اسباب وعوامل بت پرستی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۸۲

فلسفہ عبادت وبندگی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۸۵

عبودیت وبندگی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۸۸

بت پرستی اور خدا پرستی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۲

قرآن کریم میں بت کا تصور اور انکے نام ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۱۹۳

بتوں سے راز و نیاز ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۰۲

بتوں کی شکل وصورت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۰

انواع واقسام بت اور بت پرستی ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۶

جن سے حاجت طلب کی جاتی ہے خود نیاز مند اور محتاج ہیں ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۱۷

بت اور بت پرستوں کے خلاف قرآن اور انبیاءؑ کا رویہ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ۲۲۰

موضوع	صفحہ

بت اور بت پرستی کا نتیجہ ۲۲۳

شبیہ سازی ۲۲۵

کسی چیز کو شعائر قرار دینے کیلئے شبیہ سازی ۲۲۶

شبیہ سازی یا ظلم روائی یا ظلم کی ترویج ۲۳۰

ستارہ پرستان ۲۳۳

حضرت ابراہیمؑ اور علم نجوم ۲۳۷

ستاروں کے ہماری زندگی پر اثرات ۲۴۲

نحس اور سعادت میں ستاروں کا کردار ۲۴۶

نحوست اور سعادت کلمات امیر المومنینؑ کی روشنی میں ۲۴۷

ایام میں نحوست وسعادت اور اسکی حقیقت ۲۴۹

عناصر ترکیبی زمان ۲۵۱

معاشرہ میں نحوست کو، کون فروغ دیتا ہے ۲۵۴

تاریخ اور دنوں کی نحوست قرآن وسنت کے منافی ہے ۲۵۹

نحوست کہاں سے آئی ۲۶۰

عبادت نیرّین ۲۶۳

سورج اور اسکی حرارت ۲۶۶

زمین ۲۶۹

ہم قرآن کے بارے میں کیا جانتے ہیں؟
HOLY
QURAN
قرآنی معلومات